

ستمبر 2018

ماہنامہ  
دیرین



ماہنامہ

کرن ماہنامہ

چاندنگ روپہ اف پیلیکشنز

ایکون

رکن آئی پاکستان ٹیبلٹ پیکیج ڈسٹریبیوٹر  
رکن آئی پاکستان ٹیبلٹ پیکیج ڈسٹریبیوٹر  
MEMBER  
APNS  
CPNE

بانی ————— محمود کا فیصل  
نیکران ————— محمود ریاض  
مدیر ————— نادرہ خاتون  
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود  
نائب مدیر ————— شجاع حمید  
مدیر خصوصی ————— اہتک الصبوحہ  
رشتہ نگار ————— خالدہ جیلانی  
قانونی مشیر ————— نور الدین سرکی اینڈ کمپنی  
ایڈریس ایڈریس ایڈریس



آئی لی میں ریڈنٹ بھی میڈش

## لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار

بہترین لیزر ٹریٹمنٹ کے لئے دنیا بھر میں جلد کے امراض لیزر ٹریٹمنٹ کی ہدیہ ایکن ٹوپی کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی ٹریٹمنٹ صرف ایک کریم سے مل جائے تو؟  
اب لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ بھی لیزر ٹریٹمنٹ کے "طعمہ ایکن ٹوپی" کے ساتھ لایا گیا ہے۔  
اس کا حقیقت وہی ہے کہ لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ کی طرح جلد کی کھال تک نہ پہنچتا ہے۔ یہ نہایت کم صاف اور روشن کر کے جلد کو نکھارتا ہے۔  
لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسے کھار کے لئے صرف لیزر ایکن ٹوپی کا ہیٹ فارمولا۔

Fair & Lovely  
ADVANCED  
MULTI VITAMIN™

لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ سے زیادہ کھال کی آئی لی (Intense Pulsed Light) ہے۔



### مستقل سلسلے

- |     |               |                |     |              |                    |
|-----|---------------|----------------|-----|--------------|--------------------|
| 254 | ادارہ         | موتی پختے ہیں  | 245 | شعاع عید     | کرن کرن خوشبو      |
| 252 | ڈون بیٹہ شریف | مُسکراتی کرتیں | 249 | بشری محمود   | بادول کے در کے سنے |
| 255 | ذوالقنین      | نہلے پہ در ہلا | 251 | شگفتہ سیلان  | نہلے شہر لپیٹتے    |
| 256 | مدیر و کرن    | نامے میکر نام  | 248 | خالدہ جیلانی | شام کی چائے        |

کرن  
37- اردو بازار کراچی

ستمبر 2018  
جلد 41 شمارہ 6  
قیمت 70 روپے

پبلشر آذریاض نے ابن حسن پرچنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔  
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872  
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

محمد  
نعت

داستانِ واصل 11  
بہادر شاہ ظفر 11

### مکمل ناول

- |     |            |              |
|-----|------------|--------------|
| 54  | ایک رضا    | جواب دہی     |
| 120 | منعم ملک   | بتدر کواڑ    |
| 202 | صائمہ قدسی | لذتِ نعم عشق |

### ناولٹ

- |     |            |                     |
|-----|------------|---------------------|
| 95  | تنویر ریاض | غم ہے یا خوشی ہے تو |
| 158 | سحر ملک    | آنچل میں ساکنے      |

### افسانے

- |     |            |              |
|-----|------------|--------------|
| 116 | ماہوش طالب | میدر         |
| 151 | گلارباب    | تیسری بیوی   |
| 49  | عزیز دلی   | ست رنگا جیون |
| 236 | ہام آفرین  | گرہ          |
| 199 | بشری ماما  | جھوٹی        |
| 241 | ام ہانی    | بھولا جو فرض |

### انٹرویو

- |    |            |                    |
|----|------------|--------------------|
| 12 | شایین رشید | خوشیوں کے رنگ      |
| 19 | شایین رشید | مایا علی سے ملاقات |
| 24 | علی عباس   | میری بھی سنیے      |
| 28 | سحر انصاف  | مقابل ہے آئینہ     |

### ناول

- |     |              |                    |
|-----|--------------|--------------------|
| 30  | رخ چوہدری    | شبِ نم کی سحر      |
| 186 | نگہت عبداللہ | ہوائیں رخ بدل گئیں |

### قسط سالانہ بک ایگزیکٹو گیلری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے  
ایشیاء افریقہ اور وسطی ایشیاء ----- 6000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے  
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواہ مخواہ ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے مہینہ شاعر اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت کی کاپی یا ڈیجیٹل یا فزیکل یا اور سلسلہ وار کاپی کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

(مسلمی) سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ اسلامی سال کا پہلا اور آخری دونوں ہی بیسے قربانی کی عظیم مثالوں کی یاد دلاتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے فرزند کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ نواسۂ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دین کو بچانے کے لیے اپنے اہل بیت اور نقار کے ساتھ میدان کربلا میں جام شہادت نوش کیا۔ آپ کے مقابلے میں ایک بڑا لشکر تھا جو جنگی ساز و سامان سے لیس تھا لیکن آپ نے حق کے مقابلے میں باطل کا ساتھ نہیں دیا اور اپنی اہل خاندان کی جان کا نذرانہ دے کر دنیا کو تیار کیا۔ اہل باطل خواہ کتنی کثرت تعداد میں کیوں نہ ہوں کثرت حق کی دلیل نہیں ہے۔ جو سچ اور حق کی راہ پر ہونے ہیں انہیں وقتی طور پر شکست ہو سکتی ہے لیکن بالآخر وہی کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ وقت کا فیصلہ ہی درست اور آخری ہوتا ہے۔ آج حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی کو دنیا تسلیم کرتی ہے۔ انہوں نے باطل کے سامنے سر نہیں جھکایا، وہ کثرت سے مرعوب نہیں ہوئے۔ راد حق و صداقت کی راہ میں جان دے کر مثال قائم کر دی۔ انہوں نے اس عکراں کو تسلیم نہیں کیا جس میں اخلاقی بُرائیاں تھیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کس مقصد کے لیے جان دی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کا تقاضا ہے کہ ہم حق و صداقت کی راہ پر چلیں۔ صرف زبانِ محبت اور عقیدت کافی نہیں۔

### اس شمارے میں،

- ۱۔ "خوشیوں کے رنگ" عبدالغنی کے حوالے سے شایین رشید کا خصوصی سروے،
- ۲۔ اداکارہ "مایا علی" سے شایین رشید کی ملاقات،
- ۳۔ اداکارہ "علی عباس" کہتے ہیں "میری بھی بیٹے"،
- ۴۔ اس ماہ "سورائش" کے مقابلے میں آئینہ،
- ۵۔ "شبِ غم کی سم" درخشاں ہدیری کا سلسلے وار ناول،
- ۶۔ نگہبخت عبداللہ کا سلسلے وار ناول "ہوائیں رُخ بدل گئیں"،
- ۷۔ "ماورائی" امین رضا کا مکمل ناول،
- ۸۔ صائمہ قریشی کا مکمل ناول "لذتِ غم عشق"،
- ۹۔ "بند کوڑا" منور ملک کا مکمل ناول،
- ۱۰۔ غنیمت یا خوشی کہے تو، "منزلہ ریاض کا ناولٹ"،
- ۱۱۔ سورملک کا ناولٹ "آپچل میں ستارے"،
- ۱۲۔ عزیزین ولی، ماہ ویش طالب، بشری ماہا، گل ادیب، مایم اوزلین اور امانی کے افسانے اور مستقل سلسلے،

محنت، کرن کا دسترخوان، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت ماحول کریں۔



اے ربِ سموات تیری ذات دراپے  
ہیبت سے تیری کوہِ گراں کا پدرا ہے

انسان بے چارہ تجھے کیا جان سکے گا  
ادراک کی دنیا میں تجھے دسوندا ہے

ہیں تیرے ہی اندازِ غزنی و امیری  
دیتا ہے کبھی ادر کبھی مانگ رہا ہے

معلوم ہے اتنا کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم  
جانا ہے کہ کیا جانے گا جو جان گیا ہے

ہر سمت ہے وجہ اللہ عیاں خالی احسن  
خود آئینہ خود دیدۂ حیران ہوا ہے

واصف علی واصف



کشتہ ہوں کس کے طرہ عنبر شمیم کا  
خوشبو ہے میری خاک سے دامن نسیم کا

گلشن ہو غلد کا کہ چمن ہو نعیم کا  
کیا دل لگے ہے تیری گلی کے مقیم کا

دولت سے عشق کے مرا ہر قطرہ مرثک  
تکم ہے میری حبیب میں دُربِ یتیم کا

دکھلاؤں سوزشِ دل بے تاب ہم اگر  
کاپ اپ اٹھے شعلہ خوف سے نارِ حیم کا

آنکھوں میں اپنی نور اسی سے ہے لے ظفر  
یہ مردِ مک ہے سایہ محمدؐ کے میم کا

بہادر شاہ ظفر



جب میگزین آپ کے ہاتھ میں آئے گا بقرہ عید گزر چکی ہوگی۔ مگر اس کے اثرات باقی ہوں گے۔ لہذا سر دے حاضر ہے کیونکہ عید الفطر ہو با عید الاضحیٰ کرن میگزین میں سر دے نہ ہو، کچھ ادھورا پن لگتا ہے۔ سوال کچھ یوں ہیں کہ.....

- 1- کیا آپ جانور لینے خود منڈی جاتے ہیں یا دوسروں کی خدمات حاصل کرتے ہیں / کرتی ہیں۔
- 2- اس عید پر اپنی پسندیدہ ڈش خود پکاتے / پکاتی ہیں یا کس سے پکواتی ہیں / پکواتے ہیں۔

## خوشیوں کے رنگ

شاین رشید

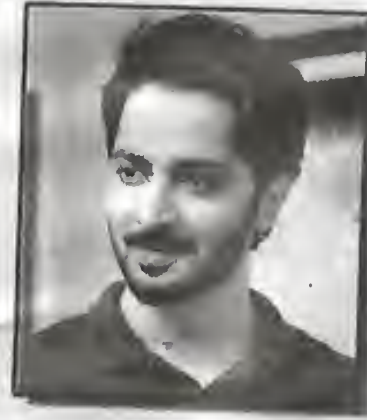
کے دن وہ پکواتی ہوں۔ خود نہیں پکاتی کیونکہ جب پکوانے کی سہولت ہو تو کیا ضرورت ہے خود پکاتے کی۔“



ارتج فاطمہ :- (آرٹسٹ)

1- ”میں دود جو بیات کی بناء پر منڈی نہیں جاتی اور نہ ہی جانوروں کے قریب جاتی ہوں۔ منڈی اس لیے نہیں جاتی کہ ڈھیر سارے جانوروں کی بدبو مجھ سے برداشت نہیں ہوتی اور دوسری یہ کہ جب جانور گھر آ جاتے ہیں تو ان سے خواہ مخواہ بیمار ہو جاتا ہے پھر ان کو ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی..... مجھے جانوروں کی بدبو سے تھوڑی البرجی ہو جاتی ہے۔“

2- ”مگائے کا گوشت تو میں بالکل بھی نہیں کھاتی۔ البتہ بکرے کی ”کلیجی“ مجھے پسند ہے تو عید



دانش تیمور :- (آرٹسٹ)

1- ”بچپن میں بہت شوق تھا منڈی جانا اور اپنی پسند سے جانور خرید کر لانا..... پھر انہیں کھانا پلانا..... اور بچپن ہی نہیں بڑے ہوتے تک یہ شوق برقرار رہا اور برقرار ہے۔ مگر اب مجبوری یہ ہے کہ ٹائم نہیں ملتا اس لیے خود نہیں جاسکتا۔ البتہ جب جانور گھر آتے

ہیں تو پھر جو بھی تھوڑا بہت ٹائم ملتا ہے ان کی سیوا ضرور کرتا اور دوسروں کو بھی خاص ہدایت کرتا ہوں کہ ان کا خیال رکھیں۔“

2- ”عید کے دن مجھے کلیجی کھانا پسند ہے اس لیے فرمائش کر کے پکواتا ہوں۔ فرمائش کیا، سب کو پتا ہے کہ دانش کو کلیجی پسند ہے بکرے کی، تو بس قربانی کے بعد پہلی ڈش جو چوبلے پر چڑھتی ہے وہ ”کلیجی“ ہوتی ہے۔“



اقبال بانو :- (ڈرامہ نگار + افسانہ ناول نگار)

1- ”خوش قسمتی سے ہمارے تو اپنے ذیرے پہ سب جانور ہل کر جوان ہو رہے ہوتے ہیں اور یہ سب جانور ہمارے اپنے ذاتی ہوتے ہیں..... میرے بیٹے شہد کو جانوروں سے بہت لگاؤ ہے تو اس کی خوشی کی خاطر جو جانور قربانی کے لیے ہوتے ہیں انہیں عید سے دو تین دن پہلے گھر لے آتے ہیں..... اور پھر سنت کے مطابق ان کا بہت خیال رکھتے ہیں اور پھر عید کے دن اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔“

2- ”عید کے دن تو کوئی ایک ڈش نہیں بلکہ ڈشز کا انتظام ہوتا ہے۔ عید کے پہلے دن کٹی، نمک والا بھنا ہوا گوشت اور بخنی پلاؤ بنتا ہے اور الحمد للہ یہ ساری کونگ میں خود ہی کرتی ہوں..... شام کے لیے

یا پھر دوسری صبح کے لیے پائے، بناتی ہوں..... تو بس یہ اہتمام ہوتا ہے اور مہمان آ جائیں تو پھر اور بھی زیادہ مزا آتا ہے ان کی خاطر مذاکرات کر کے..... عموماً لوگ عید کے دن باری کی ضرور کرتے ہیں۔ مگر ہم نہیں کرتے کیونکہ باری کیو تو کہیں سے بھی جا کر کھایا جاسکتا ہے۔ مگر عید کے انٹیشنل پکوان تو پھر عید پر ہی ہوتے ہیں۔“

دہاج علی (آرٹسٹ + ماہ تمام فیم ”تقی“)

1- ”جی..... جی..... بکرا خریدنے منڈی ضرور جاتا ہوں اور بہت مزا آتا ہے۔ بہت شوق اور دلچسپی کے ساتھ یہ کام سرانجام دیتا ہوں۔“

2- ”اور عید کے دن خاص فرمائش کر کے اپنی پسندیدہ ڈش پکواتا ہوں اور وہ ڈش ”کلیجی“ کی ہوتی ہے..... خود پکانے کا شوق نہیں ہے۔“



فہج باری خان :- (معروف رائٹر + ڈرامہ نگار)

1- ”دل تو چاہتا ہے کہ خود جاؤں۔ مگر ٹائم ہی نہیں ملتا، لہذا یہ ساری ذمہ داری اپنے بھائی پہ ڈالی ہوئی ہے اور میں بالکل بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ نہیں دیتا۔“

2- ”خود تو مجھے کچھ بھی پکانا نہیں آتا اور نہ ہی

مجھے شوق ہے، البتہ کھانے پینے کا بہت شوق ہے اور بقرہ عید کے دن ہنر بیف ضرور بنواتا ہوں..... اور یہ کام بھی خود نہیں کرتا بلکہ اس کی ذمہ داری بھی گھر والوں پہ ڈال دیتا ہوں۔“



امبر ارشد:- (آرٹسٹ)

1- ”بقرہ عید تو میرے لیے بہت ایشیال ہوتی ہے۔ حالانکہ بڑی ہو گئی ہوں، بچے کی ماں بھی ہوں۔ پھر بھی میرا بچپنا نہیں ختم ہوا اور بقرہ عید کے موقع پر ساری حرکتیں بچوں والی ہی ہوتی ہیں۔ بچے جب شور مچاتے ہوئے کئی محلے سے گزرتے ہیں تو میں بھی یہ سنیں دیکھنے کے لیے گیٹ پہ چلی جاتی ہوں..... اور جہاں ہم رہتے ہیں وہ اپارٹمنٹ کافی بڑا ہے، تو وہاں جب سب اپنے جانور خرید کر لاتے ہیں تو ایک چھوٹی سی بکرا منڈی کا گمان ہوتا ہے اور میں تو اتنی دیوانی ہوں کہ جب ہمارے گھر میں گائے اور بکرے آتے ہیں تو ان تصاویر فیس بک پہ، انسٹا گرام پہ ضرور لگاتی ہوں..... اور جانوروں کی بہت خدمت کرتی ہوں۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہوں۔ گائے کا چارا اپنے ہاتھوں سے بناتی ہوں..... اور پھر قربانی کے دن اس کو بھی بہت ہو جاتی ہوں، کیونکہ مجھے اپنے جانوروں سے پیار بھی بہت ہو جاتا ہے بس یہی زندگی، خوشی اور اداسی کا نام، مگر اللہ کی راہ میں قربان

کر کے غریبوں میں گوشت بانٹ کر بھی عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اللہ نے ہمیں توفیق دی ہے کہ ہم یہ فریضہ انجام دے سکیں۔“

2- ”بقرہ عید پہ میں خود ہی کوئنگ کرتی ہوں..... کیونکہ ہمارے والد صاحب کی خاص ہدایت ہوتی تھی کہ کھانا گھر کی خواتین ہی پکائیں لی اور ہمارے یہاں تینوں دن دعوت کا اہتمام ہوتا ہے تو تینوں ہی دن پکوان پکتے ہیں۔ پہلے دن پلاؤ بنتا ہے اور پلاؤ کے ساتھ شامی کباب کا ہونا بہت لازمی ہے۔ دوسرے دن ماشاء اللہ سے چار پانچ کلو کی بریانی بناتی ہوں اور خود ہی پکاتی ہوں۔ اس کے ساتھ کچے قیے کے کباب ہوتے ہیں۔ اس طرح تیسرے دن کا بھی اہتمام ہوتا ہے..... ہاں..... بیٹھا چونکہ مجھے پسند نہیں تو وہ میں بناتی بھی نہیں۔“



ظفر میراج:- (لکھاری + ڈرامہ نگار)

1- ”میرا تعلق ایک خانہ بدوش قبیلے سے ہے جو ”کیٹل فارمنگ“ پہ گزارہ کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں جانور خریدائیں بلکہ پیالا جاتا ہے تو ہم جانور لینے نہیں بھی نہیں جاتے بلکہ قربانی کے جانور کو پالتے ہیں اور پھر قربانی کرتے ہیں۔“

2- ”میں سبزی خور انسان ہوں، گوشت سے رغبت نہیں ہے، البتہ دنبے کے گوشت کا پلاؤ مجھے

بہت پسند ہے، تو عید کے دن خاص طور پر پکواتا ہوں۔ اسے ہم ”کابلی پلاؤ“ کہتے ہیں اور اس پلاؤ کی باقاعدہ دعوت کرتا ہوں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بلا کر، قربانی کا گوشت مجھے ”ہیوی“ لگتا ہے..... اس لیے نہیں کھاتا۔“



کیف فرہادی:- (آرٹسٹ)

1- ”میں بڑی عید جسے ہم بقرہ عید بھی کہتے ہیں، ملتان میں کرتا ہوں، کیونکہ وہاں ہمارے خاندان کے جو غریب غریب لوگ ہیں میں ان کو بھی اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتا ہوں بلکہ کرتا ہوں..... اور دو بکرے لیتا ہوں، خود بکرا منڈی جاتا ہوں اور اپنی پسند سے لے کر آتا ہوں اور یہ آج سے نہیں بلکہ بیس چھپیس سال سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ میں کسی پہ بھروسہ نہیں کرتا بلکہ خود ہی جاکر جانور خریدتا ہوں۔“

2- ”جب تک میری والدہ حیات تھیں میں عید کے دن ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی چینی، بہت شوق سے کھاتا تھا..... 2003ء میں ان کی وفات کے بعد اب یہ فرمائش میں اپنی بہن سے کرتا ہوں کیونکہ ان

کوئی ڈش کھانے اور پکانے کا دل نہیں چاہتا۔ عید کے دن کھٹی وال اور چاول مجھے بہترین کھانا لگتا ہے اس لیے وہی پکاتی ہوں اور میرے میاں بھی اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ بقرہ عید کے دن ہلکا پھلکا کھانا ہو..... بقرہ عید منانا ایک مذہبی فریضہ ہے اور بہ حیثیت ایک مسلمان کے ہم قربانی کا پیسہ کسی ٹرسٹ یا ویلفیئر کو دے دیتے ہیں اور ایسا ہم کئی سالوں سے کر رہے ہیں..... اللہ ہماری قربانی کو قبول فرمائے۔“ (آمین)

سید افراز علی تاناش:- (فاؤنڈر + مدر ”شی“ فاؤنڈیشن انٹرنیشنل)



1- ”میں بڑی عید جسے ہم بقرہ عید بھی کہتے ہیں، ملتان میں کرتا ہوں، کیونکہ وہاں ہمارے خاندان کے جو غریب غریب لوگ ہیں میں ان کو بھی اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتا ہوں بلکہ کرتا ہوں..... اور دو بکرے لیتا ہوں، خود بکرا منڈی جاتا ہوں اور اپنی پسند سے لے کر آتا ہوں اور یہ آج سے نہیں بلکہ بیس چھپیس سال سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ میں کسی پہ بھروسہ نہیں کرتا بلکہ خود ہی جاکر جانور خریدتا ہوں۔“

2- ”جب تک میری والدہ حیات تھیں میں عید کے دن ان کے ہاتھ کی پکی ہوئی چینی، بہت شوق سے کھاتا تھا..... 2003ء میں ان کی وفات کے بعد اب یہ فرمائش میں اپنی بہن سے کرتا ہوں کیونکہ ان



# HEMANI

## Advance Herbal Beauty Cream

### ایڈوانس ہربل بیوٹی کریم

Free from Mercury



HEMANI  
Advance Herbal  
Beauty Cream

100% Natural  
Glowing  
Anti Wrinkle  
Anti Acne

Glowing | Anti Wrinkle | Anti Acne

Meri Choice  
Meri Recommendation

FPCCI  
2017  
Brands  
Award

Dr. Shaista Lodhi

www.hemaniherbal.pk

#HarPaHerbal

hemaniherbal

کے ہاتھ میں "ماں" والا ذائقہ ہے اب تو فرمائش نہیں  
کر لی پڑنی بلکہ وہ خود۔۔



صائمہ قریشی:- (آرٹسٹ)

کے نزدیک کوئی منڈی لگتی ہے تو پھر اپنے چھوٹوں یعنی  
بہن بھائیوں کے بچوں کو ساتھ لے جاتا ہوں جس  
طرح ہم اپنے بڑوں کے ساتھ جایا کرتے تھے۔۔  
2-.....ہو..... بقرہ عید کا گوشت  
فریش اور تازہ ہوتا ہے تو ہر بچہ ان اچھا لگتا ہے اور  
مزے دار ہوتا ہے اور اس کی لذت سارا سال رہتی  
ہے، اس لیے بھی مجھے بقرہ عید کا بہت انتظار رہتا ہے  
..... اور پہلے دن تو بیکینی کھانے کا ہی مزہ ہے جو ہمارے  
یہاں ضرور پکیتی ہے۔۔



1- "ارے جناب یہ ہمارا کام نہیں ہے یہ تو  
ہمارے گھر کے مردوں کا کام ہے۔ میں بھی بھی  
جانوروں کی خریداری میں حصہ نہیں لیتی بس میرے  
میاں صاحب جاتے ہیں اور اپنی پسند کے جانور خرید  
کر لے آتے ہیں۔"

2- "ہاں..... کھانے کا شعبہ میرا ہے اور میری  
ماں کی تربیت اور میرا شوق کہ مجھے کھانے پکانے کا بہت  
شوق ہے۔ اور عید کے موقع پر بہت قسم قسم کے کھانے  
پکاتی ہوں۔ جیسے بریانی، پاؤ، تورمہ، شامی کباب، چپلی  
کباب، کڑا ائی وغیرہ وغیرہ۔ ہر کھانا مجھے پکانا آتا ہے  
اور ماشاء اللہ میرے ہاتھ میں ذائقہ بھی ہے۔"

مصطفیٰ پوھدری:- (آرٹسٹ 4 میں شوفیم)

1- "جب چھوٹا تھا تو اپنے بڑوں کے ساتھ  
خاص طور پر اپنے والد کے ساتھ جانوروں کی خریداری  
کے لیے ضرور جاتا تھا۔ مگر اب ایک وقت نہیں ہوتا  
پھر بڑے بھی ہو گئے ہیں تو پہلے وہ شوق رہے نہیں  
ہیں۔ اب اگر جاتے بھی ہیں تو اس لیے کہ بھی جانور  
نہیں خریدیں گے تو قربانی کیسے ہوگی..... چنانچہ گھر

عاطف حسین:- (ڈائریکٹر + پروڈیوسر)  
1- "قربانی کا جانور خود لینے جاتا ہوں، کیونکہ

# مَایا علی سے ملاقات

شاین رشید

”پہلی فلم اور وہ بھی ہاؤس فل..... کیا امیدیں تھیں اور کیا محسوس ہو رہا ہے؟“  
☆ ”سچ بتاؤں تو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ اصل میں میں بہت بڑی تنقید نگار ہوں، کسی کی فلم دیکھوں یا ڈرامہ اس میں سے تنقیدی پوائنٹ ضرور نکال لیتی ہوں..... اور میں ہی کیا سب ہی ایسا کرتے ہیں سو فیصد تو کوئی چیز بھی برقیٹ نہیں ہوتی..... جو فلمیں ہمارے یہاں کی ریلیز ہو چکی ہیں اس پہ بھی کچھ لوگ پسند کرتے ہیں اور کچھ نہیں..... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ لوگوں نے فلم کو بھی اور میرے کام کو بھی بہت پسند کیا ہے..... اور مجھے امید ہے کہ آئندہ جب

”ایک نئی سنڈر یا“ سے شہرت پانے والی ”مایا علی“ نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک دن سلور اسکرین پہ بھی جلوہ گر ہوگی..... کوئی ایک سیریل کوئی ایک سٹیکل ڈرامہ، کوئی ایک لمحہ انسان کی زندگی کا ٹرنگ پوائنٹ بن جاتا ہے یا وہ بہت اونچا اڑنے لگتا ہے یا ایک دم نیچے آگرتا ہے..... اور اس لحاظ سے ”مایا علی“ بہت خوش قسمت ہیں کہ ”نئی سنڈر یا“ نے ان کے لیے ترقی کی راہیں کھول دیں اور ”طیفا ان ٹریل“ نے فلم کے لیے راہیں ہموار کر دیں۔“  
”کیا حال ہیں؟“  
”بی.اے. کا فکرم ہے۔“



یہ اللہ کا حکم ہے اور قربانی تب ہی قبول ہوتی ہے کہ آپ اپنی پسند کا جانور لائیں اس سے پیار کریں اور خدمت..... خیر خدمت کا نام تو نہیں ملتا مگر پھر بھی تھوڑا بہت خیال ضرور رکھتا ہوں..... اور ایسا کرنا بھی پڑتا ہے اپنے بچوں اور اپنی نئی نسل کی خاطر کہ انہیں معلوم ہو کہ قربانی کیا ہے اور ہمارے فرائض کیا ہیں۔“  
2- ”مجھے سارا سال بقرہ عید کا انتظار رہتا ہے۔ اس لیے کہ قربانی کے جانور کی کھجی کی اپنی ہی لذت ہوتی ہے اور میں خاص طور پر کھجی پکواتا ہوں اور اس دن میں ناشتا بھی اسی کا کرتا ہوں۔“

کبریٰ خان: (آرٹسٹ)

وجیہہ ثانی:- (نیوز اینکر)

1- ”جانور کی خریداری چونکہ سنت ابراہیمی ہے اس لیے ضرور حصہ لیتا ہوں۔ بچپن بہت یاد آتا ہے کہ ضرور جایا کرتے تھے اپنے بڑوں کے ساتھ اور خوب انجوائے کرتے تھے..... اب مصروفیات کی وجہ سے وقت کم ملتا ہے مگر پھر بھی جانا ضرور ہوں..... اور چاہے میں کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوں عید کے دن جانور کی قربانی اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں۔“  
2- ”قربانی اپنے ہاتھ سے کرنے کا شوق ہے مگر پکانے کا کوئی شوق نہیں ہے، یہ شعبہ بیگم کا ہے اور وہ ہی کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے اور امی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اور یہ انہی کی ذمہ داری ہے کہ عید کے دن کیا کرنا ہے اور گوشت کسی طرح بانٹا ہے اور کیا پکوان پکانے ہیں اور کس طرح تقسیم کرنا ہے۔“

☆☆



1- ”نہیں، نہیں..... میں تو بالکل بھی حصہ نہیں لیتی۔ مجھے عجیب سی اسمیل آتی ہے، البتہ گھر جب آتے ہیں تو پھر تھوڑی بہت خدمت خاطر ضرور کر لیتی ہوں کہ یہ سنت ابراہیمی ہے۔“

2- ”میں تو نہیں پکاتی..... البتہ گھر میں جو کچھ بھی پکاتا ہے میں خوشی خوشی کھا لیتی ہوں۔“





کو سناتی ہوں۔ جب میں نے پہلی بار پی ٹی وی کا ایک شو کیا تو کمر میں کسی کو نہیں بتایا۔ مگر جب پروگرام دیکھا تو خاموش رہے اور یہ بات تب کی ہے جب میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔ پھر ایک اور شو کی آفر ہوئی تو میں نے والد صاحب سے اجازت مانگی۔ مگر والد صاحب نے سختی سے منع کر دیا کہ خبردار۔۔۔۔۔ مگر میں کب باز آنے والی تھی۔۔۔۔۔ سوچا کہ ایسے موقع کب ملتے ہیں، لوگ ترستے ہیں پی ٹی وی کے پروگراموں میں کام کرنے کے لیے اور مجھے اللہ تعالیٰ موقعہ دے رہا ہے اور میں نخرے دکھا رہی ہوں۔ میں نے والد کو بتائے بغیر شو کرنے کی حامی بھر لی کہ والد صاحب کب پی وی شوق سے دیکھتے ہیں سوائے خبروں کے۔۔۔۔۔ اور پروگرام بھی ”عید شو“ تھا خیر پروگرام ریکارڈ ہوا، عید کے دن پیش کیا گیا۔ والد صاحب اتفاق سے پی وی آن کر کے بیٹھ گئے، پروگرام شروع ہوا اور۔۔۔۔۔ والد کی تیوریاں بل کھانے لگیں۔۔۔۔۔ مجھے ہلایا، پوچھا ”یہ کون لڑکی ہے“

میں نے صاف جھوٹ بول دیا کہ یہ لڑکی میں نہیں ہوں۔ والد صاحب بہت سختی سے پیش آئے اور کہا کہ آئندہ تم مجھے پی وی اسکرین پر نظر نہ آؤ۔۔۔۔۔ والد نے تو بہت سختی کی لیکن والدہ نے بہت سپورٹ کیا اور کہا کہ کام کرو مگر حدود یاد نہ کرنا۔۔۔۔۔ اور شکر ہے کہ مجھے میرے والد بن کو کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ والد بھی آج آج مان نہ گئے۔“

پھر اداکاری کی آفر آئی ہوگی؟“  
”نہیں ایسا نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ مجھے معلوم ہوا کہ اداکاری کے لیے آئینہ دار ہے میں۔۔۔۔۔ میں نے اداکاری کی لی اس اگر کامیاب ہوگی تو وہاں۔۔۔۔۔ والد نے مان دیا۔ اگلے دن میں اس اداکارہ کے لیے آپ کو ایک ڈرامے کے لیے منب کر لیا ہے۔ اس کے تعاون سے میں نے ڈرامہ کر لیا اور اسی ڈرامے کے دوران ایک اور آفر آئی۔۔۔۔۔ منب کہا گیا کہ اس کے لیے آپ کو لاہور جانا

تو پھر اداکاری کی گنجائش کیا رہتی ہے۔“

”کام کا تجربہ کیا رہا؟“  
☆ ”تھوڑی پریشانی ہوئی کیونکہ پہلا بڑا پروجیکٹ تھا، پہلا تجربہ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سینئرز نے اور خاص طور پر علی ظفر اور احسن رحیم نے بہت مدد اور حوصلہ افزائی کی۔“

”پریشانی کہاں ہوئی؟“  
☆ ”کہیں بھی نہیں۔۔۔۔۔ چونکہ پہلا فلم تھی تو دو تین بار مکالمے بھول جاتی تھی۔۔۔۔۔ مگر اس بات پہ ڈانٹ نہیں پڑی بلکہ بڑے آرام سے ڈائریکٹر نے سمجھایا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔“

”من مائل کی سیدھی سا دھڑل کی کو فلم میں ایک بالکل مختلف رول ادا کرنا پڑا۔۔۔۔۔ مشکل ہوئی؟“  
”من مائل تو ڈرامہ تھا جو رول ملا کر لیا۔۔۔۔۔ جو کہا کر لیا، فلم کا بھی یہی حال ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ ”طیقا ان ٹریل“ میں میرے مزاج کا کردار تھا۔۔۔۔۔ جو میں اصل زندگی میں ہوں دیکھی ہی اس فلم میں بھی نظر آتی ہوں۔ میری زندگی کے قریب تھا یہ کردار۔۔۔۔۔ اور مجھے بہت حزا یا فلم میں کام کر کے۔“

”اللہ کرے کہ آپ مزید فلموں میں بھی کام کریں اور بہترین ہیروئن کہلا میں۔۔۔۔۔ کمر میں کوئی اور بھی ہے اس فیلڈ میں؟“

☆ ”کوئی اور۔۔۔۔۔ ازلے ہمارے گھر کا ماحول ایسا کہاں کہ کوئی اس فیلڈ میں آنے کا سوچے۔۔۔۔۔ میں بھی بس اس لیے آگئی کہ میں نے ماس کیو پکیشن میں ماسٹر کیا تھا اور انٹرن شپ کے لیے ”جیو“ گئی اور رپورٹنگ کے شعبے میں کام کیا اور خوب انچوائے کیا اور میں اس شعبے میں آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر والد صاحب جو پہلے ہی مخالف تھے انہوں نے مجھے مزید کام کرنے سے منع کر دیا۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ پھر ڈراموں میں آنے کی اجازت کیسے دے دی؟“  
☆ ”یہ بھی بڑے مزے کی کہانی ہے، میں آپ

کسی فلم میں کام کروں گی تو لوگ اس طرح پسند کریں گے۔“

”ہر پہلا کام انسان کو کسی نہ کسی انجانے خوف میں مبتلا کرتا ہے اور یہی جملہ ذہن میں گردش کر رہا ہوتا ہے کہ پتا نہیں کیا ہوگا۔ پی وی پہ جب پہلی انٹروی دی تو کیا احساسات تھے؟“

☆ ”یہی احساسات تھے کہ پتا نہیں لوگ پسند کرتے ہیں یا نہیں، مگر ڈراموں سے بھی فیڈ بیک بہت اچھا ملا اور اب تو خیر کافی ٹائم ہو گیا ہے اور کافی کام بھی کر لیا ہے تو اب ڈر نہیں لگتا اب بہت زیادہ پر



اعتماد ہوگئی ہوں۔“  
”فلم میں کام کرنے کی آفر آئی تو کیا کیفیت تھی؟“

☆ ”حیرانی اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔۔۔۔۔ مجھے اس فلم کے ڈائریکٹر نے فون کیا اور ایک دم سے کہا کہ فلم میں کام کریں گی۔۔۔۔۔ تو فوری طرز پر تو میں نے ”لیس“ نہیں کیا البتہ ٹائم مانگا اور پھر اپنے قریبی لوگوں سے مشورہ کیا اور یہ معلوم کیا کہ اس فلم کی کاسٹ میں کون کون ہے اور جب کاسٹ معلوم ہوئی





پھر مجھے ”من مائل“ میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ مل گیا۔ مگر افسوس کہ اس خوشی کے موقع پر والد صاحب اس دنیا سے جا چکے تھے اور جب مجھے ایوارڈ ملا تو میں بہت روئی تھی۔

”فیوچر میں کیا کرنا چاہتی ہیں؟“  
☆ ”میری خواہش ہے کہ میں فیوچر میں ایک عدورے ستوران کھولوں جہاں بہت مزے مزے کے کھانے ملیں۔ کیونکہ میں خود کھانے کی بہت شوقین ہوں۔“

”اور وہ گھر بنانے کی خواہش؟“

☆ ”ارے ہاں۔۔۔۔۔ وہ تو میری امی کی خواہش ہے اور میں اپنی ماں کی خواہش ان شاء اللہ ضرور پوری کروں گی۔ امی کی خواہش ہے کہ ”لان“ والا گھر ہو جہاں وہ بیٹھ کر علی الصبح کا نظارہ کر سکیں جہاں سورج کی کرنیں ان کا استقبال کریں۔“

”ابتداء سے لے کر آج تک قدم قدم پہ

کامیابیاں ملیں، نام کا اثر ہے یا محنت کا؟“

☆ ”جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ میرا

اصلی نام تو مریم تنویر ہے۔ مریم میرا نام اور تنویر والد صاحب کا نام ہے۔ چونکہ میں بچپن میں اکثر بیمار ہو جایا کرتی تھی تو سب کہتے تھے کہ اس کا نام بدل دیں۔۔۔۔۔ مگر والد صاحب نہیں مانتے تھے کیونکہ بقول ان کے کہ یہ نام ان کی والدہ نے رکھا تھا۔۔۔۔۔ بس گھر میں سب نے ایسا کرنا شروع کیا تو بس ”مایا“ ہی سب کی زبان پر آ گیا اور جب میں شوہر میں آئی تو سب نے مشورہ دیا کہ تمہیں ”مایا“ کے نام سے ہی اپنے آپ کو متعارف کرانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔“

”گویا لوگوں کے مشورے سے چلتی ہیں؟“

☆ ”ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔ فیصلہ تو میں اپنے دل کا مانتی ہوں یا پھر کوئی اگر بہت اچھا مشورہ دے دے تو اس کا مانتی ہوں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ میں مشورہ سب سے لیتی ہوں۔“

”شہرت ملنے کے بعد عموماً لوگ اسے پرانے ساتھیوں کو بھول جاتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کی طرف کیا پوزیشن ہے؟“

☆ ”میں نے زندگی میں بہت کم دوست بنائیں اور جو بنائی ہیں وہ ابھی تک ہیں۔۔۔۔۔ اور بس میری دو ہی دوست ہیں۔۔۔۔۔ بہن اللہ نے دی نہیں۔۔۔۔۔ اس لیے والدہ ہی دوست کی صورت میں ساتھ رہیں اور ہیں۔۔۔۔۔ ہاں بس ایک تھوڑا بھائی ہے۔۔۔۔۔ بس یہی میری کل کائنات ہیں۔۔۔۔۔ والد صاحب کے بارے میں میں نے بتایا کہ وہ انتقال فرما چکے ہیں۔“

”ایک ہی بھائی۔۔۔۔۔ محبت تو بہت ہوگی؟“

☆ ”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔ مگر ہم دونوں میں لڑائیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ میرا بھائی مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔ ہم دونوں میں بحث مباحثہ بھی بہت ہوتا ہے اور اس میں ٹکرا ہوتی ہے مجھے تو اپنا بھائی اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا ہے۔“

”سین کو اچھا بنانے کے لیے کیا حکمت عملی

اپنائی ہیں؟“

”تھوڑا قہقہہ۔۔۔۔۔“ مزے کی بات یہ کہ جب کوئی لمبیہ سین ہوتا ہے تو میں ہینڈ فری لگا کر خوب سنجیدہ گانے سنتی ہوں اور موڈ بنالیتی ہوں اور جب کوئی ہلکا سا گانہ سن رہی ہوں تو پھر قہقہے لگنے لگتے ہیں۔“

”صرف موڈ بنانے کے لیے گانے سنتی ہیں؟“

☆ ”ارے نہیں۔۔۔۔۔ میری تنہائی کی ساتھی ہی میری میوزک ہے، جو کہ ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ ہینڈ فری کے ذریعے میں ہر وقت میوزک انجوائے کرتی ہوں۔“

”ڈانٹ کا خیال رکھتی ہیں؟“

☆ ”بہت زیادہ۔۔۔۔۔ کیونکہ میڈیا میں رہنا ہے تو پھر اس چیز کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔۔ کچھ لوگ کتنا ہی کھا لیں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر میرے ساتھ تو یہ خیال ہے کہ زیادہ ”ہوا“ بھی لگ جائے تو موتی ہو جاتی ہوں۔۔۔۔۔ اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے روزانہ ٹیم جاتی ہوں۔۔۔۔۔ کھانے پینے کو بہت دل چاہتا ہے مگر ”من مارنا پڑتا ہے۔“

”پاکستانی ہیں؟“

☆ ”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں ہاں تو لیتی ہوں یہ نہاری، کھانسی بھی اوس مگر کبھی کبھی۔۔۔۔۔“

”شرماتی تو نہیں

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے مایا علی سے

اجازت چاہی۔

☆ ☆

☆ ☆

☆ ☆



☆ ”غصہ بہت آتا ہے اور بہت براؤ عمل ہوتا ہے۔ تو زچہ بہت کرتی ہوں اور خاص طور پر مواصلے کی بہت شامت آتی ہے۔۔۔۔۔ بہت نقصان کر چکی ہوں۔“

”کیا چیزیں آپ کی کمزوری ہیں؟“

☆ ”بارش، اچھا موسم، اچھی میوزک، خوب

صورت مقامات اور اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق۔۔۔۔۔“

”گھر شوہر، بچے ہر لڑکی کا خواب ہوتے ہیں

”کچھ کہیں گی اس بارے میں؟“

”ہاں بالکل ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور میرے بھی ہیں

محبت خوب صورت جذبہ ہے، جب اللہ کو منظور ہوگا،

سب کچھ مل جائے گا۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے مایا علی سے

اجازت چاہی۔

☆ ☆

☆ ☆

☆ ☆



(17) ”مجھے پسند ہے؟“  
 ”تقریف کے بجائے تنقید..... میں چاہتا ہوں  
 کہ لوگ مجھے میری خامیاں بتائیں تاکہ میں اپنے  
 آپ کو مزید اچھا کر سکوں۔“  
 (18) ”آج کی فکر زیادہ ہوتی ہے یا کل  
 کی؟“  
 ”آج کی..... کل کے لیے زیادہ نہیں  
 سوچتا..... جو آج کا دن ہے وہ زیادہ اچھا گزرتا  
 چاہیے۔“  
 (19) ”چھٹی کا دن گزارتا ہوں؟“  
 ”اپنے بستر پر..... اس سے اچھی جگہ کوئی اور ہو  
 ہی نہیں سکتی۔“  
 (20) ”عورت کے لیے میری سوچ؟“  
 ”جسین ہو مگر ذہین بہت ہو..... ذہانت جس  
 پر ہماری دوتی ہے۔“  
 (21) ”شاپنگ میں پہلی ترجیح؟“  
 ”جوتے، مجھے یہی چیز پسند ہے..... اور قیمتی  
 سے قیمتی جوتا بھی پسند آجائے تو بخوبی نہیں کرتا۔“  
 (22) ”کھانا انجوائے کرتا ہوں؟“  
 ”اپنے بیڈ پہ اور ہاتھ سے کھاتا ہوں کہ سنت

”دوست اپنے ٹیائٹ سے آیا..... کیونکہ ابا  
 سے ٹیائٹ درٹے میں ملا۔“  
 (8) ”پہلی کمائی سیلبر بیٹ کی؟“  
 ”بالکل کی دو ہزار والدہ کو دیے اور تین ہزار  
 سے اپنی شاپنگ کی۔“  
 (9) ”شوہر میں آکر معلوم ہوا کہ.....؟“  
 ”لوگ بہت پسند بھی کرتے ہیں، پیار بھی  
 کرتے ہیں۔ مگر قبول نہیں کرتے۔“  
 (10) ”ٹیلی میں سب سے پیاری شخصیت؟“  
 ”میرے ابا، بہت عزیز ہیں مجھے..... ان کی  
 کوئی بات نال نہیں سکتا۔“  
 (11) ”نیند کتنی پیاری ہے؟“  
 ”بہت پیاری ہے۔ اٹھ کر دوبارہ سونے کو دل  
 چاہتا ہے۔ مگر کام بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ کہتے  
 ہیں تاکہ ”کمائیں گے نہیں تو کھائیں گے کہاں سے۔“  
 (12) ”بھوک برداشت ہو جاتی ہے؟“  
 ”ہرگز نہیں..... مزاج بہت چڑچڑا ہوا جاتا ہے  
 ۔ نصہ آتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا نہیں  
 چاہیے۔“  
 (13) ”دوست بناتا ہوں؟“  
 ”بہت کم..... بس جو بن گئے سو بن گئے۔“  
 (14) ”ایسا بیکند ہوتا ہوں؟“  
 ”اگر وہ کمٹ کے لیے..... جب کوئی  
 ”اے“ سے بھی تعظیم حاصل کی۔“  
 (6) ”شادی؟“  
 ”الحمد للہ..... اور اللہ نے اولاد کی نعمت سے  
 بھی نوازہ ہوا ہے۔“  
 (7) ”شوہر میں کون لایا؟“

میری بھی سینے

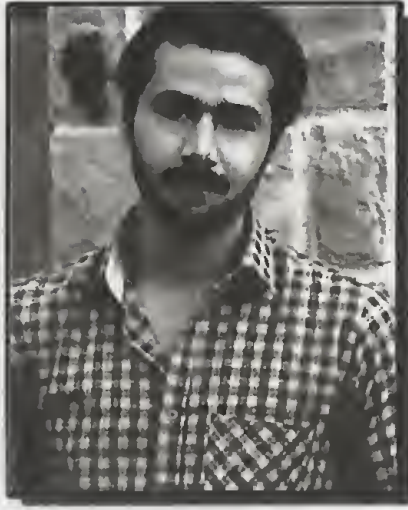
علی عباس

شاہین رشید



(1) ”نام؟“  
 ”علی عباس۔“  
 (2) ”پکارا جاتا ہوں؟“  
 ”بھئی کے نام سے۔ ویسے لوگ علی کہتے ہیں مگر  
 بے تکلف لوگ بھئی کہتے ہیں۔“  
 (3) ”دنیا میں آمد؟“  
 ”11 فروری 1986ء۔“  
 (4) ”گھر کا لیڈر؟“  
 ”بچوں میں تو میں ہی ہوں۔ میرے بعد بہنیں





”نفسہ“ مجھ میں غصہ بہت ہے۔ چاہتا ہوں کہ کم اؤٹے۔“  
 (42) ”حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ”بہت ساری کامیابیاں، بہت ساری شہرت، بہت زیادہ عزت۔“  
 (43) ”مشورہ دیتا ہوں؟“  
 ”اپنے ابا سے، اپنے دل سے، اپنے دماغ سے اور کرنا وہی ہوں جو میرا دل کہتا ہے۔“  
 (44) ”بدلہ لیتا ہوں؟“  
 ”نہیں نہیں..... ایسا کچھ نہیں، معاف کر دیتا ہوں اور اگر مجھ سے بھی کبھی غلطی ہوتی ہے تو فوراً اس کا اعتراف کر کے سوری کر لیتا ہوں۔“  
 (45) ”فریش رہتا ہوں؟“  
 ”جب گھر آتا ہوں اور اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہوں..... یا پچھلا ہور ابا کے پاس جاتا ہوں۔“  
 (46) ”کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں؟“  
 ”جب انسان بے بس ہو تو غصہ کھانے پر ہی اکتا ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے..... غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتا ہوں..... اور خاموشی اختیار کر لیتا ہوں۔“  
 (47) ”میری زندگی کا بہترین دور؟“  
 ”جو گزر گیا وہ بچپن تھا اور اب جو گزر رہا ہوں وہ زندگی کا بہترین دور ہے۔“  
 (48) ”بیشہ دیر کر دیتا ہوں؟“  
 ”جی..... ہمیشہ لیٹ ہو جاتا ہوں۔ کبھی بھی جانا آد۔“  
 (49) ”کن رسموں کے خلاف ہوں؟“  
 ”شادی بیاہ میں جو فضول رکھیں ہوتی ہیں۔ ان پر ہے روٹی پیسہ خرچ کیا جاتا ہے اس کے خلاف ہوں۔“  
 (50) ”دل بہلاتا ہوں؟“  
 ”اچھی میڈیک اور ٹی وی کے مختلف پروگراموں سے۔“

(51) ”ایک دعا جو ہر وقت لیوں پر رہتی ہے؟“  
 ”اے اللہ میرے والدین کو سلامت رکھ اور مجھے ان کی خدمت خاطر کرنے کی توفیق عطا فرما اور یہ کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکوں۔“  
 (52) ”کسی آئی ہے؟“  
 ”جب غیر سنجیدہ لوگ سنجیدہ کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“  
 (53) ”بچپن کا پسندیدہ تہوار؟“  
 ”عید، شب برات اور بڑا ہوا تو بسنت بہت بھایا۔“  
 (54) ”فٹ رہنے کے لیے کیا کرتا ہوں؟“  
 ”ایک سرساز..... ایک زمانہ تھا جب میرا وزن 87 کے جی تھا۔ دن رات محنت کی اور اپنے آپ کو نارل کیا۔ اب تو اللہ کا بہت کرم ہے۔“  
 (55) ”شہرت مسئلہ بن جاتی ہے؟“  
 ”جب آپ عام لوگوں کے سامنے نہ آتا چاہتے ہوں اور چھپنے کی کوئی جگہ بھی نہ ہو۔“  
 ☆☆

بھی ہے اور مزاج بھی آتا ہے۔“  
 (23) ”میں ڈرتا ہوں؟“  
 ”لوگ اکثر کہتے ہیں کہ میں فلاں کیڑے مکوڑے سے ڈرتا ہوں۔ یا فلاں چیز سے ڈرتا ہوں..... مگر کچ پوچھیں کہ میں ”بیماری“ سے ڈرتا ہوں۔ ہر وقت دعا کرتا ہوں کہ اللہ زندگی دے تو صحت والی۔“  
 (24) ”جلدی شادی کیوں کی؟“  
 ”ابا کو داد بننے کا بہت شوق تھا۔ ہا ہا ہا.....“  
 (25) ”اگر میں.....؟“  
 ”اگر میں پاور میں آ گیا..... کوئی بڑا عہدہ مل گیا تو سارے سیاست دانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر نچوڑیا میں ڈبو دوں گا۔“  
 (26) ”میرے پاس ذخیرہ ہے؟“  
 ”جو توں کا۔“  
 (27) ”موڈ خراب ہو جاتا ہے؟“  
 ”جب سب چشیاں انجوائے کر رہے ہوں اور میں کام کر رہا ہوں۔“  
 (28) ”افسوس ہوتا ہے؟“  
 ”جب کوئی ہماری جدوجہد کو تسلیم نہ کرے اور یہ سمجھے کہ بغیر کسی کوشش کے اللہ میاں نواز رہا ہے..... اللہ بھی محنت کرنے والوں کا ہی ساتھ دیتا ہے۔“  
 (29) ”اظہار کتنا ضروری ہے؟“  
 ”بہت زیادہ..... خواہ خوشی کا ہو، دکھ کا ہو یا محبت کا۔ میں نے کئی لوگوں کو ایسے تین مواقعوں پہ بہت بے حس دیکھا ہے۔“  
 (30) ”بہت نقصان اٹھاتا ہوں؟“  
 ”جب سچ بولتا ہوں۔ سچائی کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔“  
 (31) ”کھانے کے لیے مخصوص جگہ؟“  
 ”کوئی نہیں..... جہاں پتا چلتا ہے کہ یہاں کا کھانا اچھا ہوتا ہے وہیں کھا لیتے ہیں۔ نئی نئی جگہ بھی آزمائی جاتی ہے۔“

(32) ”خواتین کا کون سا روپ پسند ہے؟“  
 ”خواتین خدا کی حسین ترین مخلوق ہیں۔ ان کا ہر روپ خوب صورت ہے۔ خواہ وہ ماں کا ہو، بیوی، بہن، یا بیٹی کا..... ہر رشتہ بہت پیارا اور خوب صورت ہوتا ہے۔“  
 (33) ”اپنے گھر میں پسندیدہ کمرہ؟“  
 ”اپنا بیڈ روم۔“  
 (34) ”غصہ تیز ہے؟ کس کا؟“  
 ”ابا کا..... اچھے بھی بہت ہیں مگر غصے کے تیز بھی بہت ہیں۔ ڈر لگتا ہے ابا کے غصے سے۔“  
 (35) ”پسندیدہ ادیب؟“  
 ”منٹو..... بہت پسند ہیں اکثر ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔“  
 (36) ”زندگی میں سکون کب محسوس ہوتا ہے؟“  
 ”جب موبائل سر دس آف ہوتی ہے۔ تو اچھا لگتا ہے۔ فراغت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔“  
 (37) ”ٹی وی کا کوئی ایسا پروگرام جو بند ہو جانا چاہیے؟“  
 ”میرے خیال میں ٹاک شو..... نہیں، نہیں..... مارنگ شو بند ہو جانے چاہئیں۔ فضول ہوتے ہیں۔“  
 (38) ”دنیا کا بہترین ملک؟“  
 ”پاکستان کے بعد سویٹزر لینڈ۔“  
 (39) ”کھانے میں پسندیدہ چیز؟“  
 ”ہری مرچیں..... اگر یہ الگ سے نہ ہوں تو کھانے کا مزہ نہیں آتا۔“  
 (40) ”ایک ادبی شخصیت جن سے ملنا چاہتا ہوں؟“  
 ”منٹو۔“ کیا خوب صورت تحریر ہوتی ہے ان کی۔“  
 (41) ”میں اپنے میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں؟“

## مقابلہ آئینہ سحر النساء تبسم

اڑاؤ

س ”اصلی نام؟ گھر والے پیار سے کیا بلاتے ہیں؟“  
ج ”اصلی نام سحر النساء تبسم ہے پیار سے چھوٹی بہن سحری کہتی ہے اور تابی۔“  
س ”آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟“  
ج ”آئینہ کچھ نہیں، البتہ میں آئینہ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے سادہ سی پیاری شکل دی۔“  
س ”حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟“  
ج ”حسین صورتیں دیکھ کر دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اگر اس کے بنائے بندے اتنے خوب صورت ہیں تو بنانے والا کتنا خوب صورت ہوگا؟ لیکن کچھ لوگ اپنے حسن پر غرور کرتے ہیں اور دوسروں کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ ان سے کم ہے جو کہ غلط ہے خیر یہ ایک بھی بحث ہے۔“  
س ”آپ کی پرس کی تلاشی لی جائے تو؟“  
ج ”تو اس میں سے موبائل، لب اسٹک، کریم، میز برش، چھوٹا آئینہ، نیل پینٹ، لوشن اور جھوٹی ڈائری اور نسل ایک بریسلٹ۔“  
س ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“  
ج ”جی ہاں بالکل۔“  
س ”مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟“  
ج ”ہر طرح کے، بس جو بے وقت یعنی شام کو یا

پھر کہیں جارہے ہوں تب آئیں پھر تو مشکل ہو جاتی ہے۔“  
س ”کھانے میں کیا پسند ہے؟“  
ج ”کس سبزی، آلو گوشت، قیمہ آلو، جے دانی وال تقریباً سب کچھ کھا لیتی ہوں خیر نہیں کرتی، اچھی بچی ہوں اس لیے۔“  
س ”اگر آپ کو حکومت مل جائے کیا کریں گی؟“  
ج ”میں تعلیم کا نظام ٹھیک کر دوں گی آج کل کے دور میں صرف تعلیم امیروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے جبکہ ان کی جگہ غریبوں کو بھی جگہ دی جائے تو وہ کئی گنا زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اف یہ بحث بھی ہے۔“  
س ”پسندیدہ شاعر؟“  
ج ”وصی شاہ، غالب، احمد فراز، ناصر کاظمی دیے سب کو پڑھ لیتی ہوں۔“  
س ”مزاج لڑاکا ہیں؟“  
ج ”لڑاکا؟ میں لڑاکا نہیں ہوں بلکہ میں تو خود غصہ کرتے ہوئے رو پڑتی ہوں۔“  
س ”کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟“  
ج ”خوش اخلاق، کم بولنے والے اور پیار محبت اور شفقت سے پیش آنے والے۔“  
س ”اگر لوڈ شیڈنگ نہ ہوتی تو؟“  
ج ”تو کیا ہی بات نہیں سب کام وقت پر ہو جاتے۔“  
س ”اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟“  
ج ”اللہ کو یاد کرتے ہوئے ہر وقت خود بخود بہترین ہو جاتا ہے۔“  
س ”آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟“  
ج ”میں اپنے ادب تو نہیں لیکن دوسروں پر خرچ کرتی ہوں اور وہ مجھی کھلے دل سے لیکن اسی مجھے فضول خرچ کہتی ہیں۔“  
س ”کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟“  
ج ”جی ہاں! بالکل میرا نام تو مجھ پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔“

س ”وہ لون سے کام نہیں کرتے ہوتے نیال اننا کہ لہا کیا کہے گی؟“  
ج ”میں دنیا کے بارے میں نہیں سوچتی بلکہ جو دل لہنا ہے میں وہی کرتی ہوں۔“  
س ”آپ سنان راستے سے گزر رہی ہوں اور انہیں لگ جائے؟“  
ج ”تو میں چیخنے چلانے کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے بچانے میرے کرن ارجن تو نذر ایمان میری بہن اور امی تو ضرور آئیں گی۔“  
س ”آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟“  
ج ”میرے لیے محبت بہت خوب صورت جذبہ ہے لیکن آج کل کے لوگوں نے اسے ٹائم پاس اور مذاق بنا کر رکھا ہے۔“  
س ”کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“  
ج ”میں لوگوں کی نہیں بلکہ اللہ کی احسان مند ہوں، مجھ سے سچی محبت کرتا ہے۔“  
س ”اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں؟“  
ج ”بہت! کون نہیں ہوتا خوش، مجھے تعریف سننے کو ملتی ہیں اس لیے بہت خوش ہوتی ہوں۔“  
س ”اگر آپ کی سبکدوشی ہے؟“  
ج ”میں سبکدوشی نہیں چاہتی ہوں۔“  
س ”اگر آپ کو دنیا سے ہٹا دیا جائے تو؟“  
ج ”میں دنیا سے ہٹا دیا جائے تو میں بھی دنیا سے ہٹا دیا جائے۔“  
س ”اگر آپ کو دنیا سے ہٹا دیا جائے تو؟“  
ج ”میں دنیا سے ہٹا دیا جائے تو میں بھی دنیا سے ہٹا دیا جائے۔“

میری امی ہیں اگر وہ کبھی ناراض ہو جائیں تو ان کے پیچھے لگی رہتی ہوں سوری کہتی ہوں کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں اب باپ ہے باپ ہی جانی ہیں۔“  
س ”حقیقی خوشی کس وقت ملتی ہے؟“  
ج ”جب میری امی میری وجہ سے مسکراتی ہیں۔“  
میری کام کی تعریف کرتی ہیں۔“  
س ”زندگی سے کیا سبق سیکھا؟“  
ج ”آہ زندگی سے یہ سبق سیکھا ہے کہ اس دنیا میں اکیلے آئے ہیں اکیلے جائیں گے ہمارے اعمالوں کے سوا کوئی ساتھ نہیں ہوگا سب اچھے وقت کے ساتھی ہیں برے وقت میں تو اپنے بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔“  
س ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“  
ج ”جی ہاں جو آسمان پر ہوتے ہیں میں شام کو ان سے ہر دل کی بات شیئر کرتی ہوں۔“  
س ”کوئی آخری بات؟“  
ج ”آخری بات یہ ہی ہے کہ کسی بندے کو اپنا ہم راز نہ بنائیں کیونکہ انسان تو پیٹ میں نہیں رکھ سکتا ہے ساری باتیں ایک اس کی ذات سے شیئر کرے جو کہ بہتر ہے پاک ہے۔“  
س ”کوئی ایسی بات جو ذہن میں ہمیشہ رہتی ہے؟“  
ج ”میں کہیں کہیں اپنی جان سے عزیز اپنوں کو نہ کھودوں ڈر لگتا ہے اس دنیا میں اکیلے رہ جانے سے پھر نیال آتا ہے کہ اللہ ہے ہاں! جب سب ہاتھ اور پاؤں پھیل جائیں تو وہ کی انکی پڑنے والے کو بھیج دیتا ہے۔“

☆☆

پٹن اور آپ

میں انعام کا حق دار قرار دیا ہے۔ ادارے کی جانب سے تسمینہ طاہرہ کو اعزاز ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے۔

رخ چوہدری

## سچائی کا سر

!! لندن کے انتہائی سرد موسم میں بڑھیا نائٹ کلب کی عمارت کے نیچے بیٹھی ہر آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کر کے اپنے بیمار شوہر کی دوا اور کھانے کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ اچانک ٹی اے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑھیا کی جمع شدہ رقم لے کر بھاگ جاتی ہے۔

”سلیم منزل“ کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین جن کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری یعنی نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر نواب علیم الدین اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کر آتے ہیں اور اس پسند میں سلیم الدین اور دونوں بہنوں کی پسند شامل ہوتی ہے مگر حمیدہ خاتون مختلف زبان، مختلف ثقافت اور کم تعلیم یافتہ بہو کو دل سے قبول نہیں کرتیں اور دن رات کڑھا کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزا جانا پیادہ مزاج، اکھڑ، بات بات پر بیوی کی بے عزتی اور اس پر ہاتھ اٹھانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ظہیر احمد اور قمر کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں اسامہ، شمیم، نگلیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد سخت ضرور تھے مگر بیوی پر ہاتھ اٹھانے کو مروی بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عابد اور ساجد جو اسامہ اور شمیم کے منگیتر ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو نگلیل اور جمیل کی منگیتر ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔ اب آگے پڑھیے۔

## چھٹی قسط





”او کے! میں نکلتی ہوں موسم کا موڈ تو خاھا بگڑا ہوا لگ رہا ہے۔“ روبیکا نے جھک کر اپنا بیگ اور گاڑی

کی چابیاں اٹھائیں۔

”میں! تو کہہ رہی تھی کچھ اور رک جاؤ اور راہی بھائی کے لیے وال چاول لیتی جاؤ۔ ان کو پسند ہیں۔“

”ارے! ایسے ویسے راہی تو جان ہے ہر ویسی چیز میں، ٹھیک ہے بنا لو پھر۔ خوش ہو جائے گا اپنی پسندیدہ

چیز دیکھ کر اور میرا لٹ ہو جانا بھی برداشت کرے گا۔“ روبیکا نے بیگ واپس میز پر رکھا اور بیٹھ گئی۔

”ہائے! آئی ہاؤڈاریو۔“ اب یہ نجائے نجمہ کی کس نمبر کی بیٹی تھی مگر بڑی حسین کی طرح آزادی لباس

سمیت ہر چیز سے بے نیاز۔

”آئی ایم فائنڈ اینڈ یو۔“ اور اس کے پاس آنٹی کے حال احوال کا جواب دینے کا ٹائم بھی نہیں تھا بیگ

لہراتی اسے بائے کرنی چاہتی تھی۔

”دیکھا تم نے یہ تو چلن ہیں یہاں کی نسل کے، خیر تم کافی پوٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ کھانے میں تھوڑی

ہے۔“ نجمہ نے اس کی طرف گرم گرم کافی کا گنگ بڑھایا جس سے اٹھتا دھواں ماحول کی تھنڈک میں زیادہ اڑان

بھرسکا۔ جلد ہی ٹھنڈا ہونے لگا۔ روبیکا سب لیتی رہی وہ واقعی گرم کافی ہی پیتا چاہ رہی تھی۔

”ہاں، بات تمہاری درست ہے نجمہ مگر اس کا ذمہ دار ہم اپنی اولاد کو نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہم نے خود ان کو اس

راستے پر ڈالا ہے۔ جس پر چل کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ میرا تمہارا مسئلہ ہی نہیں نجمہ، ہر پاکستانی کا مسئلہ

ہے جو یا تو اپنے اپنے سسرالیوں سے ڈر کر بھاگے ہیں۔ یا کمانے کی غرض سے آئے ہیں۔ اب چونکہ اوکھلی

ہم نے سروے دیا ہے۔ تو موسلوں کی ضربیں بھی برداشت کرنا پڑیں گی نا۔“

نجمہ اور روبیکا سوچ کے ایک جج پر تھیں اس لیے ایک دوسرے کا دکھ سمجھ سکتی تھیں۔

”وہی ہے روبیکا! تمہارے اپنے خاندان یا سسرال میں۔ کوئی عزیز رشتہ دار۔“ روبیکا نے کافی کھنڈا

لیا۔ اور اکتا کر کہا۔

”ارے، ہمیں نجمہ! کہنا میرا میکا اور سسرال ہے بھی نہیں۔ ہوتے تو میں خود آخر کرتی۔“

”لیکن راہی بھائی تو بتا رہے تھے کہ تم لوگوں کے جڑواں بیٹے بھی ہیں۔“ نجمہ کی اس بات پر روبیکا

چونک کر نجمہ کو یکساں چپٹ اس نے بٹے ہاتھوں چوری کرتے پکڑ لیا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب ناگ کی

اتری، ہونٹ سکڑے، آنکھوں کی نمی کو نجمہ نے دیکھ لیا اور اس کی گواہی کے پوروں میں سیٹھتے بھی دیکھ لیا۔

ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر وہ بیک پھر کھڑی ہوئی۔

”اچھا! ایسا ہے تو اپنے راہی بیوی سے پوچھنا وہ جڑواں بیٹے کہاں ہیں اور پلیز جاؤ دیکھو تمہاری والدہ

بے توجہ دو۔ راہی کا موڈ اچھا ہو جائے گا۔ ورنہ دیر ہونے پر وہ بکھری کھری کھری سنائے گا، پانڈوں کی طرح۔“

روہیکا کے اس طرح تیور بدلتے دیکھ کر نجمہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر ہلکا سا مسکرا کر بچن کی طرف بڑھ

☆ ☆ ☆

”اچھا! تو فرجاد میاں، تمہارا تعلق فیصل آباد سے ہے۔“ راہی نے اپنے سامنے کھڑے نو جوان کو دیکھ

راہی کی اپنے اسٹور کے لیے دی گئی آن لائن نوکریوں کے لیے دیے گئے ایڈ پر آیا تھا۔ ٹھیک ٹھاک پاکستان

خوب رو نو جوان قابل توجہ تھا۔ ہاتھ میں ڈگریوں کا پوٹ نوٹیو بھی تھا۔

”جی سر۔۔۔۔۔!“

”تو پھر بیٹھ جاؤ۔ میرا پاکستانی شہری یوں پرائے ملک میں میرے سامنے یوں مودب کھڑا ہو۔ مجھے

بہادر راہی کی اچھائی، پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت سے متاثر ہو کر بیٹھ گیا۔

بہادر راہی۔ ہر چند کہ میں نے خود آن لائن ایڈ دیا تھا اپنے اسٹور کے لیے اور چاہتا بھی ہوں کہ

وہ زیادہ اپنے ہی ملک کے نو جوانوں کو جاب دوں۔۔۔۔۔ مگر بیٹا میری ولی خواہش یہ ہے کہ میرے

ساتھ قابل ہیں۔۔۔۔۔ اتنا پڑھتے ہیں تو۔۔۔۔۔ اپنی قابلیت سے اپنے ملک ہی کو فائدہ پہنچائیں مگر۔۔۔۔۔

راہی ان مردہ سا ہو گیا اور اشارے سے اپنے ورکر کو کافی لانے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر میں کافی آ گئی۔ مگر

راہی ہائیں فرباد کو کچھ بھائی نہیں تھیں۔ تاہم وہ چپ چاپ کافی پیتا رہا۔ پھر دریاغ کی زمین پر کھلاتے کیڑے

آپ ہائل درست کہہ رہے ہیں سر۔۔۔۔۔ سوری ٹو سے کہ آ۔۔۔۔۔ آپ جب ملک سے اتنی محبت کرتے ہیں

تو آپ یہاں۔۔۔۔۔ مطلب!

اس بات پر راہی نے ایک کرب تاک سانس لیا جو اس کے سینے کو چیرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر اس نے

ذہنی سے مسکراہٹ کے ساتھ۔۔۔۔۔ فرجاد کو دیکھا۔

”بیٹا! یہ انسان بھی ناں بڑی عجیب چیز ہے۔ کبھی تو ارادوں کی پختگی سے فولادی دیواریں توڑ ڈالتا

تو کبھی بھی اتنا مجبور ہے بس کہ خود کو مجبور یوں کی مرضی کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر وہ جہاں چاہیں اس کو

لے جائیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ خیر میاں مجھے چھوڑ داپنی سناؤ۔۔۔۔۔ انڈر پوٹ تمہارا ہے۔۔۔۔۔ لے تم

ارے ہو۔“ راہی نے قدرے ہنس کر کہا تاکہ فرجاد خوف زدہ نہ ہو جائے۔

”اودہ سوری۔۔۔۔۔! سریوں ہی پوچھ لیا تھا۔۔۔۔۔ میری اسٹوری تو یہ ہے کہ بڈل کلاس کا نو جوان ہوں۔۔۔۔۔ بڑی

پڑھا ہوں۔ والدین نے پیٹ کاٹ کاٹ کر اچھی ڈگریاں دلوائیں کہ دن اچھے آجائیں گے، ان

کی ولی وجہ سے۔۔۔۔۔ مگر جب بیٹا صاحب ڈگری یافتہ ہو گیا تو اسے جاب ملتی ہے، کسی ہونٹ میں بیرے کی۔

بہاں! ان پڑھ بیٹھ کی ڈگریوری کی تو۔۔۔۔۔ سراسر انسان مصیبت تو اچھے دنوں کے لیے جھیلتا ہے ناں، وہ بھی نا

نہاں فرار پر اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے میرے بوڑھے والدین کی دعا میں ہی ملی ہیں۔ میں یہاں آپ

نہاں! بیٹا ہوں۔ اگر آپ ہم جیسے پاکستانی نو جوانوں کو یہ پلیٹ فارم نہ دیتے تو میں ابھی بھی۔۔۔۔۔

نہاں! کرتے۔۔۔۔۔ شاید فرجاد کی آنکھوں کے کنارے پھٹکے تھے۔ تین بہنیں، بیوہ بھابھی اور بوڑھے

انسانوں تک تیرتے آ گئے تھے۔

انٹلی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

ایٹ آل۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہے ناں۔“

☆☆☆

انسان کا اٹھا ہاتھ میکا کی انداز میں نیچے آ گیا۔

ہاؤ۔۔۔۔۔ تم ہوتے کون ہو تم سے باز پرس کرنے والے۔۔۔۔۔ میں تمہارا باپ ہوں۔“

ہاؤ! سری گوشی ماں ہی سن پانی چپکے سے منیبہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ارمغان سپاٹ چہرہ لیے۔

انسان کا انداز بھی نہ بھایا۔

پلیر ہے ہونٹ انڈیا! کسی کا مجرم نہیں اوکے۔ جو کام کیا ہمیشہ لیگل کیا۔ پوچھو اپنی

اپنا اپنی گواہی کی ضرورت کی محسوس ہوئی۔

ہاں! میں ساجد! یوں بیٹے کو خواتین وے رہے ہیں؟

”اس لیے کہ بیٹے نے باپ کو وضاحتی عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔ تو بتاؤ، میں کسی کا مقروض نہیں ہوں ان کا، نہ تمہارا اور نہ ہی دوسری بیوی اور بیٹیوں کا۔“ ساجد کو احساس نہیں ہوا غیر محسوس انداز میں وہ اپنا بایاں بازو دبائے لگا۔

منیبہ نے ارمغان کو گھور اور خود ساجد کو پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

ارمغان ایڑیوں پر گھومتا واپس مڑا اور سیدھا سرمد کے پاس جا پہنچا۔ وہ دوست جو اس کو بھائیوں جیسا تھا اور اس کی زندگی میں یہی ایک دوست تھا جس سے وہ ہر بات شیئر کرتا تھا۔

”یار سرمد! ابھی بھی سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے سارے فرائض ادا کر دیے۔ یار وہ..... وہ کیوں نہیں سمجھتے میں..... میں اپنی شناخت چاہتا ہوں۔ اس گھر میں جو ہمارے دادا ابا کا گھر ہے، جہاں دوسرے بہن بھائی کزنز پورے حق اور استحقاق سے رہ رہے ہیں اور ہم یہاں بغیر کسی شناخت کے رہ رہے ہیں۔ ہم نے ہماری ماں نے ڈر کے سائے میں سارا بچپن گزارا ہے۔“

اب وہ اپنے دوست سرمد کے سامنے دل کھولے بیٹھا تھا۔

”بات! تمہاری درست ہے ارمغان مگر یار..... پوچھ لی کہ تمہارے والدین حیات ہیں۔ والد کا سایہ ماں کا سایہ سر پر موجود ہے۔ ہم تینوں بہن بھائی کو دیکھو، دنیا کی ہر نعمت ہے، دولت ہے، بہترین بزنس ہے۔ مگر ماں باپ! ہمیں اس وقت چھوڑ کر گئے جب میں بمشکل اٹھارہ سال کا تھا۔ دو بہنیں سعدیہ حاویہ..... میرے حوالے کر گئے۔ اللہ کریم کا شکر کرو والدین حیات ہیں، ہماری طرح وقت اور حالات کی کڑی دھوپ تم لوگوں کو چھو کر بھی نہیں گزرتی۔“

زندگی میں کچھ ایسے دوست ہوں جو آپ کو شکر کا راستہ دکھادیں تو اللہ کا شکر اُنہ پھر بھی بنتا ہے۔ ارمغان پل بھر کے لیے خود کو مجرم سا محسوس کرنے لگا اپنے والدین کا۔

”ہاں یار۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں جس وہاں اپنے دادا کے گھر میں سب کے ساتھ اسی حیثیت کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور اب کیوں گریز پائیں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”چلو یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔ گھر چلو آج سعدیہ نے خود اپنے ہاتھوں سے مٹن بریانی بنائی ہے۔ اور یہ دیکھو آج آیا ہے۔ ارمغان بھی اسے کیسے گاؤہ ضرور آئیں۔“

سرمد نے باقاعدہ اپنا موبائل اس کے سامنے رکھ دیا وہ پڑھ کر زیر لب مسکرا دیا۔

”تو چلیں..... اچھا وہ تمہارے کزن ہمایوں صاحب ہوں گے۔“ میز سے اٹھتے ہوئے ارمغان نے اپنے موبائل اور چابیاں اٹھاتے ہوئے پوچھا تو سرمد نے بھی اپنی چابی اٹھائی اور دونوں کا بی ہاؤس سے باہر نکلے۔

”ہاں کل ہی تو وہ وہی ٹور سے آیا ہے..... کیوں؟“ سرمد نے چابی سے گاڑی کا دروازہ کھولا تو ارمغان نے پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کو دیکھا۔ اس سوال پر پلٹا۔

”کچھ خاص تو نہیں..... بس کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“

”عجیب.....! ارے یار ہمایوں اتنا پینڈم ہے اتنا گڈ لکنگ ہے کہ جہاں سے گزرتا گزریاں..... دیکھ رہے جاتی ہیں۔“

”ہاں، ہاں ہے تو واقعی ایسا ہی..... چلو نکلو میں بھی اپنی گاڑی نکالتا ہوں۔“

☆☆☆

”ارے واہ! آج ہماری شیف صاحبہ نے کیا بنایا ہے۔“ ہمایوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا۔ بریانی کی خوشبو نے جکڑ لیا اور سعدیہ جو اس کے متاثرین میں سے تھی، دھڑکتے دل کے ساتھ چپ کھڑی رہی۔ حاویہ نے شو

یہاں۔

”مٹن بریانی بنائی ہے۔ کیونکہ کل آپ مٹن بریانی کو یاد کر رہے تھے۔ تو آج ہماری

ارمغان کو ہمارا الٹا خیال ہے۔“

”ایسا خبر نہیں آپ کا کتنا خیال ہے۔“

انہماک سے کہنا سنا سارا پل بھر کو ٹھنایا اور کہیں چھپ گیا شرماء۔ ہمایوں اس کی طرف دیکھتا پوچھ رہا تھا۔

”اس کو الفاظ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی..... وہ تو اس کی ایک نگاہ التفات پر ہی جان پھیلی پر رکھ دیا کرتی۔“

اب تک یہ خاموش ہے وجود محبت اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ یہ تو دھڑکنیں ہی مٹنی پر آمادہ ہو جایا کرتیں تو وہ جلدی سے ان کو دبا دیتی۔

”اچھا تو سمجھی، پھر ہمارے اور بریانی کے درمیان اس حدائی کا سبب۔“ ہمایوں سعدیہ کے دل میں اپنا مقام جانتا تھا اس لیے سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا قریب آیا تو سعدیہ گھبرا گئی۔

”جی بس تھوڑی دیر ہے۔ بھیا اور ارمغان بھائی آجائیں تو کھانا لگائی ہوں۔“ اور وہ صوفے پر بیٹھ رہا تھا ارمغان کا نام سنتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”کتنی بار منع کیا ہے میں تمہارے منہ سے ارمغان کا نام سننا نہیں چاہتا..... پھر۔“ سعدیہ گھبرا

”ہی ہمایوں بھائی!.....!“

”اف! مار ڈالو کی تم مجھے بھائی بھائی کہہ کہہ کر..... کس نے کہا میں تمہارا بھائی ہوں۔ نہیں ہوں میں تمہارا

مالی، کزن ہوں..... اؤکے کزن اور کزن کے ساتھ اور رشتے بھی ہو سکتے ہیں۔ تم کہو چڑیا۔“

ہمایوں نے فرسٹ ایئر کی طالبہ جو ابھی کچھ دیر قبل ہی کانچ سے آئی تھی حاویہ کی پوٹی کو چھیڑا تو وہ مصنوعی

”سعدیہ لیٹ گئی۔“

”ہاں! ہمارا گڑیا کو کیا اچھا نہیں لگتا۔“ اسی وقت ارمغان اور سرمد آگئے ہمایوں کا منہ بن گیا

”اے!..... ہوجائیں میں لچ لکوائی ہوں۔“

”ہمایوں کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی ناراضی کے ناز اٹھاتی چلی گئی۔“

”ہت! اتنے بزنس مین تھے۔ روپے پیسے کی ریل چل رہی تھی گھر میں اچھی پڑھی لکھی بیوی

”تھو اور ایک کزن کا بیٹا ہمایوں جو اپنے والدین کی وفات کے بعد بالکل بے آسرا

”ب نے اسے گولے لیا۔ اس کا اپنا کوئی خون کا رشتہ موجود نہیں تھا۔ وہ جو تین

”الہ کی والدہ کی گود میں آیا تو گویا ان کی زندگی کے وجود کا وہ حصہ بن گیا۔ جس

”ہمایوں اس گھر کے افراد کی پھیلی کا چھالا تھا۔“

”اور زین انداز میں گزر رہی تھی کہ اچانک ہی ایوب صاحب اور بیگم ایک فضائی

”ارباں سرمد کے نوجوان کاغذوں پر آگئیں اور سنجیدہ مزاج سرمد ان ذمہ

”ہاں۔“ ساتھ ساتھ پڑھ بھی رہا تھا۔ سعدیہ حاویہ کو وہ۔“

”حق کا بھوت سوار تھا۔ میں نے کہا تھا ناں اگر تم شادی کر رہے ہو تو گھر میں باقاعدہ اعلان کر دو۔ مگر تم نے اپنی نیب کے ساتھ شادی کو چھپا کر سب کے ساتھ زیادتی کی ہے۔۔۔۔۔ اور بچے اپنے دادا کے گھر آ کر اپنی حیثیت بپا کرتے ہیں تو کچھ غلط نہیں کہہ رہے یہ ان کا حق ہے جیسے دوسرے بچوں کا ہے۔“

”تو۔۔۔۔۔ تو ویسے پھر ان کو ان کا حق۔۔۔۔۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا اب اس عمر میں جب سب کو پتا چلے گا کہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

زندگی میں پہلی بار ساجد ہارے ہوئے تھے۔ جونے نظر آئے انہوں نے بر ملا بھائی کے ساتھ تھپار ڈال دیے۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ غائبے مشورہ مانگ رہے تھے۔ بات تو ساجد کی درست ہی تھی..... کوئٹہ ٹھینہ اسے پسند نہیں تھی مگر پھر بھی اب تک بھارے تھے۔ مٹیہ اور ان بچوں کا، دادا کے گھر پر پورا حق تھا جو ان کو نہیں مل رہا تھا۔ اور دروازے پر دستک دیتا بڑھا پا اس بات کا متقاضی تھا کہ اب ساجد اپنے بیٹوں کو اپنی پہچان بنائیں اپنی ذمہ داریاں ان سے شیئر کریں۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ کیسے گھر میں سب کو بتائیں اور وہ کیا سوچیں گے ساجد کے بارے میں۔ ٹھینہ کو تو اچھا تھا اور شوہر بچتا تھا، اس لیے اس نے خاموشی سے تھپار ڈال دیے تھے مگر سارہ زار اور عمارہ کو کیسے بتائیں۔ کیسے فیس کریں ان ہی سوچوں نے ساجد کو سوچ میں ڈال دیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں اسماء سے بات کرتا ہوں..... تاکہ منیبہ اور لڑکوں کے لیے ان سب کے دلوں میں جگہ بنائی جائے۔“

”کچھ بھی کریں بھائی، مگر منیبہ اور میرے بیٹوں کو گھرنے آئیں۔ سارہ اور عمارہ سے مجھے کوئی خطرہ نہیں مگر ادا.... زارا آسانی سے یہ حقیقت تسلیم نہیں کرنے گی۔ بہت خندی اور سخت لڑکی ہے۔“

بڑے سے بڑے فرعون پر بھی جب مشکل آتی ہے تو..... وہ اپنی غلطی تسلیم کرتا چلا جاتا ہے..... ہر چند کہ ساجد ابنی غلطی تو تسلیم نہیں کر رہے تھے کیونکہ نکاح خانی ان کا حق تھا۔ البتہ اس بات کو چھپانا وہ اپنی غلطی مان رہے تھے۔

”مجھے بھی زار اسی سے ڈر ہے۔ وہ بہت ہنگامہ کرے گی۔ خیر اللہ مالک ہے۔ سب سے پہلے میں اسماء سے بات کرتا ہوں..... ہم اپنی بیگمات کو اہمیت دینے سے باز رہیں۔ وہ ہماری اچھی مشیر اور ساتھی ہیں۔“

☆ ☆ ☆  
 "یا اے اللہ! اللہ آج تو بی بی بالکل سیٹ ہے۔" ثمنہ کا بی بی چمک کر کے زارا اسٹیتھو اسکوب

”اے ایک میں رکھو اور مسکرا کر ماں کو دیکھا جو آج خاصی فریش لگ رہی تھیں۔“

”اے امی! اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو مل بھی جاتا۔ اب کسا کسا جائے۔ دے لے امی دعا کر س میرا نام کسی

”آجائے گا انشاء اللہ! سب سے اچھی سب سے فرماں بردار بنی ہو۔ کبھی نہ کبھی تو مجھے لگتا ہے یا میں اس کے سببیکٹ کے ڈپارٹمنٹ میں آجائے تو بہت اچھا ہوگا۔“

”اچھے! ان شاء اللہ! سب سے اچھی سب سے قرباں برادر بی بی جوہرہ بی بی کو بھٹکے لٹکا ہے یا نہیں۔“  
 ”یہ کہہ کر خمیہ بڑا کھل کے نہیں تو زارا ماں کو دھکتی رہی۔“  
 ”نیکو! اللہ کرے کہ تمہارا نصیب میرے جیسا نہ ہو۔“  
 ”نہیں! اللہ کرے کہ نہ دالا عزت نہ دے دالا..... محنت کر کے نہ

والا دھرم ہے..... اور..... اور.....“ غمینہ کے اندر جیسے سارے دکھ چھینے لگے۔ نفرت، بے عزتی، ناقد ری کون

ہو ان سے تھا وہیں لگائے تھے ان کے سوہرے ان کے دل خیز پر۔ مہینہ کی انھیں بھیک میں۔ یہی نے مارے آنسو اپنے آئین میں تارے سمجھ کر سمیٹ لیے۔

سعدیہ خود سید کی طرح گہرے سانولے رنگ کی قبول صورت لڑکی تھی، بد نصیبی سے پاؤں میں ہلکا سا زخم بھی تھا۔ اتنی معمولی شکل اور اس معذوری پر وہ بے حد پیارے اور محبت کرنے والے دل کی مالک بھی تھی اور اس دا

میں وہ ایک گفٹا کم دو اکل کر چلی تھی ..... اور اپنے کالج کے دل میں رہے اس محبت کے شوق میں کہ وہ دوستی تھا  
سے رہتی کہ سانس بھی احتیاط سے لیتی جبکہ حادثہ ابھی والدہ کی طرح بہت خوب صورت تھی، شوق اور فن

بھی..... وہ گھر کی چھوٹی سی سب سے بڑی اس کے باوجود غائب تھے اور وہ اپنا حق سمجھ کر اٹھوا بیٹھی تھی کہ اپنی ذرا سی

تھا۔ جس کے ساتھ رہتا ضرور تھا مگر ہاہوں کو اس کی حیثیت کے ساتھ رکھتا، جبکہ ہاہوں اکثر اپنے پاس موج

تھا۔ چلے سرمد کرنا پھر ناصر دھارمہاویں والوں کی بیعت سے ساجھ کرنا، بیجا، بول، سر اپنے پاس لا داری کے کارڈ کو استعمال کرتا۔ تو حساس دل سرمد اور سعدیہ تڑپ جاتے۔ سعدیہ کی زندگی کا محور صرف ہمایوں تھا۔ اگر، اگر محبت، اگر، اگر طلب، اس کا حصول بھی اس کی دعا تھا۔ اور ہمایوں کے دلی میں کیا تھا۔ سوائے اللہ

”اور حالہ! اتنا ارادہ بٹور کسار ما۔“ ار مغالہ سرمد کا صرف وہ ست تھا اس لیے بوجھ رہا تھا۔

”ہاں، اچھا تھا۔ لیکن ایک گڑبڑ ہو گئی یار سرد۔“

”کہا تھا ناں تم سے یار ساجد کے ہوش ناخن لو۔ جذباتی فیصلے انسان کی عقل کو بہا کر لے جاتے ہیں اور ہمیں بالکل ناخوش و غم کرتے ہیں۔“

میں ان کا حصارہ بھلنا پڑتا ہے۔ دو سیدیوں نے سوار نوئی کنارے بٹھے ہیں دیکھا۔ حرم۔ مگر پر اس دھت کا ایسا بھوت سوار تھا کہ نئی نیلی دلہن پر.....“

ساجد فطری طور پر بہت خود پرست اور صمدی انسان ہے۔ جو کنایوں سماجیادہ سرور ہے۔ خود کو کہ اپنی خواہش کے سامنے ہر رشتہ ہر مصلحت دم توڑ دیتی اور آج اگر وہ کسی مشکل میں تھے تو یہ ان ہی کے فیصلے کے تحت آگے بڑھتا کہ کسی کا محض منہ سمجھتے تھے۔

”بھائی جان! یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئے ہیں میں اپنے کسی فیصلے پر نہ تو نام ہوں نہ شرمندہ..... دوسرے

شادی میرا حق تھا..... اور حق کو حاصل کرنا گناہ نہیں..... سب جانتے تھے کہ مکینہ مجھے ہرگز پسند نہیں کر سکتی۔  
 زبردستی جذباتی دیاؤں میں لا کر، اس بیمار کو میری زندگی کا عذاب بنا کر، میرے گلے میں باندھ دیا گیا اور.....

اس نے کیا دیا مجھے تین عدد بیلیاں جبکہ منیبہ میرے تین بیٹوں کی ماں ہے۔ میرے بیٹے میری پہچان ہیں۔  
نسل کا جتنا چراغ ہیں۔“

بن کر شامل ہو گئی تھیں۔ عابد چپ چاپ ان کی باتوں کے تناظر میں سوچ رہے تھے کہ اب وہ اپنے اس

بھائی کو کیا مشورہ دیں۔  
 ”تو! اب کیا پرالتم ہے۔“ عابد نے کافی کامپ لے کر مگ میز پر رکھا تو ساجد جن کے چہرے پر بہت

”بتایا تو ہے بھائی جان کہ میرے بیٹے اب اپنی پہچان چاہتے ہیں خصوصاً مرغان مجھ سے ناراض باتوں اور حقائق کی گئی اور الجھاؤ تھا۔“

ہے۔“ ساجد نے پریشانی میں پھر سگریٹ سٹکا لیا۔  
”تمہیں یاد ہو گا ساجد۔ یہ وہ خاتون ہیں جن سے میں نے تمہیں اس وقت آگاہ کرویا تھا مگر اس وقت

”امی جی! عازرہ باجی ناں مجھے بڑی پسند ہیں آپ ناں اس بار ان کو اپنے پاجی کے لیے مانگ لیں، اماں“

”نہیں امی جی! مجھے ناں زیب بڑی پسند ہے۔ میری ہم عمر بھی ہے اور راج کے سوتلی دی، آپ ناں اماں جی سے بات کرنا۔“ دونوں بہنیں بڑے چاؤ اور امانوں سے اپنے اکلوتے بھائی کے لیے اپنے ماموں کی بیٹیاں پسند کر رہی تھیں۔ ماں اور باپ پیار سے باتیں سن رہے تھے۔ حقہ پیتے ہوئے اکبر صاحب نے بیٹیوں کو دیکھا۔

”او کڑیوں اپنی اپنی بولی بولے جا رہی ہو..... او اپنے پاجی سے بھی اس کی پسند پوچھ لیتا۔“

”پاجی کی پسند۔“ باپ کی بات پر غزین دھیرے سے ہنسا اور باہر نکل گیا۔ باہر ڈیرے پر اس کے یار دوست اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

”آپ نے ہمیں یاد کیا اماں جان۔“ صابنے ماں کے کمرے میں موجود اپنی تین بہنوں کو ممتی خیز انداز میں دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں اس اجتماعی حاضری کی وجہ جانی۔ انہوں نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں لالچی کا اشارہ کر دیا۔ گلشن جہاں اپنے تخت پر بیٹھی پان لگا رہی تھیں نظر پر چند پان پر بھی پروہ کھنچا چونکا کر چھالیہ کے ٹکڑے پر رہی تھیں۔ مگر وہ گاہے گاہے اپنی بیٹیوں کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

”یوں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال و جواب کرنے سے بہتر ہے۔ آپ ہم سے بات کرنا۔“ پوچھیں، ہم نے آپ چاروں کو کیوں بلایا ہے۔“

”تو آپ خود ہی بتا دیجئے ناں والدہ۔ آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے۔ وہاں باہر سب کہیں باہر جانے کا اشارہ ہے۔“

”مانگہ کو جلدی ہو رہی تھی۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

”ابا! نہ رہیں سب، ہم تو نہیں جا رہے۔“ نجانبے یہ فیصل صاحب خود کو کیا سمجھتے ہیں..... کہتے ہیں۔“

اور اس دوران جبکہ چاروں بہنیں ایک دوسرے کو راز فاش کرنے کی دھمکی دے رہی تھیں، گلشن جہاں کے باپ کا نون سے سب باتیں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ تب انہوں نے پھیلی پر رکھا پان جس پر انہوں نے پان نام لوازمات بھرے تھے۔ اب ان لوازمات کو سوسے کی شکل میں لپیٹ رہی تھیں پھر وہ سوسے انہوں نے

جب سے ہوش سنبھالا ہے اس گھر کی عورتوں کو، اس گھر کے مردوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا۔ میں نے نہیں دیکھا کسی مرد نے بحیثیت شوہر اپنی بیوی کو عزت دی ہو یا اس کی قدر کی ہو..... اور اس معاملے میں ہمارے ابا باپ آف دی لسٹ ہیں۔ اس لیے اللہ کرے کہ کم از کم اللہ نے میرا یہاں نصیب نہ لکھا ہو۔“

یہ کہہ کر زارا کب کی جا چکی تھی اور شمیمہ تیز ہوئی سانسوں کے ساتھ اس سوچ میں تھیں کہ زارا ایسا کیسے سوچ بھی سکتی ہے۔ اس کا باپ تو..... تو مادہ گے گا اس کو..... مگر میری بچی تمہارا باپ ہی کا معاملہ ہوتا تو میں تمہارا ساتھ دیتی مگر..... مگر میں کیا کروں..... فہد کا کیا بنے گا۔ وہ، وہ تو تمہیں بے حد چاہتا ہے۔ وہ تو تمہارے بغیر ایک سانس بھی لینا نہیں چاہتا۔ وہ تو وہ پھول ہے۔ جس کی خوشبو تم ہو زارا..... ایسا نہ کرنا فہد کو نہ مارنا..... فہد تمہارے ہاتھ سے بن جائے گا..... یا اللہ تو سب جانتا ہے۔ رحم فرما نا۔

☆☆☆

”جی..... جی سفیر بھیا۔“ شمعون نے پلٹ کر جو دیکھا تو سفیر میاں اپنا کمر درسا سینہ بھلائے شمعون کو اپنی ہمشیرگان کو تنگ کرنے کی سزا میں گھور رہے تھے۔ شمعون نے ردحیل کو آنکھ مار کر ڈرنے اور گھبرانے کی ایک کھانسی کی۔

”جی سفیر کہیں ناں ہم سے کوئی خطا، کوئی قصور سرزد ہو گیا ہے کیا؟“

”ارے آپ مسلسل ہماری ہمشیرگان کو تنگ کیے جا رہے ہیں اور سے قصور اور خطا پوچھ رہے ہیں اور.....“

اور..... اس کے ساتھ ہی سفیر نے کھانا شروع کر دیا تو ردحیل نے آگے بڑھ کر سفیر کا سینہ مسنا شروع کر دیا۔

”دھیرج..... دھیرج سفیر بھیا آپ کی ہوگی ناں طبیعت خراب، غصہ سے..... ڈاکٹر نے آپ کو پرہیز بتایا ہے، بھول گئے۔ ابھی دم مسافر ہو جاتا تو ان چار عدد خوب ناک مطلب.....“

”ردحیل بھیا! آپ ہمارے بھائی جان کا مذاق کیسے اڑا سکتے ہیں۔“

”جیسے اڑا رہے ہیں..... وہ..... وہ ہمارا مطلب ہے آپ کے..... بھائی جان کوئی پتنگ ہیں کہ..... اڑائیں گے..... ان کی محبت میں کہہ ڈالا ہے..... عا کتہ آ پا۔“

”عا کتہ نہیں عا کتہ! اور یہ ہمیں آپ جی کس حساب میں کہتے ہیں ہم فقط آپ سے ڈیرہ باہر بڑے ہیں۔“

عا کتہ نے شاہی سپاری کا ٹیکٹ دانٹوں سے کھولا اور منہ میں اچھال دیا تو شمعون نے آنکھیں بند کر لیں۔

”اف! عا کتہ آ پا آپ کی یہ حرکت ماری تو ڈالے گی ہمیں۔ ارے پڑیا کھول کر اندر جھانک لیا کیجیے کیا چاٹا میں چو ہے کی چھوٹی چھوٹی وہ ہوں۔ وہ ہی..... جن کو..... وہ کہتے ہیں۔ وہ ہی۔“ شمعون نے ردحیل کو دیکھا۔

”وہ..... وہ ہی ناں..... اف۔“ ردحیل نے گھن زدہ منہ بنایا۔ تو عا کتہ نے منہ میں بھر پان سالسا پھیلی۔

انڈیلا اور باقاعدہ انگلی سے ٹوٹنے لگی۔ باقی سب تو جا چکے تھے۔ سفیر سمیت صبا اور عا کتہ تقریباً اپنے ہم عمر شمعون اور ردحیل سے الجھے کھڑی تھیں۔

”جھوٹ بک رہے ہیں آپ۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔“

”لیجیے! ردحیل میاں، اور سینیے۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ ارے وہ کوئی پڑا رہتا منہ میں گھل گھلا گیا ہوگا۔ اب معدے میں شفٹ ہو گیا ہوگا۔ خیر ہمیں کیا۔ آپ کا معدہ جانے اور وہ جانے۔“

”ہائے! صبا اب ہم کیا کریں۔“ عا کتہ کو ٹکڑے آن گھیرا۔

”ٹھنڈا پانی پی مریں۔ وہ..... وہ ہمارا مطلب ہے۔“

”اف! عا کتہ خاتون آپ بھی ناں ان مسخر دل کی باتوں میں آ جاتی ہیں؟ ایسی کوئی بات نہیں۔“

☆☆☆

”مکانی جی! اے دیکھو میری بیٹیوں نے دن رات لگا کے تمہارے کپڑوں پر کڑھائی کی ہے دیکھ لو۔“ پتو دھوہن نے بڑی سی گھڑی لاکر میزہ کے سامنے بھول دی جس میں ریشمی سوئی جیتی کپڑے تھے جن پر پتو کی ہنر مند بیٹیوں نے دھاگوں کی قوس و فوخ بکھیر دی تھی۔

”میزہ خوشی سے شرٹ پیس اور دوپٹے اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔“

”ہائے پتو! قسم سے تیری بیٹیاں بڑی ہنر مند ہیں۔ واقعی بہت اچھا نقش کام کیا ہے۔“ تعریف سن کر پتو کا خون بڑھ رہا تھا۔

”ہنر تو بہت ہے مکانی جی، پر نصیب ہی خراب ہیں۔ ایک بیوہ ہوگئی ایک طلاق نلے کے آگئی ہے تیسری کا رشتہ بھی نہیں ہو رہا۔ اب میں ہی ان کی سب کچھ ہوں۔“

”احوال زندگی سناتے سناتے ماسی پتو رونے لگی۔ دوسروں کو اچھے کپڑے سجا کر رنگوں کی دھنک اڑانے والی پتو کا دوپٹا پھٹا ہوا تھا۔ میزہ اداس ہوگئی اور اپنے بیک سے پیچے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔“

”دل! اچھوٹا نہیں کرو پتو، اللہ ہے ناں سب کا مالک۔“

”رب تو تمہارا ڈیرہ آباد رکھے۔ جی سدا سخی رکھے۔ آمین۔“ پتو دعائیں دیتی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شاہی تابی آگئیں۔ کپڑوں کو دیکھ کر گویا ان کی آنکھیں پھیل گئیں ایک ایک کپڑا اٹھا کر دیکھنے لگیں۔

”ہائے امی جی! ایسے سو بنے کپڑے۔“

”خبردار۔۔۔ کڑیوں بے کسی۔ ایناں کپڑے آں تے میلی نظر پائی۔“

”تو اماں جی تسی دی حد کر دے او، اسی تو بڑی پاکیزہ نظراں نال دیکھ رہے آں۔۔۔ یہ نہ تو میں نے لینا ہے۔ امی جی۔“ شاہی نے نفیس سے ششوں کا۔۔۔ ہم رنگ دھاگوں اور موتیوں سے سجادو پٹا خود پر پھیلایا تو میزہ نے جھٹ گھٹ کر تہ کر دیا۔

”آ کھیا سی ناں کراے سارے کپڑے میریاں پتیاں لئی نے۔۔۔ تو اوڈے لے لئی نہیں۔“

”اوں! او! اچھا اچھا۔“ شاہی سب سے چھوٹی تھی تھوڑی سی ضد کے بعد مان گئی اسی وقت غزین اور امی بھی آگئے۔ کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھ کر دونوں ہنس پڑے۔

”او اماں جی! اے کی اے۔“ غزین نے مسکراتے ہوئے پھیلے ہوئے رنگ برنگے کپڑوں کو دیکھا۔

”ہائے پتر۔ اے سارے کپڑے تیر ہاں کراچی والی بہناں دے نے۔“

”لو ہوور سنو یعنی کہ کراچی شہر دیاں کالج یونیورسٹی دج پڑھن والیاں لڑکیاں اے پینڈ و کپڑے پان گئیاں۔۔۔ پتر جی تو اوڈی ماں جی ناں بس۔“ اکبر نے بھی مذاق اڑایا۔۔۔ تو کچھ دہم میں میزہ بھی پڑ گئیں کہ پہلے جب وہ بچوں کے کپڑے بیچا پالے جایا کرتی تھیں اس وقت بچیاں چھوٹی تھیں اب ہو سکتا ان کو پسند نہ آئیں۔

”اچھا! جی نہ پسند آئیں گے تو اپنے نوکر کوں کو دے دیں گی۔ پھر میں تو خالی ہاتھ نہیں جاسکتی ناں۔“

کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے میزہ نے اپنا خوف اور دہم بھی لپیٹ دیا۔

”او ایسی دی کوئی بات نہیں ہے امی جی۔ آج کل تو کڑھائیوں کا بڑا فیشن ہے۔ وہ ہی آپ کے دور کی کڑھائیاں گولے کنارے والے کپڑے آ رہے ہیں۔ وہ عازرہ ہے ناں وہ مجھے فون پر بھی بتاتی رہتی ہے اور تصویریں بھی سینڈ کرتی ہے۔“ تابندہ ساری تفصیل بتا رہی تھی۔

”عازرہ۔۔۔!“ غزین کے خیالوں میں ایک سنہری سی رنگت والی کولہ سی لڑکی ابھری جو اکثر اسے ڈونگ میسر کیا کرتی، وہ پڑھتا مسکراتا اور ڈیلیٹ کر دیتا۔ اس وقت بھی وہ اس کے نام پر مسکرایا اور اٹھ گیا۔ ڈیوٹھی کی طرف بڑھتے ہوئے تابی کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”کال میں دانٹوں کی اوٹ میں رکھا۔ پان دان بند کیا انگلیوں پر لگا کھتا چوتا۔۔۔ اپنی لمبی سی نوک دار زبان پانا اور یہ تمام کارروائی انہوں نے انتہائی سکون اور اطمینان کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے کی۔ پان

”ایک طرف گاؤں کی اوٹ میں رکھ کر انہوں نے اپنی صاحب زادیوں کو کچھ ایسی ہیسی نظریں سے دیکھا کہ

”ہی۔۔۔ سب خود میں سٹ گئیں۔ ڈھیلی چوٹی کے بل جو کسی کزن کو دیکھ کر کھل گئے تھے، کس لیے گئے۔ کرلی ہالوں

”لی آ زائوں کو کان کے پیچھے چھپے رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔ سر سے اترادو پٹا تابعداری سے سر پر آ گیا۔ یہ تو ان جہاں کی ایک عیسائی نظر کا کمال تھا۔ ابھی زبان کے جوہر ٹھٹھکے تو نامعلوم دختران کا کیا حال ہو۔“

”ہوں! تو اگر آپ لوگ اب اپنے اپنے راز فاش کرنے سے فارغ ہوگئی ہوں تو ہم بھی وہ کہہ دیں جس لیے ہم نے آپ لوگوں کو یہاں تشریف آوری کی زحمت دی ہے۔“

”سرور مگر تیکھا لہجہ۔۔۔ تہذیب اور سلیقہ کا جامہ پہنے بجز کی طرح آ رہا رہتے الفاظ پر چاروں نے ایک

”جی والدہ۔۔۔!“ شفق نے جھٹ آگے بڑھ کر والدہ کا فرشی غرارہ فرش سے اٹھا کر تخت پر رکھا۔

”کیسے ناں اماں جان۔۔۔!“ مہک نے آگے بڑھ کر والدہ کے منہ کے اطراف سے بہتی پیک کو اپنے

”ہم منتظر ہیں۔ اماں جان۔“ مہا نے ماں کے پاؤں اپنی گود میں رکھ کر وہاں شروع کر دیے، سب سے چھوٹی

”مانک نے دیکھا کہ اس کی چالاک بہنوں نے والدہ کو اپنے حصار میں لے کر مورچے سنبھال لیے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔

”مانک کو چاہیے کہ اس کے لیے کوئی میدان خالی نہ ملا تو وہ جھٹ آگے بڑھیں والدہ کے سر پر سے بھاری کام والا

”بنا کر لایا اور جویں تلاش کرنے لگیں تو کشن جہاں نے جھٹکے سے اپنا سر پیچھے کیا۔

”کیا کر رہی ہیں آپ عاتکہ جہاں۔۔۔“

”وہ۔۔۔ والدہ ہم نے سوچا ہم آپ کی جو کس ہی نکال دیں۔ رکیے ہم تلاش کرتے ہیں۔ یہ آج کل کی

”ہیں بھی بڑی چالاک ہوگئی ہیں، چھپ جاتی ہیں۔“ اور کھوں میں عاتکہ نے والدہ کے بال بکھیر دیے مگر جوں نہ لی۔

”البتہ والدہ کسی بھتیجی کا روپ ضرور اختیار کریں۔ اوپر سے بڑی بڑی آنکھوں سے چھوٹی ہونٹوں کے

”ہر رخ بہتی پیک۔۔۔ اف بالکل ہی تو بھوت لگ رہی تھیں۔ چاروں بہنیں اس پر متفق ہونے کے

”پاپا۔۔۔ اپنے کام میں مصروف نظر آئیں۔ جبکہ عاتکہ تن تہا والدہ کی تیز وار نظریں زد میں تھیں۔

”مانا۔۔۔ مانا تو ان! جب آپ پیدا ہوئی تھیں تو ہم غریب صاحب کے سامنے خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ہمیں

”ماری یہ بیٹی قتل۔ فارغ لگتی ہیں مگر وہ نہیں مانے مگر آپ تو اب گامے لگا ہے۔ اسی کا ثبوت بھی دیتی رہتی

”ہیں۔ ہم ہمیشہ کڑوا تیل استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے سر پر جو کس خود کشی کرنے آئیں گی کیا۔“ کشن کی آواز

”تیز ہوئی، سب نے عاتکہ کو کھوڑا جو پشیمانی سے اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔

”آپ، آپ۔۔۔ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔۔۔ اماں جان آپ عاتکہ خاتون کا طبی معائنہ ضرور

”لےوائے۔“

”میں شفق آیا کی حمایت کرتی ہوں۔ والدہ۔“ مہک نے بھی عاتکہ کے خلاف حق دوث استعمال کیا تو صبا

”نے سوچا وہ اگر دوث نہیں ڈالیں گی تو ہو سکتا ان کا طبی معائنہ کرایا جائے۔“

”اماں جان۔ عاتکہ ابھی کم سن ہیں ابھی علاج شروع ہو جائے تو ہو سکتا ہے۔۔۔ ٹھیک ہوئی جائیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں صبا خاتون آپ کا علاج بھی ساتھ شروع ہو جائے کیونکہ ہمیں آپ دونوں کی عقل

”شدید تحفظات ہیں۔ خیر اس وقت میں نے آپ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بولنے کے لیے نہیں بلایا۔



بلکہ یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ آپ چاروں کی گمان میں مت رہیے گا۔ آپ لوگوں کی شادیاں ہم اس تیز بیر خاندان میں ہرگز نہیں کریں گے۔ تیز بیر کہتے ہوتے انہوں نے بے چاری چھالی کی پسلیاں ہی تو چباؤ لیں۔

”تیز بیر..... ہم سمجھتے نہیں والدہ۔“ چاروں کے ذہنوں میں ایک سوال ایک زبان ہو کر نکلا تو والدہ چڑچڑے ہوئے یہ کسی پیک اگال وان میں پھنسی۔

”جی ہاں..... یہ جو آپ لوگوں کی وادی حضور ہیں ناں ان کی وجہ سے ہمارا نوابی خون تیز بیر بن گیا۔ آپ لوگوں کے دادا نواب ابن نواب اور وادی..... آہ..... بد قسمتی ہے آپ کے دادا کو پنجاب کی جاہل اجڈ قسم کی خاتون شگفتہ بیگم جن کو آپ لوگوں کی زبان دادی جان..... دادی جان کہتے سوکتی ہے۔ ان کی وجہ سے ہمارا خاندان..... خیر ہماری تو قسمت پھوٹی تھی جو اس خاندان میں شادی ہوگئی مگر ہم آپ لوگوں کی شادی یہاں نہیں ہونے دیں گے اور نہ ہی آپ لوگوں کی قسمت پھوٹنے دیں گے۔“

”پھوٹنے دیجیے والدہ۔ وہ..... وہ ہمارا مطلب ہے۔ پھر ہماری قسمت کس دیوار سے پھوڑے گا۔“

کہا تو صرف شفق ہی نے تھا مگر ترجمانی سب کے جذبات اور خیال کی ہوگئی تھی۔ اس لیے ہنسی خشکی بنائے والدہ کے جواب کے لیے ان کو دیکھتی رہیں جو کوشش تو کر رہی تھیں ہونٹوں کے کناروں سے پیک کا بہاؤ روک سکیں مگر کامیاب نہیں ہو پا رہی تھیں۔

”ہاں خوب کہا آپ نے، کہ آپ لوگوں کی قسمت کہاں پھوڑیں۔ ارے ہم آپ کی اکلوتی والدہ محترمہ ہیں آپ لوگوں کے بھلے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ چاروں کے نکاح ہم اپنے بھانجوں اور بیٹیوں سے کریں گے۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ لوگ معاشی طور پر بہت زیادہ مستحکم نہیں مگر ہیں تو نواب ابن نواب۔“ اس اعلان پر چاروں کی چاروں سلگ اٹھیں۔

”والدہ! ہمارے نبھائی لڑکے صرف معاشی طور پر ہی نہیں ذہنی اور جسمانی طور پر بھی غیر مستحکم ہیں۔ دیکھ زوہ چھڑی کی مانند۔“

”واہ! مہک شاید پہلی بار اچھی بات نکلی منہ سے..... شاید غلطی سے۔“ شفق کے کیلے لہجے میں کی گئی تعریف۔

پر مہک سلگ اٹھی۔

”خاطر جمع رکھیے شفق! آپ سے تو آج تک ایسی غلطی سر زوہ ہوئی ہی نہیں۔ ہمیں باتیں ہناتی ہیں۔“

شفق اور مہک آپس میں الجھ پڑی تھیں۔

”اوہو! پاؤں..... یہ کیا آپ لوگ آپس میں الجھ پڑیں۔ ان دیمک زوہ چھڑی کو توڑنا ابھی باقی ہے۔“

صبا اور عائشہ نے بڑی بہنوں کو کھورا۔ گلشن جہاں نے ٹینک کی ادٹ سے اپنی صاحب زادیوں کو کھورا۔ دیکھتی تھیں ان سب کو، ان کی بات بری لگتی ہے۔ مگر وہ اپنی بات منوانا اچھی طرح جانتی تھیں۔

”آپ لوگ کچھ بھی نہیں سوچیں، ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ آپ سب کی شادیاں ہمارے نیسے میں ہوں گی۔ اس لیے اپنے دوھیائی تایا زاد بچہ پیو زاد بھائیوں کو بھول جائے۔“

”مشکل ہے.....! چاروں نے دھنی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ہمیں نے جو کہنا تھا..... کہہ چکے، لہذا اپنے دوھیائی رشتے کے بھائیوں سے دور رہیے۔“

”مشکل ہے.....“ پھر چاروں صندے کے اس صفحہ پر یکجا ہوئیں۔

”عائشہ! آپ جائے اور گھر کی تمام خواتین مطلب اپنی بہنوں کے لیے۔ دھاگے سوئی اور اپنا اپنا فرائض لے کر ہال کمرے میں آجا۔ میں، آج ہم آپ سب کو امور خانہ داری کے ساتھ ایک نیا نکاح بھی..... متعارف کروائیں گے۔“

”ہمارے دلوں کو تار تار کر کے والدہ ہمیں نیا نکاح متعارف کروائیں گی۔“ عائشہ افسردہ سی باہر آئی تو گھر لڑکے باہر کرکٹ کھیلنے جا رہے تھے۔ سب نے باجماعت اسے دیکھا۔ شمعون نے ہارون کو ہوکا مارا۔

”کیا ہوا۔“ ہارون آگے بڑھا۔

”بالکل خیریت ہے۔ اماں جان نے آپ سب کو بتانا تھا کہ..... کہ آپ سب ہال کمرے میں جمع ہو جائیں۔“

عائشہ کی ذہنی حالت کچھ بڑبڑہور ہی تھی والدہ کی باتوں سے، اس نے جومنہ میں آیا بول گئی۔ گھر کی لڑکیوں کا پیغام گھر کے لڑکوں کو سنا دیا۔ شمعون ہارون اور فیصل روپا کی شکل بنا کر بولے۔

فاتحہ خوانی کس کی ہے، شفق آپا کی مہک آپا کی صبا کی..... یا پھر تمہاری!“

اس بات پر عائشہ شمعون کو گھورتی ہوئی۔

”جس طرح آپ لوگ ہماری ناقدری کرتے ہیں..... اسے دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہمیں والدہ کی بات مان لینی چاہیے۔ وہاں کم از کم ہماری قدر تو ہوگی۔“

☆☆☆

عمارہ حسب عادت لیٹنے ہی خراٹے لینے لگی تھی، زارا اسٹڈی ٹیبل پر کوئی آرٹیکل لکھ رہی تھی۔ وہ فری لانس رائٹر تھی وہ جن ایڈیٹور پر بھرتی ہونا چاہیے تو وہ قلم کاغذ سنبھال کر بیٹھ جاتی اور اپنی سوچ کو الفاظ میں ڈھال کر کاغذ پر اتارنی چلی جاتی۔ وہ منفرد سوچ رکھتی تھی، ایسا نہیں تھا کہ وہ خود غور سے ہے تو عورت کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے وہ سوچ کی عدالت میں کھڑی ہو کر عورت کے حق میں دلائل دے۔ بلکہ اس کے نزدیک زیادتی..... زیادتی تھی نواز زیادتی کے نشانے پر عورت ہوتی یا مرد، وہ اپنی سوچ لفظوں میں ڈھال کر کاغذ پر اتارتی اور مختلف اخبارات یا رسائل میں چھپنے کے لیے بھیج دیتی۔ اس کی یہ بات فہم کو بہت پسند تھی وہ جان کر دانستہ طور پر اس کی تحریر ڈھونڈ کر پڑھتا پھر سوالات کرتا۔ شفیق تو زارا جواب دیتی کبھی فہم کے سوال اسے چونکا دیتے تو کبھی فہم اس کے خیالات کی پیش میں حدت محسوس کرنے لگتا، ہرٹ ہو جاتا۔ اس کے مردوں کے بارے میں خیالات پڑھ کر۔

”یارسائی! خالہ! تمہاری یہ بقراط قسم کی بیٹی کو ہم مردوں سے نفرت کیوں ہے.....؟“

وہ کوئی ایسا آرٹیکل پڑھتا جس میں زارا نے مردوں کے خلاف لکھا ہوتا..... تو وہ سیدھا شمیمہ کے پاس آ جاتا۔ وہ معصوم شکل بنائے اتنے پیار سے کہتا کہ شمیمہ اسے پیار کر لیتی۔

”میرے شہزادے یہ بات تو تم نفرت کرنے والی ہے پوچھو ناں، کیوں کرتی ہے وہ مردوں سے نفرت۔“

اور پھر وہ فرماں بردار بچوں کی طرح اخبار ہاتھ میں لیے زارا کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا وال دہراتا تو زارا گہرا سانس لے کر اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھتی۔

”میں سب مردوں سے نفرت نہیں کرتی۔ میں صرف ان مردوں سے نفرت کرتی ہوں۔ جو عورت کو خصوصاً اپنی بیویوں کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔“

”ہاں تو وہ اسی لائق ہوں گی تو ان کے شوہران کو سمجھتے ہوں گے ناں پاؤں کی جوتی..... اس میں ایسا کیا..... ہے۔“

”اچھا تو میری مسکین ماں اور تمہاری سمجھ دار ماں اس قابل ہیں۔ اس لائق ہیں کہ میرے ابا تمہارے ابا، ان کے شوہر حضرات ان کو بات بے بات ماحول لوگ دیکھے بغیر ڈھیل و خوار کریں۔ ہاں بتاؤ میری اور تمہاری ماں کی بات کی حق وار ہیں کیا۔“ بولو.....“ زارا نے دلائل دیے تو پل بھر کو فہم چپ ہو گیا۔

”بہن! یہ تو وہ بھی سوچتا کہ اس کی سائی خالہ اور ماں اتنی اچھی ہیں پھر ان کے ابا حضرات ان کو ذلیل کیوں کہتا ہے۔“

کرتے ہیں پھر اندر رگوں میں دوڑتا خون..... باپ اور تایا کو درست قرار دے دیتا کہ ہو سکتا ان کی ماس اور خالہ میں ہو کوئی بات ایسی کہ ان کو ڈانٹ پڑتی ہے۔

”کس سوچ میں ہو۔ بتاؤ ناں امی اور اسماء خالہ میں ایسی کون سی خامیاں ہیں جو اب اور تایا جان ان معصوم عورتوں کو زلیل کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے ہیں، تنہائی میں ہیں یا محفل میں..... اپنی مردانگی کے قدموں تلے زرد ڈالتے ہیں ان کی عزت کو..... انا کو..... ایسے مردوں سے نفرت ہے مجھے..... جو عورتوں کی عزت نہیں کرتے احترام نہیں کرتے اور کم و بیش تم اور سعد بھائی بھی ایسے ہی ہو، ابابا اور تایا جیسے۔“

”تو!“ فہد کی انا پر چوٹ پڑی تو وہ بھی ڈھٹائی سے بولا تو زارا اسلگ گئی۔ اس نے اپنے آرنیکل والا اخبار بک شلف پر رکھا پھر اس کی طرف بولی۔

”اوکے جاؤ یہاں سے اور تنہا تم نہیں جانتے تم نے میری کتنی بڑی الجھن دور کر دی۔ چھینک پوسوچ۔“

”پانی!“ وہ جانے کب تک خیالوں میں گم رہتی کہ عمارہ نے نیند میں پانی کہا تو اس نے چونک کر عمارہ کو دیکھا گلاس میں پانی ڈالا اور اس کا شانہ ہلا کر اسے پانی دیا۔

”شکر یہ زارا آئی..... بڑی پیاس لگی تھی۔“ عمارہ منون ہوئی۔

”تمہیں تب پیاس نہیں لگتی..... چلو سو جاؤ اب یہ آپیاں کہاں گئیں۔“ عمارہ تو دوبارہ خراٹوں میں الجھ گئی تھی زارا، سارہ کو دیکھتی باہر بالکونی میں آگئی جس کی گرل سے ٹیک لگائے سارہ کھڑی تھی۔ زارا نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ چپ اس کے شانے سے شانہ لگا کر کھڑی ہو گئی۔ سارہ نے پچکے سے آنسو اچھل چل میں جذب کر لیے۔

”وہ..... وہ آرنیکل کیلٹ ہو گیا تمہارا.....“ سارہ نے ہاتھ بڑھا کر آم کے پیڑ سے پتا تو زارا جو حن میں لگا تھا اور ان کے کمرے کی بالکونی تک پہنچ گیا تھا۔

”نہیں۔ ابھی ادھر رہا ہے۔“ زارا گرل سے پشت لگا کر سینے پر ہاتھ باندھ کر سارہ کو دیکھنے لگی۔

”کیوں؟“ سارہ اس سے کتر رہی تھی۔

”امی اور آپ کی وجہ سے..... خیر چھوڑیں بحث فضول ہے۔ دیے اگر میں ہوتی ناں تو اب جیسے سعد بھائی سے متکلی توڑ دیتی۔“

ہمیشہ کی بات زارا نے برملا دہرا دی تو سارہ کے اندر سے اک گہرا سانس گویا سانس کی نالی کو چیرتا ہوا باہر آیا۔

”لیکن میں تمہاری جگہ پر نہیں اور تم میری جگہ پر نہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ تمہیں بھی تسلیم کی خو ڈال لینی چاہیے۔“

”اس لیے کہ یہ ستم گرا اپنی وضع نہیں بدلیں گے۔“

”ہاں!“ سارہ بلا وجہ ہی چوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہی تھی، زارا اب دیکھ رہی تھی۔

”آپ تو امی کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہیں آئی! لیکن شاید میں ستم کی اس داستان کا مظلوم کردار نہ بن سکوں۔ نا حکمن ہے۔“ زارا نے گہرا سانس گہری رات کی خاموش خاموش فضا میں لیا اور اپنے کمرے کی تین سیڑھیاں چڑھنے کے لیے پہلے اسٹیپ پر قدم رکھا کہ سارہ کے جملے نے قدم روک دیے۔

”یہ جو محبت ہے ناں زارا بڑی سخت حکمران ہے۔ جب دل کے تخت پر بیٹھ کر جذبات کی دزارتوں کو اپنے کنٹرول میں لیتی ہے تو ناں..... بندہ اس حکمران کی غلامی میں آ کر سکون اور خوش محسوس کرتا۔ اس غلامی میں اسے زندگی کی خوشیاں نظر آتی ہیں۔“ پھر چاہے حکمران کوڑوں سے مارے یا.....“ سارہ کی بات ادھوری تھی کہ

زارا واپس بولی۔

”ممن! اس بابز“ تم کر ملر ان کی غلامی آپ کو میاں دے ہو۔ آئی..... میں یہ غلامی کسی صورت اختیار نہیں کرانی میں تو..... اور وقار کی نریدار ہوں۔ جو کم از کم اس گھر کے مردوں کے پاس تو ہے نہیں اپنی بیویوں کو..... لے لے لے..... امی جان..... امی جان بھی اب اتنے محبت کی سزا بھگت رہی ہیں۔ ناؤ دیو رٹن۔ شب بخیر۔“

زارا جا کر شاید سو بھی چلی تھی۔ سارہ وہیں کھڑی تھی اور اس بار وہ اپنے نہیں زارا کے بارے میں سوچ رہی تھی یہ! اس نے اکثر ابابا کے منہ سے اس کے لیے باقی لڑکی سنا تھا۔

”یا اللہ! رحم فرما میں یہ لڑکی کیا سوچ رہی ہے..... کیا کر رہی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گھر کی ہر لڑکی کا نام۔ ب اللہ نے شاید اسی گھر کے لڑکوں کے ساتھ لکھے ہیں تو..... تو پھر کیسا احتجاج اور کیسی بغاوت۔ مگر..... مگر زارا یہ دونوں کام ضرور کرے گی۔ یا اللہ پھر کیا ہوگا تو ہی جانتا ہے۔“

☆☆☆

”گڈ..... دیر کی گڈ، رانی۔ یہ فرجا تو تمہارے در در کی ٹیم میں بہت ہی اچھا ایڈیشن ہے۔ آئی لایک اٹ، ہینڈم، گڈ لکنگ، ابجو کیڈ بہت اچھا ہے۔ اس کے بات کرنے کا انداز دھیمالہجہ تو بہت ہی امپر یو ہے۔“

رو بیکا کو فرجا دادانی بہت پسند آیا تھا۔ اور گرم گرم کافی پیتے وہ مسلسل اس کی تحریف کر رہی تھی۔

رانی نے آنکھ داں میں لکڑی..... رکھتے ہوئے..... منظر اکر اسے دیکھا۔

”شکر ہے میڈم! آپ کو میرا بھی کوئی فیصلہ پسند آیا۔ فرجا دادانی اس قابل ہے کہ اس پر ہم فل ٹرسٹ کر لے..... کام لے سکتے ہیں۔“ واپس اپنی جگہ پر آ کر رانی نے اپنا گناٹا اٹھایا۔

”ہوں۔“ رو بیکا نے پر خیال انداز میں ہوں کو کھینچا اور رانی کے ہاتھ سے کافی کا گگ لے کر مائیکرو ویو میں رکھا اور پندرہ سیکنڈ لگا کر باہر نکال کر دوبارہ شو ہو کر دیا تو وہ اس مہربانی پر ہنسا۔

”لگتا ہے تمہیں، فرجا دادانی بہت پسند آیا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں جو سوچ رہی ہوں شاید وہ سوچ ابھی تمہارے دماغ میں داخل نہیں ہوئی۔“

”نہیں۔ فرجا جیسے اچھے لڑکے کو دیکھ کر میرے دماغ میں بھی سوچوں نے سر ابھارنے شروع کر دیے ہیں۔ اپنی دسے تم بتاؤ کیا سوچا ہے۔“

”دیکھو! نجمہ! بیٹیوں کے لیے پاکستانی لڑکوں کے رشتے چاہ رہی ہے تو ہو سکتا ہے۔ فرجا دان ہی کی کسی بیٹی کا نصیب ہو۔“

اس بات پر رانی کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ اس نے تو فرجا کو دیکھتے ہی ٹٹی جیسی بد تمیز بیٹی کو فرجا جیسے مائیک، پڑھے لکھے پاکستانی شوہر کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ رو بیکا نے کیا کہہ دیا تھا۔ انور بھی اپنی لایوں کے لیے پریشان تھا اور فرجا، انور کو بھی بہت پسند آیا تھا۔

”ارے بھئی، وہ بچہ پاکستان سے اپنے مسائل حل کرنے کے لیے آیا ہے اور ہم خود غرضی سے اسے اپنے مناسب کے لیے استعمال کریں۔ مجھے یہ بات مطلقاً مناسب نہیں لگتی۔ ابھی اسے سیٹ ہونے دو..... انور اور نجمہ کی لایوں کے لیے ہم کوشش کرتے رہیں گے ابھی فی الحال فرجا کی رہائش کا پر اہم ہے۔ تم کہو تو اپنی انگلی سے دے

لاؤں کو جب وہ میٹل ہو جائے گا تو چلا جائے گا۔“

رانی کی بات پر رو بیکا کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

”وہ ٹھیک ہے۔ نیو ماسٹڈ کہہ دو اسے شفٹ ہو جائے۔“

اور یوں شاید شاہی کے اتنے سالوں میں پہلا معاملہ جوان دونوں کے درمیان طے پایا اور صلح اور اتفاق

ما، پایا گیا۔ مگر شاید وہ لوگ بھول گئے تھے کہ ان کی زندگی کے کھیل کا تیسرا فریق بھی ہے۔ جوان کی بیٹی ہے



# ست روگاہیوں



دونوں نے اسماء کو دیکھا پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔  
”ٹھک ہے پہلے تو آپ ہمیں اچھی سی گرین ٹی پلوائے پھر آپ سے کچھ باتیں شیئر کرنی ہیں۔“  
شاید جبلی بار عابد نے بڑے اچھے انداز میں بات کی ان سے کچھ شیئر کرنے کی عزت دی تو اسماء کھل اٹھیں۔  
”زے نعیب ابھی لیجئے۔“ اسماء تیزی سے پن کی طرف چلی گئیں۔ تانیہ اور ثانیہ سارہ کو چھیڑ رہی تھیں۔  
”آج نہیں تو کل اس گھر میں چاندی بھائی آپ نے کی۔“

”بھابھی میری بھابھی تم جیو ہزاروں سال۔“

یہ فہد تھا۔ اس نے خوشی سے سارہ کو گھما ڈالا۔ یہ لوگ بہت خوش تھے۔

”سچ عمارہ! کتنا مزا آئے گا ہم..... خوب شور مچانگے کریں گے۔“

”ہاں ہم ہر رسم کی کڑا کیم بنائیں گے۔ مہندی والے دن تو۔“ سارہ شرماے جا رہی تھی سعد بالکل عین

سامنے کھڑا سے ہی دیکھ رہا تھا۔

”بار سارہ بھابھی۔ کھونگھٹ نکالو..... یہ بندہ ناں آپ کو شادی سے پہلے ہی گھور گھور کر.....“ فہد نے

آگے بڑھ کر سارہ کا دوپٹا اس کے سامنے کھونگھٹ کی طرح نکال دیا۔

”ارے او جا چاندو..... میری کو چھوڑو..... اپنی ڈھونڈو کہاں ہے جو میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔“

”شرما گئی ہوگی پگلی۔ وہ کیا ہے ناں بڑی شرمیلی ہے ہماری دہن۔“

”جاؤ۔ دیکھو انکار ہی نہ کر دے..... ابا جان ہماری شادی پر تم دونوں کا نکاح کرنا چاہ رہے ہیں..... اور یہ

چچا جان کی خواہش ہے۔“

”ہائے نہیں..... سچ، کبہ رہے ہوتاں۔ ہائے مری نہ جاؤں شرم سے۔“ فہد نے ثانیہ کا آنچل خود پر

پھیلا لیا۔ تو سب ہنس پڑے۔

”ماشاء اللہ! اللہ تعالیٰ میرے بچوں کی خوشیوں کو دائم بنے۔“ شوہر اور دوہر کے لیے گرین ٹی لے جاتے

ہوئے انہوں نے ان سب کو دیکھا اور خوشی سے دعا دیتی چلی گئیں۔ لاؤنج میں آئیں تو دونوں بھائی سجدہ شکلیں

بنائے بیٹھے تھے۔

”خیریت تو ہے ناں سب۔“

”جواب نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں بھائیوں کو اسماء کو ہمراہ بنانا پڑا۔“

”کیا.....؟“

☆☆

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

## سروے کی مناسبت

ماڈل ..... مریج علی

میک اپ ..... ریز بیگم پالو

فوشن گرائی ..... موسیٰ وحسا

برآمدے میں رکھی جا پائی پر بیٹھے اسے کافی دیر گزر چکی تھی۔ گھنٹوں کے گرد بازو پیٹے جا پائی کی سطح پر انگلی پھیرتے ہوئے اس کا دل اور دماغ جزئیات کے بخونچال سے زلزلے کی کیفیت میں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس کی اماں واپس آئی تھیں اور انہوں نے جو خبر سنائی وہ غیر متوقع ہرگز نہیں تھی، مگر پھر بھی اس کا دل ٹوٹ گیا دوسری بات۔

وہ ایک مشرقی لڑکی تھی۔ جس کا رشتہ بچپن میں طے کر دیا گیا تھا۔ اسے سمجھایا گیا کہ حامد ہی اس کا ہونے والا شوہر ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو وہ کسی کو دیکھنے اور نہ ہی کسی کے بارے میں سوچے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ تایا کے انتقال کے وقت وہ سولہ سال کی تھی۔ ان کے اس دنیا سے جاتے ہی تایا نے اسے بوبانے سے انکار کر دیا۔ دونوں گھروں میں خوب ہنگامہ ہوا۔ حامد کے دل میں بھی وہی ہستی تھی۔ مگر تائی کو اتنے سالوں سے اپنے اندر چھپا کر رکھی نفرت کو اگلنے کا یہ سہرا موقوف ملا تھا، وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ دیو رانی، جھٹلی کی اکس کی نفرت میں پیتے ہوئے ان دونوں کا دل ٹوٹ کر دھول ہو گیا۔ اب بے حد اواں رہتے۔ انہیں اپنی بھر جانی سے کم از کم اس گھٹیا پن کی امید تو کبھی نہیں تھی۔ البتہ حامد روتے ہوئے ان کے پاس آیا تھا۔ مومنہ اسے صرف اس لیے پسند نہیں تھی کہ وہ ایک عرصہ اس کی منگیت کے درجے پر فائز رہی۔ وہ

کزن کی حیثیت سے بھی اسے بہت اچھی لگتی۔ اس کی عادات، سادگی، مزاج میں ٹھہراؤ اور میچورٹی نے اس کے ہر رنگ کو بڑا گرا کر دیا تھا، وہ اسے ہر طرف چھائی ہوئی محسوس ہوتی۔ مگر اب جیسے سب کچھ دھندلا چکا تھا۔ وہ اس کا عکس دھونڈتا رہتا، مگر ناکام ہو جاتا، اس نے اب اسے بات کی اپنی مجبوری بتائی کہ اگر وہ مومنہ سے شادی کے لیے ضد کرتا ہے تو اس کی اماں اسے دودھ نہ بجھنے کی دھمکی دیتی ہیں۔ اس کی آواز زاری پن کر رہا تھا۔ بھول گئی۔ مگر دل میں ایک تسلی ضرور تھی کہ وہ اسی ہی اس راہ کی مسافر نہیں تھی۔ دکھ تو اہل کو بھی تھا، ان کی پھول جیسی بیٹی دن بے دن کمزور ہوتی

جاری تھی۔ مگر بے عزتی کا احساس شدید اور وہ اسی احساس کو دل میں جگہ دے کر بیٹھی تھیں۔ حامد کو بے عزت کر کے گھر سے نکالا۔ اسے بھی کہہ دیا کہ وہ آج کے بعد حامد کو نہ سوچے۔ اس نے ان کی بات مان لی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

کچھ ہی ماہ بعد حامد کی شادی کا اٹھا شور۔ دونوں گھرانوں میں موت بنا تھا۔ کسی خوشی غمی میں شرکت یا دعوت کا سوال ہی ناپید۔ خاندان کے لوگوں نے اگر صلہ صفائی کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ حامد اب اسے ملنے آیا۔ دوبارہ معافی مانگی۔ انہیں زبردستی اپنے ساتھ نکاح میں لے کر گیا۔ فاطمہ بی بی نے خوب شور مچایا، مگر وہ بھیجے کے ساتھ چلے گئے۔ آتے مہینوں میں وہ اس حقیقت کو قبول کر چکی تھی اور یہ بات بھی سمجھ گئی کہ عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ ان دونوں کی شادی ہو بھی جاتی تو یہ محبت اور لگاؤ چند ماہ کا ہی مہمان ہوتا۔ تائی اپنا اصل رنگ دکھاتیں، وہ حامد سے شکایتیں کرتی، روتی، دھوتی گھر آتی۔ ایک فساد ایک ہنگامہ ہی بنا رہتا۔ اس لیے جو ہوتا ہے اچھے کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو بھی ضائع نہ کیا اور بالکل نارمل رہنے لگی۔ مومنہ کو پرسکون دیکھ کر فاطمہ کے بے چین دل کو بھی قرار آیا۔ ماں تھیں وہ اس کی۔ دل کے حال سے باخبر مگر مجبور اور بے بس۔

ابھی اس نے پونی ورشی میں داخلہ لیا ہی تھا کہ خاندان سے باہر رشتے آنا شروع ہو گئے۔ وہ ہڑوا گئی۔ مفتی ٹوٹنے کے بعد اس نے اگر حامد کو نہیں سوچا تھا تو کسی اور کو دل میں جگہ دینے کا خیال بھی اسے نہیں آیا۔ یہ سب اس کے لیے لیالہ الحال ناقابل قبول تھا، مگر فاطمہ کو جلدی بھی۔ حامد کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو چکا تھا اور ان کی بیٹی اب تک کسی سے منسوب بھی نہیں ہوئی تھی۔ فاطمہ کو لگتا کہ ان کی جھٹلی کے دل میں لٹو پھوٹے ہوں گے، مگر ان کے ٹھکانے کے بعد سے مومنہ اب تک ان چاہی ہے۔ فاطمہ چاہ کر بھی اس سوچ سے خود کو آزاد نہ کر سکتی تھیں۔ ساری عمر انہوں

میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جنہیں آپ کی تکلیف کا احساس نہیں، وہ میری تکلیف اور درد کو کیسے سمجھیں گے؟ اب اہریات سمجھتے تھے، ایک دنیاوی کیسی تھی۔ اس بات سے کیسے منہ پھیر سکتے تھے، لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ اب دوبارہ مومنہ کو رونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بیٹی اپنے گھر روئے یہ انہیں منظور تھا، مگر لوگوں کے طعنتوں اور باتوں کو برداشت کرنے کے لیے ماں باپ کے گھر بڑی رے سے قطعاً نا منظور۔ سو انہوں نے فیصلہ لیا، مگر مومنہ بھی اڑ گئی۔ فاطمہ بھی حاکم صاحب کی ہم نوا تھیں۔ مستقیم کے گھروالوں کی جانب سے دباؤ شدید تھا۔ شادی سرر تھی۔ ان کے ہاتھ بالکل خالی۔ وہ لوگ سادگی سے شادی کے بھی حق میں نہیں تھے۔ عجیب ذہنیت کے لوگ تھے۔ شادی سادگی سے کروائی تو ناک کٹ جائے گی۔ بو خالی ہاتھ آئے گی تو انہیں سو سوتے ملیں گے۔ دنیا کیا کتنی کیا نہیں، اس کی پروا تھی۔ اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کہ اس بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی جو اس حادثے کے بعد سے یہ مشکل اپنے پیروں پر چلتا ہے اور جوان بیٹی اس کے گھر پر موجود ہے۔ اس لفیل کے دل کی کما عالت ہوگی جس کی کمائی سے اس گھر کی ہر ضرورت پوری ہوئی تھی۔ وہ دو عورتیں جس کی ذمہ داری ہیں؟ وہ شرمندگی سے اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریزاں ہیں۔ اپنی ضروریات کا ذکر کرنے سے خوف زدہ جو باتیں سمجھنے کی تھیں، ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی، سوائے مومنہ کے۔ اس نے ایک کوشش کی۔ اپنے ہونے والے ہم سفر سے بات کی کوشش۔ کیا وہ اس کی بات مانے گا؟ کچھ سمجھے گا؟

کانتے ہاتھوں سے اسے کال ملا کر لرزتے ہونٹوں سے اپنی بات اس کے سامنے رکھی۔ اسے بتا دیا کہ اس کے والدین اپنے سر کی چھت بچ کر اسے مستقیم ٹائی مو، شوہر کی صورت دس گے۔ اپنے طور اس کا مستقبل محفوظ کر س گے، مگر اسے یہ سودا منظور نہیں۔ وہ سادگی سے اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ اگر اس کے گھر والے چاہتے ہیں کہ شادی ان کی منشا

مومنہ کی مرضی کے خلاف اس کا رشتہ طے کر دیا۔ مستقیم اس سے عمر میں آٹھ سال بڑا تھا۔ باہمی مشورے سے شادی ایک سال بعد کرانے کا فیصلہ کیا۔ نظام سب کچھ بہت اچھا تھا۔ اس نے جب چاہ مستقیم کو بھی قبول کر لیا اور مان لیا کہ وہی اس کا اہلیب ہے۔ مگر وہ اب تک زندگی کے ٹھن چکروں سے واقف نہیں ہوئی تھی۔ شادی سے ٹھن دواہ پہلے ہی اس کے ابا کا ایک سیمنٹ ہو گیا۔ علاج معالجے میں ساری جمع پونجی خرچ ہو گئی۔ جاب بھی ہاتھ سے گئی۔ اس کے سسرالی دی کی تاریخ کو کسی صورت میں بھی آنے کی تیاری نہیں تھی۔ ان کے بیٹے کی عمر اب زیادہ ہو گئی تھی، انہیں ہر صورت اسی تاریخ نو ہو کر لے جانی تھی۔ وہ خالی ہاتھ اسے کیسے رخصت کرے؟ حاکم صاحب نے گھر بیچنے کا سوچا۔ تب مومنہ نے اپنے لب کھولے۔

اب اپنا سب کچھ بیچ کر مجھے ایک ایسے لوگوں کے

میں کوئی دلچسپی نہیں۔ جنہیں آپ کی تکلیف کا احساس نہیں، وہ میری تکلیف اور درد کو کیسے سمجھیں گے؟ اب اہریات سمجھتے تھے، ایک دنیاوی کیسی تھی۔ اس بات سے کیسے منہ پھیر سکتے تھے، لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ اب دوبارہ مومنہ کو رونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ بیٹی اپنے گھر روئے یہ انہیں منظور تھا، مگر لوگوں کے طعنتوں اور باتوں کو برداشت کرنے کے لیے ماں باپ کے گھر بڑی رے سے قطعاً نا منظور۔ سو انہوں نے فیصلہ لیا، مگر مومنہ بھی اڑ گئی۔ فاطمہ بھی حاکم صاحب کی ہم نوا تھیں۔ مستقیم کے گھروالوں کی جانب سے دباؤ شدید تھا۔ شادی سرر تھی۔ ان کے ہاتھ بالکل خالی۔ وہ لوگ سادگی سے شادی کے بھی حق میں نہیں تھے۔ عجیب ذہنیت کے لوگ تھے۔ شادی سادگی سے کروائی تو ناک کٹ جائے گی۔ بو خالی ہاتھ آئے گی تو انہیں سو سوتے ملیں گے۔ دنیا کیا کتنی کیا نہیں، اس کی پروا تھی۔ اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کہ اس بوڑھے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی جو اس حادثے کے بعد سے یہ مشکل اپنے پیروں پر چلتا ہے اور جوان بیٹی اس کے گھر پر موجود ہے۔ اس لفیل کے دل کی کما عالت ہوگی جس کی کمائی سے اس گھر کی ہر ضرورت پوری ہوئی تھی۔ وہ دو عورتیں جس کی ذمہ داری ہیں؟ وہ شرمندگی سے اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریزاں ہیں۔ اپنی ضروریات کا ذکر کرنے سے خوف زدہ جو باتیں سمجھنے کی تھیں، ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی، سوائے مومنہ کے۔ اس نے ایک کوشش کی۔ اپنے ہونے والے ہم سفر سے بات کی کوشش۔ کیا وہ اس کی بات مانے گا؟ کچھ سمجھے گا؟

کانتے ہاتھوں سے اسے کال ملا کر لرزتے ہونٹوں سے اپنی بات اس کے سامنے رکھی۔ اسے بتا دیا کہ اس کے والدین اپنے سر کی چھت بچ کر اسے مستقیم ٹائی مو، شوہر کی صورت دس گے۔ اپنے طور اس کا مستقبل محفوظ کر س گے، مگر اسے یہ سودا منظور نہیں۔ وہ سادگی سے اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ اگر اس کے گھر والے چاہتے ہیں کہ شادی ان کی منشا



کے مطابق ہو تو انہیں پھر تاریخ مومنہ کے گھر والوں کی مرضی سے رکھنا پڑے گی۔ اس کال کے بعد اگلی صبح مستحکم کی ماں نے فاطمہ کو بلایا اور واپسی میں انکار تھا دیا۔ ان کے ہونہار بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ ایک فلاحی ہموگیا کرتیں۔ انہوں نے شادی توڑ دی۔

وہاں تو فاطمہ ضبط کرتی رہیں، مگر شوہر کے سامنے ایسے رویے جیسے کوئی مر گیا ہو۔ وہ بھی علیکین تھی۔ دکھ اسے بھی بے تحاشا تھا، مگر وہ کرتی بھی کیا۔ رونے سے بھلا کیا حاصل ہوتا؟ ان کا علاج اب بھی چل رہا تھا۔ سالوں کی بچیت تیزی سے خرچ ہو رہی تھی۔ وہ سوچتی رہتی کہ کیا کرے ابھی اس کا گریجویشن بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ پونی ورشی میں بھی اس کا ذہن الجھا رہتا۔ اس کی شادی ٹوٹنے کے بعد سے انہیں دل کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ فاطمہ بھی بیمار رہتیں۔ گھر کے حالات خراب سے بدتر ہونے لگے۔ کوئی مسمان گھر آتا تو ان کے پاس اس کی خاطر تواضع کے لیے رقم نہ ہوتی۔ ان کے سامنے روکھی سوچی چائے رکھتے وقت اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ حاکم صاحب اس بیمار اور ناتواں وجود کے ساتھ بھی نوکری ڈھونڈتے، مگر کام ہو جاتے۔ ادھار چڑھنے لگا۔ ماں کے سارے بال سفید ہو گئے۔ حامد خود پال بچوں والا ہو چکا تھا، مگر اس سے جتنا بن پڑا وہ کرتا مگر سب سے چھپ کر۔ مومنہ کا سر مزید جھک جاتا۔ وہ تعلیم مکمل ہونے کے انتظار میں تھی۔ ماں اتنا ضرور تھا کہ بیوٹن سے ملنے والی رقم پہلے وہ فضول کاموں میں خرچ کر دیتی تھی، مگر اب انہی پیسوں سے اپنی یونی کے اخراجات نکالتی۔

مومنہ سلائی کڑھائی میں بے حد ماہر تھی۔ اپنی شادی کے لیے اس نے ایک سے ایک جوڑے تیار کیے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے ایک ایک سوٹ بنایا تھا۔ یونی میں ہونے والے فنکشن کے لیے اسے کپڑوں کی ضرورت پیش آئی تو اس نے انہی میں سے ایک جوڑا نکال کر پہن لیا۔ سفید رنگ کی قمیص پر ست رنگے

دھاگے اور سوئی سے کیا گیا باریک اور نازک کام بے حد خوب صورت لگ رہا تھا۔ اس کی کلاس کی تمام لڑکیوں نے ند پو پو کی طرح پوچھنا شروع کر دیا۔

”یہ کہاں سے بنوائی؟“  
”واؤ۔۔۔ بہت حسین ہے یہ تو۔۔۔“  
”کتنی کی ملی ہے؟ مجھے بھی ایسی ہی چاہیے۔ اس کی قیمت کیا ہے؟“

”تین ہزار۔“ اس نے جھجکتے ہوئے اندازہ لگا کر بتائی۔  
”واٹ؟“ اسے یہ واٹ سن کر لگا جیسے قیمت زیادہ بتا دی ہو۔

”اتنا سستا؟ کون پاگل ہے ایسا؟ مجھے بھی ذرا بتاؤ۔“  
”شینا چلائی۔ وہ گھبرا گئی۔  
”کچھ دن پہلے میں نے ایک ڈریس لیا، صرف گلے پر ہاتھ کا کام کیا ہوا تھا۔ سات ہزار میں پڑی مجھے۔ پلیز یا رہتے بھی بنوا کر دو۔ اتنا سستا اور اتنا اچھا کام۔“  
”ہمارے جانے والے ہیں ان کی بیٹی سے کروایا تھا یہ کام۔“ وہ جھجک کر جھوٹ بول گئی۔

”مجھے بھی کرواؤ۔۔۔ اور اگر ہو سکے تو مزید سیچھلڑ کی تصاویر بھی بھجواؤ۔۔۔ ہو سکتا ہے میرے گھر میں بھی کوئی بنواتا چاہیے۔“ گھر آکر وہ ان باتوں کو سوچتی رہی۔ اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کیا۔

اگر میں ایسا کرتی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟ محنت سے گھر بیٹھ کر کماتو۔ جب تعلیم مکمل ہو گئی تب جاب ڈھونڈ لوں گی۔ کسی کوتاہی کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کام میرا ہے۔ اب دوستوں سے پیسے لیتی اچھی تو نہیں لگوں گی شرمندگی الگ۔ اس نے سوچا اور عمل کرنا شروع کر دیا۔ پہلے ہفتے ہی اس پانچ جوڑوں کا کام ملا، جسے اس نے کئی گھنٹے بیٹھ کر مکمل کیا۔ اس کی نازک انگلیوں میں سویلیاں چھنے سے نشان پڑ گئے تھے۔ ہاتھ تھک جاتے، مگر وہ لگی رہی۔ فاطمہ کو اس کا یونی سے آنے کے بعد کا سارا وقت کمرے میں گزارنا عجیب محسوس نہ ہوا، کیونکہ وہ دیسے بھی کتابی کیزاں اور اس قفسے کے بعد سے زیادہ ہی خاموش طبع ہو گئی تھی۔

لڑکیوں کو کپڑے دے کر جب ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کے ہاتھوں میں آئے تو وہ ابدیدہ ہو گئی۔ یہ چند ہزار کمانے میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے اور انگلیوں کی پوریں دیکھ کر لگتا تھا جیسے جیسے نئے سوراخ ہو گئے ہوں۔

اور اس کا باب اس گھر کا سربراہ دن رات ایک کر کے اس کی ہر خواہش پوری کرتا رہا۔ وہ آج بھی اس تھکن کا اندازہ کرنے سے قاصر تھی۔ گھر پہنچ کر اس نے وہ سارے پیسے ابو کے ہاتھ میں رکھے۔ وہ دکھی ہو گئے۔ اس کے ہاتھ چوم لیے۔ جذبات کو قابو رکھ کر اس نے اعلان کیا کہ وہ اب گھر میں سلائی کڑھائی سینٹر کھولے گی۔ روزانہ دو گھنٹے وہ اس سینٹر کو دے گی۔ امتحان میں بس دو ماہ رہتے تھے۔ اور وہ ان کاموں میں ابھی تھی۔ اپنے اسے سختی سے منع کیا، مگر اب وہ عزم کر چکی تھی کہ اسے یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھنا۔ اس کی ذرا سی محنت سے اگر گھر کے حالات میں بہتری آتی ہے تو وہ محنت سے جی نہیں چرائے گی۔

فاطمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ کچھ ہی عرصے میں ان کا کام پھیل گیا۔ مگر اس محنت کا فائدہ ان میں ذکر کرنا بے حد مشکل ہے جو انہوں نے کی۔ دن رات کی محنت نے سب بدل دیا تھا۔ گزرا کل اسے یاد آتا تو وہ حیران ہوتی۔ اس کے پاس صحت مند ہاتھ پاؤں تھے، دماغ تھا، مگر پھر بھی وہ کسی مجرے کے انتظار میں تھی۔ محنت مجرہ ہی تو ہے۔ اسی سے زندگی میں تبدیلی آتی ہے۔ اس نے یہ بات جلدی سمجھ لی۔

گریجویشن ہوتے ہی اس نے فیشن ڈیزائننگ کے کورس میں ایڈمیشن لے لیا۔ تاکہ وہ اسی کام کو بڑے پیمانے پر شروع کر سکے۔ اب اس نے دکان کھلوادی تھی تاکہ وہ بھی مصروف رہیں۔ اتنے علاج کے باوجود اب بھی وہ ٹھیک طرح سے نہیں چل سکتے تھے۔ مگر وہ ٹھیک طرح سے کام کر رہی تھی۔ گریڈ کا شکار رہنے کے بعد اس مصروفیت کے بعد ان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ہوئی۔ اس ذرا سی عقل مندی کے باعث ان کی زندگی میں کچھ گھٹاؤ نہیں تھا۔

اسے اس تک پہنچ رہا تھا۔ خدا نے نہ جانے کتنے اور لوگوں کے لیے اسے وسیلہ بنایا۔ بہت سی لڑکیاں اس کے پاس کام کرتی تھیں جنہیں وہ اچھا معاوضہ دیتی اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم بھرے جاری کرنے میں مدد بھی کرواتا۔ ایک روز پونہی شام کو وہ فرصت سے بیٹھی چائے کا کپ تھا۔ سوچوں میں گم تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی میں ہونے والا ہر حادثہ منفی کیفیات کے ساتھ ساتھ مثبت واقعوں کی خوشبو بھی ساتھ لاتا ہے، مگر ہم اس پر غور نہیں کرتے۔ اگر اس کے لبا کا ایک سیٹ نہ نہ ہوتا، اس کی شادی نہ ٹوٹی تو کیا وہ ان دو کاموں کو جانتی۔ بس اپنے کپڑے کاٹھ لیے، کسی دوست کی فرمائش پر اسے بھی کچھ ہی بن کر دے دیا۔ بات ختم، مگر اب نہ صرف یہ کام کاروباری شکل اختیار کر گیا تھا، بلکہ بہت سی لڑکیوں کو روزگار بھی میسر تھا۔ وہ مطمئن تھی۔ بہت خوش بھی۔

ان چار سالوں میں وہ بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر شادی کے نام سے اب بھی خوف زدہ تھی۔ تیسری بار کسی تجربے کی ہمت وہ خود میں نہیں پاتی تھی، مگر ارمان کی محبت اور اس کی ثابت قدمی نے مومنہ کا دل اس کی جانب موڑ ہی دیا۔ پیسہ ہونے کے باوجود اس نے شادی سادگی سے کرنے کی شرط رکھی، جسے اس نے فوراً مان لیا۔ سب کچھ اس کی سوچ سے بڑھ کر اچھا ہونے لگا تھا۔ صرف ایک تعمیری سوچ انسان کی زندگی سنوار کر رکھ دیتی ہے، ذرا سی محنت، اور خدا پر بھروسہ آپ کو آسمان کی سیر کروا سکتا ہے۔ وہ سر اٹھا کر چلتی تھی۔ اس کا ہاتھ لینے والا انہیں اب دینے والا تھا۔ اور وہ اس کریم ذات کا جتنا بھی شکر ادا کر لی، اتنا کم تھا۔

ارمان کے ساتھ ہنی مون پر جاتے ہوئے اس کے دل سے صرف شکر کے کلمے ادا ہو رہے تھے۔

✽ ✽

# چاندوسی

رنگ کی پراتنا بھی جج سکتا ہے اسے اندازہ نہیں تھا۔ اس کا منگول چہرہ، اور اس پر سنہری رواں تازہ مکی کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے حسن سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے لیے یہ تھی کہ اس کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ”وہ“ اسے بلا رہا ہے۔ اس نے ایک لمحے کی دیر نہیں کی تھی اور اس کی طرف بڑھی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام لینے کو بے قرار تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور وقت جیسے وہیں رک گیا۔ وہ بھی گوشت پوست سے پتھر میں ڈھلی تھی۔

☆☆☆

اس پتھر کو ریمی نے واپس موم کیا تھا۔ ”اوہ ہذا حرام اٹھ جا.....“ اس نے اس کا کبیل کھینچا تھا۔ لیکن ہذا حرام، کھایا یا سب حرام کیے پڑی تھی۔ ریمی کو نیو یارک کی سخت سردی کے باوجود ٹھنڈے پانی کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ آدھے گلاس کا جھپکا اس کے چہرے پر پڑا تھا اور وہ ایسے کانپ کر اٹھی تھی جیسے سونامی سے نبرد آزما ہو کر آئی ہو..... ”ریمی.....“ وہ چلائی تھی۔ ”یہ کیا بے ہودگی ہے۔؟ زبان کو حرکت دیتے ہوئے جرمانہ آتا ہے کیا.....؟“

”زبان کو حرکت دینے سے جرمانہ آتا تو تمہاری طرف میرے کرٹواں بن چکے ہوتے.....“ ریمی نے کھڑکی کے پردے پیچھے کرتے ہوئے کمال

سیاہ زیتون جیسی رات کو کستریوں والی کالی شال نے اپنی اوڑھنی میں چھپا رکھا تھا۔ اس طرح سے کہ اس کی سیاہ کستریوں کی لگیروں کے نیچے ایک روشن چاند کا عکس جھللاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ حسن اگر مکمل حالت میں ہوتا تو اس سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ سیاہ شوز، سیاہ ہینٹ، سیاہ شرٹ، سیاہ ویسٹ کوٹ پر گولڈن ٹائی میں اس کا سراپا دو دھار رنگوں کی وہ آبشار تھا جو اندھیرے غار میں سے نکلتی ہے اور سب کو منور کر دیتی ہے۔ سیاہ



بے نیازی سے کہا۔ ”وہ اوپر دیکھو..... اپنے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ.....“

برہانے اوپر دیکھا۔ جہاں اس کا ہی سائن کیا ہوا ایک پرچا لٹک رہا تھا۔ جس کی پہلی لائن میں تو لکھا تھا کہ ”مجھے زندگی کا ایک بھی لمحہ ضائع نہیں کرنا ہے۔“ دوسری لائن میں لکھا تھا کہ ”مجھے ہر صورت دنیا کا مقابلہ کرنا ہے۔“ اور تیسری میں لکھا تھا کہ ”اگر وہ تین بار کے اٹھانے پر نہ اٹھے تو اسے ایک گلاس پانی سے چکایا جائے.....“

”دیکھو میں تمہاری کتنی اچھی دوست ہوں۔ اوپر کے دو اصولوں پر تم بے شک عمل نہیں کر رہے لیکن جولاں میرے لیے لکھی گئی ہے۔ میں اس پر کسی طرح عمل پیرا ہوں اور تم مجھ پر غصہ ہو رہی ہو۔“ ریکی نے مسکراہٹ دیا ہے۔

غصہ جھاڑی وہ اٹھی تھی اور داش روم میں چلی گئی تھی یہ کہتے ہوئے کہ..... ”کافی تیار کر دو۔“ تھوڑی دیر بعد وہ داش روم سے منہ دھو کر باہر نکلی تو ریکی نے اس کے ہاتھ میں کافی گاگ تھما دیا تھا۔ بے خیالی میں اور عادتاً اس نے دوسرا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ سینڈوچ وغیرہ یا کچھ بھی ساتھ کھانے کے لیے لے لے کے لیے..... لیکن ریکی کے دوسرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔

”بس کافی.....؟“ وہ مر جانے کے قریب تھی۔ رات بھی اس نے کم کھانا کھایا تھا اور اب پھر صرف کافی.....؟ نیو یارک کیا واقعی اتنا بے رحم تھا کہ اپنے مہمانوں کو بھوکا رو دینا چاہتا تھا۔

”سب ختم ہو چکا ہے۔“ ریکی نے کندھے اچکا کر کہا اور پھر جلدی سے رخ موڑ لیا۔ اس کے ہر وقت کے مسکراتے چہرے پر جب جب اداسی آ جاتی تھی۔ تو وہ اسی طرح سب سے چھپ جاتا جانتی تھی۔ دو سال سے وہ چھپی ہی ہوئی تھی۔

”میں جلد ہی نوکری ڈھونڈ لوں گی۔“ اس نے روز بولے جانا والا فقرہ آج پھر بولا۔

”ہاں ڈھونڈ لو..... ورنہ موت ہمیں ڈھونڈ لے

گی۔“ ریکی غم میں بھی ہنستے ہوئے بولی۔

تیار ہو کر وہ فلیٹ سے نکلنے لگی تو اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔ ”میں ایک جگہ انٹرویو کے لیے جا رہی ہوں۔“ لیکن ریکی جانتی تھی کہ گیارہ بجے کوئی انٹرویو نہیں ہوتا اور جتنی برہا کی قابلیت تھی اتنی قابلیت والوں کو جواب دینے کے لیے انٹرویو کے لیے نہیں بلایا جاتا بلکہ سیدھا کام پر لگا دیا جاتا ہے۔

معلوم برہا کو بھی تھا لیکن وہ اپنے دل کو پھر یہ بہانہ دے کر کہ کام ڈھونڈنے کی شروعات کل سے کروں گی آج پھر ادھر ادھر جھوم کر وقت ضائع کرنے کے موڈ میں تھی۔ پہلے تو وہ بھام بھام گیتھی کے پاس پہنچی تھی۔

کیسی برہا کی دوست تھی۔ اپنے فلیٹ میں اکیلے رہتی تھی اور جادوؤں کے کام کرتی تھی۔ آتا داتا اسے کچھ نہیں تھا لیکن وہ اس بات پر ایمان رکھتی تھی کہ ”جب سر پر پڑتی ہے تو سب آتی جاتا ہے۔“ سر کا تو پتا نہیں لیکن اس کے پیٹ پر غرمت کی ایسی لانت پڑی تھی کہ اس نے تھوڑے بہت کے سیکھے ہوئے جادو کوئی کام میں لانے کا سوچ لیا تھا۔

جس وقت برہا کیسی کے فلیٹ میں پہنچی۔ کیتھی حسب معمول کمرے میں اندھیرا کیے اپنی دکان چکائے بیٹھی تھی۔ برہا کے پاس دوسری چابی تھی۔ اس لیے وہ خود ہی کمرے میں داخل ہوئی گئی اور اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کیتھی نے زخمی شیریں کی سی آواز نکالی تھی۔ ”شش.....“ یہ آواز مہینوں کی ریاضت سی اب اتنی بھیا یک ہو چکی تھی کہ اگر کسی دیرانی میں جا کر بھی نکالی جاتی تو وہاں کے بھی سب کہتے، بے، چوہے، کیڑے کاڈے ہجرت کر جاتے.....

”شش.....“ اس جلالی انداز پر وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے نہ تو روشنی کرنی ہے اور نہ ہی کچھ بولنا ہے۔ سر جھٹک کر وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔

کیتھی کرنے میں میوم تینوں کا دائرہ بنائے خود اس دائرے کے اندر بیٹھی تھی۔ چار پانچ لڑکیاں اس

دائرے کے باہر تھیں۔ کیتھی نے بدھا کی طرح آلتی پالتی ماری تھی اور کمر سیدھی کے دونوں ہاتھوں کو لمٹنوں پر رکھے وہ فرش پر بیٹھی، گیان کی بڑی ”اوچی“ منزلوں پر پرہاں چڑھ رہی تھی۔ برہا ایک سے فاکر نکال کر نیل فیل کرنے لگی۔

”آگئی..... آگئی..... مہا شکتی آگئی۔“ کیتھی چلائی تھی۔ پانچوں لڑکیاں سہم کر ایک دوسرے پر گر گئیں۔ وہ بڑی تسلی سے نیل فائل کرتی رہی تھی۔ جو سب ہو رہا تھا اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا نہ ہی اسے اس ڈرامے سے ذرا برابر خوف محسوس ہوتا تھا۔

”ڈرو نہیں..... بولو..... پوچھو..... جو پوچھنا ہے۔“ کیتھی نے جلدی بولنے کا اشارہ کیا تھا کیونکہ روح سے ملاقات کرنے کی اداکاری کرنے کا ڈرامہ اسے تھوڑی دیر میں ہی تھکا دیتا تھا۔

”میرے ماں باپ میرے شادی کے لیے روہن سے نہیں مان رہے۔ میں جانا چاہتی ہوں کہ کیا وہ مان جائیں گے۔ مان جائیں گے تو کیسے اور کب تک.....؟“ لڑکی کو کچھ زیادہ ہی آگ گئی ہوئی تھی۔

کیتھی فضا میں دیکھتی ہوئی خیالوں میں ایسے باتیں کرنے لگی تھی جیسے کسی روح سے بات کر رہی ہو۔

”جی..... جی..... جی ٹھیک ہے۔“ اور پھر اس کے بعد اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ دیا۔ برہا جانتی تھی کہ اس کاغذ پر کیا لکھا گیا ہے۔

دوسری لڑکی کا مسئلہ تھا کہ اس کا منگیترا سے نظر انداز کر رہا تھا وہ جاننے آتی تھی کہ اب وہ پہلے جتنی خوب صورت نہیں رہی یا منگیترا کسی حرافہ کے چنگل میں ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ کیا کرے؟

کیتھی نے سب کے مسئلوں کے حل کاغذ پر لکھ دیے تھے۔ پھر روح کو بڑی ”عزت و احترام“ کے بعد واپس بھیج دیا تھا اور موم بتیاں بجھا دی تھیں۔ برہا نے اٹھ کر لائینس آن کر دیں۔ پانچوں لڑکیاں مسئلے حل ہو جانے پر ہنسی خوشی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

برہا نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

”کھلتی نہیں ہو لوگوں کو بے وقوف بناتے

ہوئے.....“ اس نے بدھا کے آسن سے اترتی کیتھی سے کہا تھا۔

”میں تو بس اپنی جاب کو ایمان داری سے نبھا رہی ہوں۔“ وہ فخر سے بولی تھی۔

”منہ دھو لو مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے اور اور بھی لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا تھا۔ کیتھی نے سیاہ چہرے کی سفید آنکھوں کے ڈیلے گھا کر اس کی طرف جلال سے دیکھا تھا۔ برہانے اسے ہاتھ روم کی طرف دھکا دے دیا تھا۔

کیتھی نسلی ایشیا کی تھی۔ انڈیا کے ضلع آسام کی..... افریقی نہیں تھی۔ لیکن منہ پر سیاہ بوٹ پالش لگا کر بڑے آرام سے افریقی لگنے لگتی تھی۔ کیونکہ افریقہ کا جادو امریکا میں بہت مشہور ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اپنے فن میں ”کامیاب“ ہونا ہے تو افریقہ جانا پڑے گا یا یہاں رہ کر ہی افریقی بننا پڑے گا۔ پہلا مسئلہ پیچیدہ تھا۔ دوسرا بوٹ پالش نے آسانی سے حل کر دیا تھا۔ اوپر سے قسمت سے اس کے دانت بھی سفید تھے۔

چنے سفید..... جن کی بدولت وہ افریقی کم اور بلیک فورسٹ بلیک زیادہ لگتی تھی۔ کہیں جادو کے بارے میں اس نے دو چار کتابیں پڑھ رکھی تھی۔ تھوڑے بہت کرب بھی کر پیتی تھی۔ جس سے لڑکیاں متاثر ہو جاتی تھیں اور اس کے پاس چلی آتی تھیں۔ کیونکہ کیتھی سب کا کام مفت میں کرتی تھی۔ کیتھی اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی تھی۔ وہ تو روجوں کے پیغام ہوتے تھے جن کو وہ کاغذ پر لکھ دیتی تھی۔

”ایک فرفر کا کوٹ رات کو بارہ بجے فلاح پارک کی فلاح بیچ کے بچے رکھ دینا۔“

”فلاح جگہ.....“ لے اور بل“ کے میک اپ کا سامان..... اور یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ کیتھی ان جگہوں پر وقت مقرر سے پہلے موجود ہوتی تھی اور جوں ہی زمانے بھر کی ستائیاں لڑکیاں اپنی اپنی خواہشات کی وجہ سے وہاں کچھ چھوڑتی تھیں تو کیتھی انہیں اٹھا لیتی تھی۔ اس پر اس کا حق تھا۔ زندہ ہو کر بھی

”فلاح جگہ.....“ لے اور بل“ کے میک اپ کا سامان..... اور یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ کیتھی ان جگہوں پر وقت مقرر سے پہلے موجود ہوتی تھی اور جوں ہی زمانے بھر کی ستائیاں لڑکیاں اپنی اپنی خواہشات کی وجہ سے وہاں کچھ چھوڑتی تھیں تو کیتھی انہیں اٹھا لیتی تھی۔ اس پر اس کا حق تھا۔ زندہ ہو کر بھی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرمے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں ملتا ہے۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 150/- روپے

**سوہنی ہیر آئل** 12 سی سی بوتلیں کارکرب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تعویذی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں بائیکس دوسرے شیش دھتیاں میں کراچی میں دستی فروغ جاسکتا ہے۔ ایک بوتل کی قیمت صرف 150/- روپے ہے۔ دوسرے شیش والے دستی آؤر بیج کر جیٹر یا پزل سے منگوائیں اور جیٹر سے منگوانے والے دستی آؤر اس صاحب سے بھرا لیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 1000/- روپے

نوٹ: اس میں لاک فریج اور بلیک چار جڑ شامل ہیں۔

منی آؤر بھجنے کے لئے ہمارا ہند:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور، اسلام آباد، جتار روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر فور، اسلام آباد، جتار روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈاٹ نیچسٹ، 37- اردو بازار، کراچی  
فون نمبر: 32735021

”میں آج تمہارے ساتھ شو پر نہیں جاسکتا بیٹی! مجھے ایک ضروری کام آگیا ہے۔“ جیڈ بھی فوراً اصل مد سے پر آگیا۔

تم مجھے فون پر بتا سکتے تھے، خیر اب تم نہیں جانتے تو میں بھی نہیں جانتی۔“

”نہیں..... نہیں تم جاؤ کیتھی! اتنی مہنگی ٹکٹ لی ہے میں نے۔“ جیڈ نے کہا۔ کیتھی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ جیڈ گھبرایا۔ ”میرا مطلب ہے تم نے.....“ جلدی ہی وہ غیرت سے بے غیرتی کی ڈگر پر واپس آگیا۔

”ٹکٹ واپس بھی نہیں ہو سکتی اب.....“ کیتھی انسو روگی سے بولی۔

”تم اس کارٹون کو لے جاؤ نہ اپنے ساتھ۔“ جیڈ نے صوفے پر بیٹھی برہا کی طرف اشارہ کیا۔

”زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ مون! میں صرف کیتھی کی وجہ سے تمہارا لحاظ کرتی ہوں۔“

”میں بھی صرف کیتھی کی وجہ سے تمہیں برداشت کرتا ہوں، سزدکا.....“

”اور میں قبر کے عذاب سے بچنے کے لیے تم دونوں کا لحاظ کر رہی ہوں۔“ کیتھی نے دونوں کو خاموش کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے جیڈ! تم جاؤ۔ میں برہا کے ساتھ رہتی جاتی ہوں۔ تمہیں کوئی کام تو نہیں برہا۔“ کیتھی نے برہا سے پوچھا تھا اور پوچھتے وقت اس کے

پیرے پر مسکراہٹ دو آئی تھی۔ ”کام“ اور ”برہا“ کا اتفاق جڑنے میں ابھی نجانے کتنا وقت درکار تھا۔

کام برہا سے روشناس ہوا تھا۔ جو اس کے ہاتھ آئی نہیں

پانچیا شاید دونوں میں بریک اپ ہو گیا تھا اور اب لڑائی ان کی سطح نہیں کر دیا تھا۔

”نہیں.....“ وہ اپنی خفت چھپاتے ہوئے بولی۔

”اس کام جو کرو کروں کام پر رکھے گا۔“ مسئلہ حل

تے ہی جیڈ برہا پر طنز کرتا چلا گیا تھا۔

”جس نے تمہیں رکھا ہوا ہے۔“ برہا نے پیچھے

روک نہ سکی کیتھی! میں خود کو روک نہ سکی.....“

”کھڑکی میں کھڑی ہو کر مت چلاؤ..... ورنہ پھر میں پولیس کو بھی نہیں روک سکوں گی۔“ کیتھی نے تبصرہ کیا۔

”اس نے میرے طرف ہاتھ بڑھایا اور میں نے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا..... میں کیسے انکار کرتی۔ اتنے دنوں سے تو میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر

آج میں اس کا ہاتھ کیسے نہ تھامتھی۔ اس کا لمس میں ابھی بھی محسوس کر سکتی ہوں کیتھی! ابھی بھی.....“ کھڑکی

سے پلٹ کر وہ پلٹنے سے روکی تو اس نے کیتھی کو دیکھا جو پتھر بنی ہوئی تھی۔ آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔

”دوانی کھاتی ہے آج تم نے اپنی؟“ کیتھی نے پوچھا۔ اس سے بڑھ کر بے عزتی بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں کیتھی! میرا یقین کر دو۔ وہ خواب نہیں ہے، حقیقت ہے۔ وہ مجھے بلارہا ہے۔“

”تو دفعہ ہو جاؤ تا پھر اس کے پاس.....“ یہ کیتھی نے نہیں کہا تھا۔ یہ آواز دروازے کے باہر

سے آئی تھی۔ برہا نے منہ بنایا پھر چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ یہ کیتھی کا بولے فریڈ تھا۔ جیڈ.....

جس نے برہا کی گفتگو سن لی تھی اور اب اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ ایک جاپانی اس کے پاس

بھی تھی۔ یہ انہیں چابیوں کے معاملے میں کیتھی کیوں اتنی فیاض تھی۔

برہا نے رخ موڑ لیا۔ اسے جیڈ کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ کیتھی کی ہمت تھی کہ اس کے ساتھ چپک چپک

بیٹھ جاتی تھی۔ اسے کھانا کھلاتی تھی اور اس کے سامنے ہی..... آج بھی وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو برہا

وہاں سے چل دینے کے سوڈ میں تھی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی.....

”میری پیاری کیتھی!“ چابلی میں وہ مسخرے پن کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔

”بات کیا ہے؟“ چٹے سفید ڈیلیوں والی جادو

گرنی کیسے نہ ٹاڑتی۔

تو وہ روح ہی تھی۔ بے چاری لڑکیاں یہ سمجھ ہی نہ پاتی تھیں کہ کیتھی فیس کیوں نہیں دیتی، اور نہ ہی یہ کہ رتوں نے فر کا کوٹ

گہجی کے شوز، لے اور لیل کا میک اپ کیا کرنے ہیں؟ اور اسے اسے خوب نام آتے تھے۔ مہاشکتی، مہا بوی،

انڈہ کار رانی، پاتالی رنبر..... جوان کے مطلب بھتی تھیں وہ سہم جاتی تھیں، جو نہیں جانتی تھی وہ گھبرا جاتی

تھیں۔ کیتھی کا خوب کام چل نکلا تھا۔

”کسی ایک روح سے بوٹ پالش بھی منگوایا کرو..... روز کی ایک تو لگ ہی جاتی ہوگی۔“ کیتھی

باہر نکل کر چہرے پر کریم لگا رہی تھی۔ جب برہا نے تبصرہ کیا تھا۔

”کس کام سے آئی ہو.....“ کیتھی نے اپنی بڑی بڑی گینڈے جیسے آنکھیں گھما کر اسے دیکھ

تھا۔ برہا ڈوگری تھی۔

”زمانہ جو بھی کہے پر مجھے تم پر یقین ہے کیتھی..... تم زیادہ نہ سہمی مگر ٹھوڑا بہت جادو تو جانتی ہی

ہو..... اور میرا کام بنائیں کے کروگی۔“

”ہاں..... یہ تو ہے..... بولو.....“ وہ ایک ادا سے خود کو خشے میں دیکھتے ہوئے بولی۔ نخر سے کیتھی

کی گردن میں سریوں کا لینئر بلکہ ہٹل ٹاور پڑ گیا تھا۔

”پہلے وہ صرف مجھے دکھائی دیتا تھا۔ مسکراتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا لیکن کل وہ مجھے اپنی طرف بلارہا

تھا۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سیاہ پینٹ، سیاہ شرٹ، سیاہ ویسٹ کوٹ، سیاہ شوز، جس میں اس کا

سفید چہرہ ایسے جگمگا رہا تھا جیسے تمہارے سیاہ چہرے پر تمہارے دانت.....“ کیتھی پلٹی لیکن تب تک برہا

اٹھ کر چھوٹنے لگی تھی۔ اس طلسم گر کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کی آواز لچر بے لچر بلند ہو رہی تھی۔

”وہ چاند کی طرح روشن تھا۔ کوئی اتنا خوب صورت کیسے ہو سکتا ہے کیتھی۔ کیسے.....؟“ اس نے

کھڑکی کھول کر باہر صدا لگائی۔

”اس نے مجھے اپنی طرف بلایا اور میں خود کو

نکل گیا کہ ”بھونکتی“ رہو اب۔ کیتھی نے برہا کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”خیر سے ہمیشہ کی طرح آج بھی مانگے کے کپڑوں میں ہو۔ جاؤ اندر سے میرے کپڑے پہن لو۔“ کیتھی نے اجازت دی تو وہ اندر سے گوجی گاچی کے ردھوں کے کپڑے پہنے چلی گئی۔

شام سے پہلے پہلے دونوں رات کے شو کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔ کیتھی میں بیٹھ کر برہانے پھر خواب کا ذکر چھیڑا تھا۔

”تم خوابوں کے مطلب جانتی ہونا کیتھی! مجھے بتاؤ، کیا وہ میری زندگی میں آئے گا۔“

”شو کے بعد بتاتی ہوں۔“ کیتھی نے جان چھیڑنے کی غرض سے کہا تھا لیکن شو کے بعد برہا کو کیتھی سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ سارے جواب اسے خود ہی مل گئے تھے۔

☆☆☆

ہال چھوٹا لیکن عوام سے بھرا ہوا تھا۔ عوام بھی عجیب الخفقت تھی۔ ایسے جیسے اس شو کے پرستار دوسری دنیا سے آئے ہوں۔ مرنے وغیرہ سے۔۔۔۔۔

کیسا شو تھا یہ۔۔۔۔۔؟ اسے تو اس چیز کا پتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کسی بت کی طرح کیتھی کے ساتھ ساتھ یہاں تک آگئی تھی۔

”کیتھی یہاں پر کیا کوئی میوزک کنسرٹ ہوگا؟“

کسی سنگر نے آنا ہے یا تھیٹر لیے ہوگا؟“ اس نے کیتھی سے پوچھا تھا۔ کیتھی مسکرائی تھی۔

”کہیں کیا لگتا ہے کہ مجھے سنگر، میوزک اور تھیٹر ملے میں دلچسپی ہے۔ بے شک تم جادوگر نہیں ہو مگر قیافہ شناس تو بنو۔۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔۔ یہاں ابھی دنیا کا سب سے خوب صورت جادوگر آنے والا ہے اور وہ یہاں آکر اپنے جادو کا جادو جگائے گا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ اس نے بے دلی سے کہا۔ وہ کیسے بھول گئی تھی کہ کیتھی جیسے چیزیں ہی پسند ہوں گی۔ ”اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ یعنی شور شرابا نہیں ہوگا۔ اب میں آرام سے سیٹ پر گردن گرا کر سو سکتی

ہوں۔“ کہہ کر وہ ساتھ ہی سونے کی تیاری کرنے لگی۔ چہرے پر ڈالنے کے لیے اس نے بیک سے رومال نکال لیا اور اسی وقت ہال کے پردے اٹھے تھے اور ایک شور بلند ہوا تھا۔ پروسیم اس پر دو لڑکیاں پہلے سے فوج کی مریضہ جی کھڑی تھیں اور درمیان میں ایک ڈرم بڑا ہوا تھا۔ برہا سیٹ پر ٹیک لگائے سونے کے قریب ہی تھی۔ جب وہ اس پر آیا تھا۔ بقول کیتھی کے دنیا کا سب سے خوب صورت ترین جادوگر۔۔۔۔۔

جادوگر یا فسون خیز، یا ساحر، طلسم گر۔۔۔۔۔ کیا نام دیتی وہ اسے۔۔۔۔۔ جس کی آنکھوں میں آدمی دنیا کی کشش تھی۔ سیاہ پینٹ، سیاہ شوز، سیاہ ویسٹ کوٹ اور گولڈن ٹائی۔۔۔۔۔ میں وہ نمکی ڈیبا میں بند الماس کی طرح جگمگا رہا تھا۔

برہا نے جھپٹنے سے گردن سیدھی کی تھی۔

”اللہ۔۔۔۔۔“ اور اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا یا دھک دھک کہیں رہ گئی تھی۔ یہ وہی تھا۔ ہاں یہ وہی تھا۔ کیتھی۔۔۔۔۔؟ اس کا دل کیا کہہ چاہے لیکن اس کی آواز بند ہو گئی۔ وہ تو آنکھیں جھپکنا بھی بھول گئی تھی۔

جادوگر نے اپنا پہلا نمونہ پیش کیا تھا۔ دلڑکیوں میں سے ایک کو اس نے ڈرم میں بند کر دیا تھا۔ پھر دوسری والی لڑکی کو ایک کپڑے کے نیچے چھپا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب کپڑا کھینچا گیا تھا اور ڈرم کھولا گیا تھا تو دونوں لڑکیوں کی پوزیشن تبدیل ہو چکی تھی۔ کپڑے کے نیچے والی ڈرم میں سے نکلتی تھی اور ڈرم والی کپڑے کے نیچے سے۔۔۔۔۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ سوائے برہا کے سب نے تالیاں بجاتی تھیں۔

پھر دوسرا شو پیش کیا گیا تھا۔ جو پہلے والے سے بھی زیادہ جان دار تھا اور پھر تیسرے کی باری آئی۔۔۔۔۔

”اب ہمیں آپ میں سے ایک لڑکی چاہیے۔“

”جادوگر پہلی بار بولا تھا اور اس کی آواز سن کر برہا کو محسوس ہوا تھا کہ اسے تو گلوکار بھی ہونا چاہیے اس کی آواز میں صدیوں کی ریاضت کی علامت

”مزم لٹان کی سی۔۔۔۔۔ جو تیز چاندنی میں پارہ پارہ ابا ہا ہے۔“

”کون دے گا میرا ساتھ۔۔۔۔۔“ جادوگر نے ہال میں موجود تمام لڑکیوں نے شور مچایا تھا۔ سب تیار تھیں۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ نہیں آپ۔۔۔۔۔“ جادوگر اپنی انگلی کو دائیں بائیں کرتا ہوا اس پر ٹکا تھا۔ برہا کی انگلی ٹوٹی تھی۔

”آپ۔۔۔۔۔ مس۔۔۔۔۔ پلیز کم ہیئر۔“ وہ ادب سے اپنے پاس بلارہا تھا۔

”میں۔۔۔۔۔“ وہ بوکھلا گئی تھی۔ کیتھی نے اسے اپنی ماری بھی کہہ دتی مری کی نہ ظاہر ہو، فوراً اٹھ بائے اور خوشی سے چلائے، لیکن وہ چلا نہیں سکی تھی۔

اب اسے کھڑی ہوئی تھی کیونکہ کیتھی نے اس کے پاؤں پر اپنی ”جی جی چوں چوں“ کی ہیل کی نوک چھبھوئی تھی۔

”پلیز اس پر آجائیں۔۔۔۔۔“ جادوگر ہاتھ اس کی طرف بڑھائے اسے بلارہا تھا۔ وہ بمشکل اس پر چڑھی تھی اور جیسے ہی پہنچی تھی جادوگر نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ (تو کیا خواب کی تعبیر پوری ہوئی۔؟)

”آپ یہاں پر اپنے سائن کر دیں یا کوئی بھی پیغام لکھ دیں۔“ اس نے ایک سلیٹ برہا کے آگے کی تھی۔ تھوڑی دیر تو برہا کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا لکھے۔۔۔۔۔ پھر اس نے ایک مشہور کوٹ لکھ دیا تھا۔

”نہایت صرف ایک دفعہ کا مار کر ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ جادوگر نے ہنسنے لگا چکا کہ اسے داد دیتی تھی۔ پھر وہ سامنے بلیک بورڈ کی طرف بڑھا تھا۔

اس پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔ وہاں اس نے کوئی منتر پڑھا اور ہاتھوں کو عجیب انداز سے حرکتیں دی تھیں۔

”اب کہ دوسرے جادوگر کرتے ہیں۔ پھر جب پردہ اٹھا تو اس کا کوٹ سامنے بلیک بورڈ پر بھی ہو رہا تھا۔

”اب آپ بیٹھ سکتی ہیں۔“ اس نے اسے ہال ایک بار پھر سے تالیوں کا شور گونجتا تھا۔

”اب آپ بیٹھ سکتی ہیں۔“ اس نے اسے

واپس جانے کا اشارہ کیا تھا اور وہ واپس سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اگرچہ اس کا دل تو نہ کر رہا تھا۔ وہ تو وہیں جادوگر کے پاس ہی کھڑی رہنا چاہتی تھی۔ جادوگر کی تن کی خوشبو کی پٹیں ابھی بھی اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”یہ لڑکا وہ ہی ہے کیتھی! یہ لڑکا وہ ہی ہے۔“

کیتھی میں واپسی کے لیے بیٹھے ہی وہ چلائی تھی۔

”اس لڑکے کا نام حمدان ہے اور میں اسی کے پاس جاب کے لیے جانے والی ہوں۔ اس کی ہیلپر کے طور پر۔۔۔۔۔“

”لیکن وہ تو میرے خواب میں آیا تھا۔ تم کس خوشی میں اس کے پاس جانے لگی ہو۔“

”تم نے میرے کمرے میں اس کا کوئی کارڈ وغیرہ دیکھ لیا ہوگا۔ وہ تصویر تمہارے ذہن میں نقش ہو گئی ہو گی اور اس طرح سے وہ تمہارے خواب میں آ گیا ہوگا۔ اسے صرف پیٹ کی خرابی والا خواب سمجھو میری جان۔۔۔۔۔“ کیتھی نے اس کے گال تپتھپتے تھے۔

”لیکن خواب میں اس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ مجھے بتاؤ اس کی کیا تعبیر ہے۔“

”میں کہیں بتانے ہی لگی تھی کہ اس کی تعبیر ہے کہ وہ واقعی میں ایک دن تمہارا ہاتھ تھامے گا۔ دیکھو آج ایسا ہو گیا ہے۔“ مکار کیتھی نے مکاری دکھائی۔

”کیتھی! مجھے اس سے دوبارہ ملنا ہے۔“ وہ ان بچوں کی طرح بولی جن کی سب سے بڑی خواہش بس کھٹی میٹھی گولیاں ہوتی ہیں۔ ”کیتھی پلیز، کچھ کرو ناں۔۔۔۔۔“

”کیا چاہتی ہو۔“ بے چاری گھر والوں سے کوسوں دور رہتی کیتھی جذباتی نہ ہوتی تو پھر کیا پتھر کی ہو جانی؟ ”اس لڑکے کی ہیلپر بنو گی؟“ کیتھی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے انٹرویو کی جگہ تم جاسکتی ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ وہ خوشی سے چلائی تھی۔ ”لیکن مجھے جادو تو آتا ہی نہیں۔“



”تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ ایک ہفتے میں تم زیادہ نہ سہی لیکن تین گرجب تو سیکھ ہی لوگی۔ وہ تین اس کے سامنے پیش کر دینا، آگے کی قسمت اور محنت تمہاری.....“

”میری پیاری کیتھی!“ وہ اس کے گال کو چومو کر رہی تھی۔

”جیڈ کی طرح مت کرو۔“

”مجھے جان سے مارو، لیکن جیڈ سے نہ ملاؤ۔“

اس نے بناوٹ والے غصے سے کہا تھا۔ کیتھی ہنسی تھی۔

☆☆☆

”برہا.....؟“ اس نے اس کا نام پکارا تھا اور برہا کو لگا جیسے اسے خود بھی تو آج ہی پتا چلا ہے کہ اس کا نام برہا ہے اور اس کا نام کس قدر خوب صورت ہے یا اس کے پکارنے سے ہو گیا تھا۔

اس وقت وہ اس کی آفس میں اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک ہفتے میں تین گرجب سیکھ لینے کے بعد وہ کیتھی کی جگہ خود انڈیو کے لیے آگئی تھی۔ آفس اگرچہ بہت گھڑی تو نہیں تھا۔ لیکن وہاں ایک بہت ہی سٹی چیز پڑی ہوئی تھی جس نے اس آفس کو جاندار بنادیا تھا اور وہ ہفتی چہرہ خود حمدان ہی تھا۔ آسمان کو فتح کر لینے کے بعد خاموشی سے بیٹھا آدی۔

حمدان کے ہاتھ میں برہا کی فائل تھی۔ جہاں پر سے وہ اس کی ”نامشی کی کوتاہیاں“ مطلب ”کارکردگیاں“ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر نہیں بیٹھا ہوا تھا بلکہ اٹھ کر میز پر آ گیا تھا اور اب اس کے بے حد قریب میز کے ایک کونے پر ایک ٹانگ نیچے گرائے اور دوسری پروں ڈالے بیٹھا تھا۔ آج اس نے گرے کوٹ، گرے پیٹ پہن رکھی تھی اور ساتھ سفید شرٹ۔ اس کے سر اے سے اتنی تیز ”ڈارک ٹائٹ“ کی خوشبو برہا کو بے چین کر رہی تھی۔ آج وہ ہفتے بھر پہلے کے شو سے بہت مختلف لگ رہا تھا اور..... اور کٹش بھی۔

”پہلے بھی کسی جادوگر کے پاس کام کیا ہے؟“

”نہیں حمدان! میرا مطلب ہے نہیں سر.....“ اس نے کہا تھا اور اس کی ”کارکردگیوں“ کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

”تو پھر آپ میری ساتھ کیسے کام کریں گی۔ ایک بالکل ہی انجان انسان کیسے میرے لیے فائدے مند ثابت ہوگا۔ مجھے تو خود ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ بہت آگے جانا ہے۔ کیا تجربہ ہے آپ کو..... کیا جانتی ہیں آپ جادو کے بارے میں؟“

”میں جادو کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں سر!“

”مثلاً.....“ اس نے اس کی ”اسناد“ کی فائل پرے کر دی اور کندھے جھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ بخنوں کو بھی اوپر کیا۔

”مثلاً یہ ہے جادو کی تاریخ بہت پرانی ہے تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح اس کے نشانات ہیں۔ مصریوں، سامریوں، ملیا واسیوں نے جادو اپنے اپنے طور پر عروج دیا۔ دنیا کا سب سے بڑا جادو مصر میں فرعون رمیس کے دربار میں کھیلا اور.....“

”ایک منٹ.....“ وہ رٹے رٹائے تو تے طرح بول رہی تھی جب اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے درمیان میں ہی روکا تھا یا شاید ٹوکا تھا۔

”میں نے تم سے جادو کی تاریخ نہیں پوچھی“

”اب“ کے جادو کے بارے میں کیا جانتی ہو تم؟

اس نے اب کے لفظ پر زور دے کر کہا۔

”اب“ کے جادو کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی ہو سر!“ جواباً وہ بھی اب پر زور دے بولی۔

”اب..... جادو ساری دنیا میں پھیل چکا ہے خاص کر افریقہ اور بنگلہ دیش کا جادو پوری دنیا مشہور ہے۔ افریقی لوگ کنکروں کوٹھی میں بند کر انہیں ہلاتے ہیں پھر زمین پر پھینک دیتے ہیں اس طریقے سے وہ کسی انسان کا کیا پوری دنیا کا آ والا وقت بنا سکتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے لوگ جادو

روٹی کے پتلے بناتے ہیں اور ان میں سونیاں بپوتے ہیں۔ ازبکستان اور پاکستان کے لوگ مانتوں پر لکھی تحریریں پڑھنے کے عادی ہیں اور.....“

وہ بولتی جا رہی تھی اور وہ اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اُس کر رہی تھی۔ جس نے برہا کو چپ ہو جانے پر زور کیا تھا۔

”آپ یہ ہی جانتا چاہتے تھے ناں.....؟“

”میں کالے جادو کے بارے میں نہیں جانتا۔ پاپٹا مانی ڈیر! مجھے جادوئی کرتوں کے بارے میں ناؤ۔ کیا جانتی ہو تو تم جادوئی کرتوں کے بارے میں.....“

”اود..... کرتب.....“ وہ اچھلا۔ ”میں جادو کے کرتوں کے بارے میں بھی سب کچھ جانتی ہوں سر!“

”کوئی کرتب آتا ہے تمہیں مس برہا!“ اب وہ یہ اس کا مزالے رہا تھا۔

”جی بہت سارے.....“ اس نے کہا۔ حمدان نے استقبالیہ اس کی طرف دیکھا، میز کے کونے سے اٹھا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر ہاتھ سے ایک اشارہ کیا کہ چلو پھر شروع ہو جاؤ۔ برہا بالکل بھی نہ ٹھہرائی۔ کیتھی نے اسے پورے ایک ہفتے کی مشق تین کمال کے جادوئی کرتب سکھا دیے تھے۔

اب تو تاش کے پتوں والا تھا۔ دوسرا بازو کے لباس لہ اندر سے بہت سے مورچکے نکالنا اور تیسرا بالوں سے تین تازہ پھول نکالنا۔ مشق سے وہ تینوں ماہر ہو چکی تھی یا سمجھتی تھی۔ لیکن ہائے ری

ت..... آنے والے وقت کا کسے پتا ہوتا ہے۔

وہ وہاں کرتب دکھانے کے بدلے اسی آفس کی ڈرائی سے کوو کر خود کشی کر لینا پسند کرتی۔

اس نے اپنے بیک میں سے تاش کے پتے اٹھائے اور ان کو اچھے سے چھیننا تھا۔

”اس ایک پر اپنے سائن کریں سر!“ اس نے ان کے آگے کیا۔ حمدان نے ایک نظر اسے

دیکھا تھا۔

”کریں ناں.....“ وہ مسکرا رہی تھی۔ بڑا اعتماد تھا اس میں کہ اب وہ حمدان کو ایسے متاثر کرے گی کہ اسے اپنے جادوئی گرجب اس کے سامنے کم پڑتے محسوس ہوں گے۔ حمدان نے تاش پر سائن کر دیے تھے۔

”اب اس پتے کو آپ اپنے پاس رکھیے۔“

حمدان نے ایسا ہی کیا۔ وہ پھر سے تاش کے پتے چھیننے لگی۔ پھر اس نے ایک ایک پتے کو دیکھا۔ لیکن اسے کہیں اندر کسی بھی پتے پر حمدان کے سائن ہوئے نظر نہ آئے۔ اس نے پھر سے ایک ایک پتے کو دیکھا تھا۔ لیکن سائن والا پتا کہیں نہیں تھا۔ اللہ.....

اچانک اسے کچھ خیال آیا اور اس نے بیک میں جھانکا۔ کاربن پیپر والا تاش بیک میں ہی موجود تھا۔ جس پر ٹریس ہو کر حمدان کے سائن ایک اور پتے پر ابھر آئے تھے۔

”کیا ہوا.....؟“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”سر..... کرتب غلط ہو گیا ہے۔“ اس کے پاس یہ کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ کوئی دوسرا کرتب کر کے دکھاؤ۔“ سیٹ پر فیک لگا کر جھولتے ہوئے وہ پیار سے بولا۔

”جی سر! ابھی لیں۔“ وہ پھر ایک نئی توانائی سے بولی اور گھڑی ہوئی۔ اس نے ہاتھوں کو ”کراس“ کی شکل میں باندا۔ پھر ان کو ایسے حرکت دینے لگی جیسے کرتب نہیں کرائے کھیلنے لگی ہو۔ حمدان مسکرا رہا تھا۔ برہا اس کے سامنے بلیو بینڈ ماجرین جو بنی ہوئی تھی۔ پھر اس بلیو بینڈ ماجرین نے جھٹکنے سے اپنے بازو کے لباس کے اندر سے بہت سے مورچکے نکال لیے۔ حمدان سیٹ پر اچھلا اور کل کر بننے لگا تھا۔

برہا اس کے اس طرح اچھل کر بننے کو سمجھ نہ سکی۔ اسے تو اس کے فن کی داد دینی چاہی تھی لیکن..... پھر اس کا فن خود اس پر آشکار ہوا۔ مورچکے کی ڈنڈیوں کے بجائے اس کی کٹھی میں پنکھ تھے اور ڈنڈیاں کسی جھاڑوں کی طرح ہوا میں تھیں۔ اس کا کرتب الٹا تھا۔

”اوہ سوری.....“ اس نے کہا اور پنکھوں کو سیدھا کر کے پکڑ لیا لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ حمدان ہنسی کو قابو میں نہیں کر پا رہا تھا۔

”بس یا اور کچھ بھی ہے؟“ بڑا گھبرا گئی تھی۔

”جتنے بھر کی مشق کسی کام نہیں آئی تھی۔ اس کے دونوں کرتب خراب گئے تھے۔“

”ایک تیسرا بھی ہے۔“

”چلو..... وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد تم گھر جاسکتی ہو۔“ اس نے کہا۔ اب یہ پہلے دو کی ناکامی تھی یا اس کے دیکھنے کی گھبراہٹ کہ اس سے تیسرا کرتب کرنے کے لیے ہمت جمع ہی نہیں ہو پاری تھی۔

”تیسرا کرتب.....“ بڑا ہلکا سا گھبرا چکی تھی۔ اس کے دونوں تاثر اچھے نہیں پڑے تھے۔ خیر پھر بھی اس نے اپنا تیسرا اور آخری کرتب کرنے کا آغاز کیا تھا۔ کھڑے ہو کر بالوں کی پونی پھینکی، پھر کھوم کر بال لہرائے تھے۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ بالوں میں کچھ نہیں ہے۔ پھر دوسرے چکر میں پیچھے کمر سے جیکٹ تلے سے جلدی سے پھول نکالے تھے اور حمدان کے سامنے آتے آتے دوسرے چکر میں پھولوں والا ہاتھ حمدان کے سامنے کیا تھا۔ حمدان نے سوالیہ پھونکیں اٹھائی تھیں۔ برہانے اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ ہاتھ خالی تھا۔ پھر اس نے فرش پر دیکھا تھا۔ کمر سے پھول نکالتے سے پھول اس کی پکڑ میں نہیں آسکے تھے اور فرش پر گر گئے تھے۔ ہائے اللہ..... وہ دھک سے رہ گئی اور پھولوں کو خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگی تھی کہ وہ اس کی پکڑ میں کیوں نہیں آئے تھے۔ حرامی نہ ہوں تو..... حمدان اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور..... وہ جبکہ کمر پھول اکٹھے کرنے لگی تھی۔

”بس.....؟“ وہ سوالیہ گویا ہوا۔ سنجیدہ لیکن اپنا بنالینے والی آواز سے۔

”جی.....“ وہ نظریں جھکا کر بولی تھی۔

شرمندگی کے مارے اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔

”اوکے بائے اتم جاسکتی ہو۔“

”لیکن حمدان..... میرا مطلب سر!“

”میں بہت مصروف ہوں۔ تمہیں تمہاری بات کہنے کا پورا پورا موقع دیا گیا ہے۔ جس میں تم ناکارہ رہیں۔ اب اس موقع پر کسی اور کا حق ہے۔“ اس نے دو ٹوک، حقیقی اور اصولی بات کی تھی۔ آکس سے باہر نکلتے وقت بڑا ہی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہنسنے پھر محنت کا کوئی پھل نہیں مل سکا تھا۔ وہ ناکام ہوئی تھی کرتب دکھانے میں بھی اور اسے متاثر کرنے میں بھی.....

☆☆☆

”ایسا تو ہونا ہی تھا میری جان! تم نے اس موقع کو صرف اس سے ملاقات پر نسبت دی تھی۔“

”جواب سے نہیں..... اگر تم اسے جواب کا ایک موقع سمجھ لیتیں تو دل لگا کر وہ سب سیکھتیں۔ جب تمہیں سب سکھا رہی تھی تو مجھے اندازہ تھا کہ تم اس سے ملنا ہی چاہتی ہو..... جبکہ میں چاہتی تھی بے روزگار ہو تو تمہیں یہ جواب مل جائے۔ میرا کام مہاشکتی، مہادیوی چلا ہی رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی نے مجھ سے میرا موقع بھی گنوا دیا۔ جبکہ میں دل سے یہ جواب کرنا چاہتی تھی۔ ایسی جاب کون نہیں چاہے گا۔ شہر شہر گھومو، پیسہ کماؤ، لوگوں کے دل جیتو اور جاو گرا اتنا پیارا ہو تو.....“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو کیتھی!“ اس نے اتر کر کے کیتھی کے سارے اندازوں کو سچ ثابت کر دیا۔ ”لیکن میں کیسے سیکھتی جاؤں کیتھی! میرا تو دل ہی نہیں ہے۔“

”دل تو ہمارا دوش روم صاف کرنے میں نہیں ہوتا میری جان! لیکن کرنا پڑتا ہے۔ زندگی ہر کام اپنی پسند کا کرنے کو نہیں دیتا۔ تم اپنی پسند جاب کب تک ڈھونڈتی رہو گی اور تمہیں یہ بھی ہوگا کہ تمہاری پسند کی جاب کون سی ہے۔“

”تم چاہتی ہو کہ میں جاؤں سیکھ لیتی۔ مہادیوی والا.....“

”تم سے یہ سب سیکھنے کو کون کہہ رہا تھا میری جان! میں صرف کرتب کی بات کر رہی ہوں۔“ کیتھی رہا تھا۔

”بڑا خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے واقعی ایک موقع گنوا دیا تھا۔ اپنا بھی اور کیتھی کا بھی۔“

”تم ایک جاب کر لو گی۔ دو کر لو گی۔ کیا اس میں ترقی ہے؟ ہرگز نہیں۔ تم ایک بے وقوف کی طرح ماری زندگی ایک کام سے گلی رہو گی، چاہے اس میں بار بار اول ہو یا نہ..... چاہے اس میں ترقی کی مواقع ملیں یا نہ..... جاب میں سال بعد تمہاری تنخواہ ایک لاکھ سوسے تھک بڑھا دی جائے گی۔ دس ڈالر، بیس ڈالر، سو ڈالر۔ تم پیسوں کی ترقی تو شاید حاصل کر لو..... لیکن ذات کی ترقی کبھی بھی نہیں حاصل کر سکو گی۔ تو پھر تم وہی کام کیوں نہیں کرتیں۔ جس میں ابھی مشکل تو ہے لیکن آگے ترقی ہے۔ پیسوں کی ترقی اور ذات کی بھی..... ایک دم سے کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا میری جان!“

”لیکن اس میں تو میرا دل ہی نہیں ہے کیتھی!“

”تمہاری کسی میں بھی توجہ نہیں ہے۔ کسی میں دل نہیں ہے۔ تم کو راکھ کا غدوہ۔ تم گدھے کی طرح ڈالو، اون کام کر کے صرف پیسہ کمانا چاہتی ہو لیکن کوئی ذاتی کام کر کے نام نہیں کمانا چاہتیں۔“

”ہو سکتا ہے تم سب ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن یہ سب نہیں کر سکتی۔ سوری.....“ کہہ کر وہ کیتھی کے دفاتر سے باہر نکل آئی تھی۔ کہیں جانے کو کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے وہ اکیلی ہی پارک میں چلی گئی جہاں پہلے کافی عرصے سے وہ یہاں ہی تو آ رہی تھیں۔ ان میں ڈوبے باجول کو دیکھ کر وہ اپنے اندر اس میں اتارنی تھی اور ایک جیسے ہم آہنگی کے لیے دل میں چند لمحوں کو سب کچھ بھول کر خوش ملی کوشش کرتی تھی۔ اگرچہ ہر بار ناکام ہی رہتی۔ کچھ کام وہ کر نہیں پاری تھی اور کوئی اسے مل نہیں دیتا۔ ہنا کام کے اس ملک میں گزرا نہیں

تھا۔ بڑے عرصے سے وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور شتر مرغ کی طرح اس نے اپنا سر بھی ریت میں دب کر لٹکا رکھا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ خطرے، مشکلات، پریشانیاں، محرومیاں سب جوں کی توں ہی رہی تھیں۔

نارنگی گلاب کی سی شام آہستہ رومی سے ارغوانی نرگس میں بدل رہی تھی۔ جب وہ آنسو صاف کرتے ہوئے سنگی بیچ سے اٹھی تھی۔ اپنے فلیٹ تک واپس آتے ہوئے بھی وہ مروہ چال سے چلتی ہوئی ہی آگے بڑھتی رہی تھی۔ راستے سے اس نے اپنے اور رومی کے لیے کچھ کھانے کو خرید لیا تھا کیونکہ رومی نے اسے صبح ہی بتا دیا تھا کہ گھر میں پانی کے علاوہ اور کچھ ایسا نہیں ہے جسے چولہے پر چڑھایا جاسکے۔ اس نے کچھ سستے سے مفز لیے تھے اور کچھ سخت پیٹریاں۔

لفٹ خراب ہونے کے باعث وہ تقریباً سو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور اپنے فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر دھک سے روک گئی تھی۔ رومی فلیٹ کے دروازے کے باہر سارا سامان باندھے بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا اگرچہ پوچھے بنا ہی وہ جواب جانتی تھی۔

”وہی..... جس کا ڈر تھا۔ ہمیں کرایہ نہ دینے پر بے دخل کر دیا گیا ہے۔“ رومی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ بڑا کے پاؤں تلے سے پوری بلڈنگ نکل گئی تھی۔ مفز اور پیٹریاں وہیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئیں۔ جس لمحے گودہ بڑے دنوں سے ٹال رہی تھی وہ دھماکے کی صورت ظہور پذیر ہوا تھا۔ گھر کے بند دروازے کے باہر اس طرح بے ترتیب پڑا ہوا سامان دل میں کیسے جھجھکا رہا تھا۔ اسے آج اندازہ ہوا تھا۔ وہ وہیں غم سے ڈھب جاتی، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتی، شتر مرغ کی طرح سر ریت میں دے لیتی کہ اچانک نجانے کیا ہوا۔ وہ اگلے قدموں بھاگتی ہوئی کیتھی کے پاس آئی تھی۔ کیتھی اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے کہیں باہر جا رہی تھی جب برہانے اس کا راستہ روکا تھا۔

”کبھی.....“ وہ ہانپتے ہوئے بولی تھی۔ ”مجھے جادو دیکھنا ہے۔“

☆☆☆

”ہر کام کی ایک شرط ہوتی ہے۔“ ایمان ”جادو کی بھی یہی شرط ہے اور جادو کا ایمان ہے۔ مستقل مزاجی..... جادو عجالت میں نہیں سیکھا جاسکتا، جادو سستی سے بھی نہیں سیکھا جاسکتا..... تو پھر یہ کیسے سیکھا جاسکتا ہے۔ جادو سیکھنے کے لیے دل کی دھڑکنوں کو گنتا پڑتا ہے۔ ان کی رفتار کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ نہ کم نہ زیادہ..... نہ تیزی، نہ سستی، کیونکہ دل کی دھڑکن پر یہ دونوں صورت حال ہی اس کی موت کا باعث بنتی ہیں اور جادو پر اس کی بے ایمانی کا۔

ایمان حاصل کرنے کے لیے تمہیں اپنے بند ذہن کو چگانا ہوگا۔ لحوں میں صدیوں کو گنتے کافن سیکھنا ہوگا۔ ایک ہاتھ سے دو ہاتھوں کا کام لینا پڑے گا۔ چیزوں کو دس مختلف الگ الگ انگھوں سے دیکھنا پڑے گا اور دوسرے کی سوچ پلٹنے کے ہنر میں ماہر ہونے پڑے گا۔ کیا تم اس سب کے لیے تیار ہو؟“

”نہیں میڈم!“ اس نے ایسے نعرہ لگایا تھا جیسے فوجی پریڈ میں کھڑی ہو۔

ایک ماہ اس نے کڑی محنت کی تھی۔ وہ واقعی کورا کاغذ تھی۔ اس پر کچھ بھی لکھا جاسکتا تھا۔ پھر اس نے اس پر لکھ لیا۔ ”جادو.....“

ابھی تک اس کی زندگی میں کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔ کوئی منزل ہی نہیں تھی۔ وہ آگ کی فوڈی کی طرح بلا مقصد ہی دنیا میں دائیں بے بائیں گھوم رہی تھی۔ لیکن اب جب اسے ایک واضح ہدف نظر آنے لگا تھا تو وہ بڑی پر جوش ہو رہی تھی۔

یہ اچھا ہے کہ جب آپ سے ملے نہ ہو سکے کے زندگی کیسے گزارنی ہے؟ زندگی میں کیا کرنا ہے؟ اپنے الگ راستے کیسے بنانے ہیں۔ تو بہتر ہے کہ کسی دوسرے کے بنائے راستے پر ہی چل لیں۔ یہ نہ چلنے سے ہمت ہار کر بیٹھے رہنے سے بہر حال اچھا ہوتا ہے۔ زندگی آسان ہو جاتی ہے اور زندگی زندگی بھی

لگنے لگی ہے۔

☆☆☆

پارٹی اوپن ایریا میں ہو رہی تھی۔ باغ پھولوں اور روشنیوں کے فغوں سے سجایا گیا تھا۔ باغ کے درختوں کے نیچے منشی رنگ کی روشنیاں جلائی تھیں۔ جنہوں نے اندھیرے میں پام کے کاغذی رنگ میں ڈوبے بڑے بڑے پتوں کو ایک نئی اور اچھوتی شکل دی تھی۔ لالے کے سفید پھولوں گلدستے جا بجا رکھے ہوئے تھے۔ منشی اور سفید ملاپ والی یہ پارٹی حمدان کی طرف سے اس دوستوں اور کالج کے کلاس فیلوز کے لیے تھی۔ جہاں تھوڑی سے کوشش اور گاڑی کی بہت سی منتوں کے اسے جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

جب وہ اپنی سیاری تیاری کر کے وہاں پہنچی پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ رنگ اور خوشبوئیں، فوغیز کی طرح سلیقے سے چاروں طرف پھیلی ہو تھیں۔ میوزک کا شور تھا لیکن یہ شور بھی سمندر لہروں کی طرح کالوں کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا جس سے پارٹی دینے والا کا ذوق جھٹک رہا تھا۔ طرف باوقار گہما گہما تھی اور اس گہما گہما میں وہ

والی کشش رکھنے والا میزبان ان سب کے درمیا کھڑا..... میزبان ہوتے ہوئے بھی مہمان د ہاتھ میں مشروب کا جام تھا اسے مسکرا رہا تھا۔ با کرتے ہوئے دونوں چیزیں جھٹکنے کو بے تا ہو جاتی تھیں۔ جام میں سے مشروب اور اس ہونٹوں سے پھول.....

اچانک تیز آواز سے چلتا میوزک ایک دم رکا تھا اور پھر اگلے ہی پل ساری لائٹس آف گئی تھیں۔ اندھیرا چھایا جانے پر لڑکے لڑکیوں مشترکہ ”ہو.....“ کی گئی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ حمدان نے اپنا خالی جام کے تھال میں رکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ ”میں ابھی دیکھتا ہوں سر!“ دیگر گہما گہما تھا اور تب ہی میوزک والے آواز پر روشنی ہوئی

ایک..... ہال نے تالیاں بجائی تھیں۔ برہا گھوٹی تھی اور جب سیدھی ہوئی تھی تو اس کے ہاتھ میں مشروب کی ایک بند بوتل تھی۔ جسے اس نے وہاں ہی کھول کر چھ اوپر تلے دھڑے جاموں پر کھڑے کھڑے ہی اٹھایا شروع کر دیا تھا۔ پہلے سب سے اوپر والا جام بھرا تھا۔ پھر اس سے چھلک کر نیچے والے دو جام بھرے تھے اور پھر باقی کے تین..... اس نے سب سے اوپر والا جام اٹھایا تھا اور ایک ادا سے چلتی ہوئی حمدان کے پاس گئی تھی۔ حمدان نے مسکراتے ہوئے وہ جام اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔

برہانے اس کا دوسرا ہاتھ تمام کرا سے اپنے سر کے اوپر کیا تھا اور پھر اسے پکڑے گھومنے لگی تھی۔ جمع یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ کوئی رقص نہ تھا۔ بلکہ اس کے فن کا بیک پوائنٹ تھا۔ اس کے لباس سے پھولوں کی پتیاں بھرنے لگی تھیں۔ سب لوگ پھر سے حیرت میں مبتلا ہوئے تھے اور اس نے کرتب سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

حمدان چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے متاثر کر دیا تھا۔ وہ گھومتی تھی اور پھر گھومتی ہی رہی تھی۔ اس کے گلابی گھیر وار فراک سے پھولوں کی پتیاں بھرتی جارہی تھی۔ چھڑتی جارہی تھیں۔ ایسے جیسے ہال میں پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ میوزک والے نے میوزک آن کر دیا تھا اور سارا ہال میوزک کی لے پر اور اس کے چکر پر تالیاں بجانے لگا تھا۔ میوزک، تالیاں، چکر اور گرتے پھول..... ایسا سارے بندھے چکا تھا کہ فضا بھی رک رک کر اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

حمدان کیسے نہ اپنی پلکیں جھٹکنا چاہتا..... وہ گھومتی جارہی تھی، گھومتی جارہی تھی۔ پھول جھڑتے جا رہے تھے۔ اتنی پتیاں اس نے اپنے لباس میں کہاں پوشیدہ کر رکھی ہوئی تھیں کہ وہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں اور وہ بھی دیوانگی سے گھومتی جارہی تھی۔ رکنا تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔

جب حمدان نے ایک جھٹکے سے اس کا کندھا تمام کر لیا..... روشنی..... جو اسٹیج کے درمیان میں..... سرف برہا پر ہی بڑی تھی۔ سب نے بے باک..... مسر حمدان.....“ برہانے مائیک پر حمدان کا اشارہ کیا تھا۔ حمدان نے رخ موڑ کر اس کی طرف لگا تھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

برہا کرائے کے ایک جھٹکے اور نفیس لباس میں..... برہا حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنے سے پہلے اس نے خود پر اور اپنے ہاتھوں پر خوب جان ماری تھی۔ میک اپ اس نے..... لیا تھا کیونکہ اس کے پاس جو میک اپ تھا..... امریکا کے جھٹکے پارلوں میں ہی دستیاب تھا..... تاہم اس کے پاس کوئی فراک نہیں تھی۔ اس نے اپنا فراک برہا کو کرائے پر لینی پڑی تھی۔

”مسٹر کیرن.....“ یہ آپ کے لیے۔“ برہانے لہا تھا اور اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے پاس لاکر..... پیار سے اور مدھرتا سے ایک پھونک ماری تھی۔

نہری برادہ، افشاں کی ایک لہر اس کے ہاتھ کی کانوں کی پروں سے اس کی پھونک کے زور اثر اٹھی تھی اور فوس بنائی، سرور کی لے گزرتی، اڑتی رہی حمدان تک گئی تھی۔ جمع حیرت سے ایک لمبی سی..... کر کے رہ گیا تھا۔ اس کے پہلے ہی کرتب..... سب کی بصیرت کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گردنیں..... مڑ کر پتھر کی ہو گئی تھیں۔ رخوں نے رخ بدلنے..... انکار کر دیا تھا۔

حمدان نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے تھے اور..... اسے دیکھنے لگا تھا۔

پھر برہانے اپنے ہاتھ کو گھما کر پرے پھٹکنے..... انداز میں کوئی چیز چھٹی تھی۔ ایک شیشے کا گلاس..... انہاں سے نکل کر فرش پر زور دیک گیا تھا اور..... کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے..... لہو جھٹکا دیا تھا۔ دوسرا جام نکلا تھا۔ پھر تیسرا..... جام کے جام نکلتے رہے تھے اور ایک پر ایک..... باتے تھے۔ تین کے اوپر دو اور دو کے اوپر

ایک..... ہال نے تالیاں بجائی تھیں۔ برہا گھوٹی تھی اور جب سیدھی ہوئی تھی تو اس کے ہاتھ میں مشروب کی ایک بند بوتل تھی۔ جسے اس نے وہاں ہی کھول کر چھ اوپر تلے دھڑے جاموں پر کھڑے کھڑے ہی اٹھایا شروع کر دیا تھا۔ پہلے سب سے اوپر والا جام بھرا تھا۔ پھر اس سے چھلک کر نیچے والے دو جام بھرے تھے اور پھر باقی کے تین..... اس نے سب سے اوپر والا جام اٹھایا تھا اور ایک ادا سے چلتی ہوئی حمدان کے پاس گئی تھی۔ حمدان نے مسکراتے ہوئے وہ جام اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا تھا۔

برہانے اس کا دوسرا ہاتھ تمام کرا سے اپنے سر کے اوپر کیا تھا اور پھر اسے پکڑے گھومنے لگی تھی۔ جمع یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ کوئی رقص نہ تھا۔ بلکہ اس کے فن کا بیک پوائنٹ تھا۔ اس کے لباس سے پھولوں کی پتیاں بھرنے لگی تھیں۔ سب لوگ پھر سے حیرت میں مبتلا ہوئے تھے اور اس نے کرتب سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

حمدان چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اسے متاثر کر دیا تھا۔ وہ گھومتی تھی اور پھر گھومتی ہی رہی تھی۔ اس کے گلابی گھیر وار فراک سے پھولوں کی پتیاں بھرتی جارہی تھی۔ چھڑتی جارہی تھیں۔ ایسے جیسے ہال میں پھولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ میوزک والے نے میوزک آن کر دیا تھا اور سارا ہال میوزک کی لے پر اور اس کے چکر پر تالیاں بجانے لگا تھا۔ میوزک، تالیاں، چکر اور گرتے پھول..... ایسا سارے بندھے چکا تھا کہ فضا بھی رک رک کر اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

حمدان کیسے نہ اپنی پلکیں جھٹکنا چاہتا..... وہ گھومتی جارہی تھی، گھومتی جارہی تھی۔ پھول جھڑتے جا رہے تھے۔ اتنی پتیاں اس نے اپنے لباس میں کہاں پوشیدہ کر رکھی ہوئی تھیں کہ وہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں اور وہ بھی دیوانگی سے گھومتی جارہی تھی۔ رکنا تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔

جب حمدان نے ایک جھٹکے سے اس کا کندھا تمام کر لیا..... روشنی..... جو اسٹیج کے درمیان میں..... سرف برہا پر ہی بڑی تھی۔ سب نے بے باک..... مسر حمدان.....“ برہانے مائیک پر حمدان کا اشارہ کیا تھا۔ حمدان نے رخ موڑ کر اس کی طرف لگا تھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

برہا کرائے کے ایک جھٹکے اور نفیس لباس میں..... برہا حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنے سے پہلے اس نے خود پر اور اپنے ہاتھوں پر خوب جان ماری تھی۔ میک اپ اس نے..... لیا تھا کیونکہ اس کے پاس جو میک اپ تھا..... امریکا کے جھٹکے پارلوں میں ہی دستیاب تھا..... تاہم اس کے پاس کوئی فراک نہیں تھی۔ اس نے اپنا فراک برہا کو کرائے پر لینی پڑی تھی۔

”مسٹر کیرن.....“ یہ آپ کے لیے۔“ برہانے لہا تھا اور اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے پاس لاکر..... پیار سے اور مدھرتا سے ایک پھونک ماری تھی۔

نہری برادہ، افشاں کی ایک لہر اس کے ہاتھ کی کانوں کی پروں سے اس کی پھونک کے زور اثر اٹھی تھی اور فوس بنائی، سرور کی لے گزرتی، اڑتی رہی حمدان تک گئی تھی۔ جمع حیرت سے ایک لمبی سی..... کر کے رہ گیا تھا۔ اس کے پہلے ہی کرتب..... سب کی بصیرت کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ گردنیں..... مڑ کر پتھر کی ہو گئی تھیں۔ رخوں نے رخ بدلنے..... انکار کر دیا تھا۔

حمدان نے سینے پر ہاتھ باندھ لیے تھے اور..... اسے دیکھنے لگا تھا۔

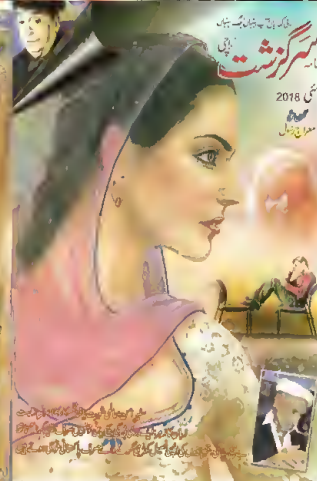
پھر برہانے اپنے ہاتھ کو گھما کر پرے پھٹکنے..... انداز میں کوئی چیز چھٹی تھی۔ ایک شیشے کا گلاس..... انہاں سے نکل کر فرش پر زور دیک گیا تھا اور..... کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے..... لہو جھٹکا دیا تھا۔ دوسرا جام نکلا تھا۔ پھر تیسرا..... جام کے جام نکلتے رہے تھے اور ایک پر ایک..... باتے تھے۔ تین کے اوپر دو اور دو کے اوپر





# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA



اسے روکا تھا۔ وہ جھپکے سے رکی تھی۔ میوزک تھم گیا تھا۔ تالیاں رک گئی تھیں۔ پھول جھڑنا بھی بند ہو گئے تھے۔ فضا بھی رک گئی تھی۔

”انتے پھول.....؟ انتے پھول تو جن میں بھی ایک ساتھ نہیں کھلتے۔“ حمدان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ برہا مسکرائی تھی۔ وہ خوش ہوئی تھی اور ہنسنے لگی تھی۔ اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔

”کیا اس پھول کو میں اپنے گلہستے میں لگا سکتا ہوں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ جبکہ جواب وہ جانتا تھا۔ ”اس پھول نے آپ ہی کے لیے خود کو خوش رنگ بنایا ہے مسٹر.....“ برہا فقرہ ممل ہی کرنے لگی تھی کہ حمدان نے اس کے لبوں پر اپنی انگلی رکھ دی۔

”صرف حمدان.....“ حمدان نے کہا تھا۔ ”میری ٹیم کے لوگ مجھے صرف حمدان کہتے ہیں۔“ برہا مسکرائی تھی۔

اس محفل کے ایک اندھیرے کونے میں کھڑی حمدان کی دوست ”ملیسا“ یہ سب دیکھ رہی تھی اور اپنی آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ برہا کے فن کی وجہ سے نہیں بلکہ حسد کی وجہ سے..... اس کی آنکھوں میں جلن کا سیاہ خون اترنے لگا تھا۔ جب سارے منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کا صبر جواب دے گیا تو اس کے ہاتھ میں موجود جام خود اس کے ہاتھ میں ہی ٹوٹ گیا اور اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ لیکن کمال ہمت تھی اس میں کہ اس نے آہ بھری نہ سسکی لی اور جو لوگ یہ دونوں کام نہیں کرتے..... پھر وہ کچھ انوکھا ہی کر کے دکھاتے ہیں۔

☆☆☆

برہا کی پہلی تنخواہ جو ملے پائی تھی۔ وہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھی اور اتنی کم بھی نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ پہلی تنخواہ آنے والے بہت سی لکڑی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ لکڑی..... فن کی بھی، کام کی بھی، ذات کی بھی اور پھر پیسوں کی بھی..... اسی میں سے اب وہ ترقی کرے گی۔ وہ چائنا کے آدی کا قول

ہے ناں کہ..... ”بے وقوف ہے وہ لوگ جو نوکر کر کے دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔“ تو وہ بھی اب کسی کا کام نہیں کرے گی بلکہ کام کرے گی۔ اپنی محنت سے کسی کو ترقی نہیں دے بلکہ خود کو ترقی دے گی۔

ان کا پہلا شیلنگی میں تھا۔ جس کی آٹھ افرا مشکل ٹیم نے بھر پور تیاری کی تھی۔ لمبی میز چیلر طے کرتے برہانے بھی ان کے قدموں سے قدم ملا دیے تھے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ لوگوں برہا کے قدموں سے قدم ملانے کو اپنی جگہ جانا جن میں سے ایک کا نام ملیسا تھا۔ وہ حمدان کی دوست بھی تھی اور ہیلپر بھی..... برہا کے حسن، اس نزاکت، اس کی معصومیت سے جلنے کے علاوہ اس کے پیچ و تاب کھانے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی حمدان نے صندوق والے کرتب میں برہا کو بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ صندوق والا ایک ملیسا ہی کرتی تھی۔ حمدان نے یہ ایکٹ برہا کو لیے دیا تھا کیونکہ برہا بھی ان کی ٹیم میں ہی تھی اور مشکل کرتب سنبھال نہ سکتی تھی۔ لیکن حسد کی آگ جلتی ملیسا نے برہا کو غلط رنگ میں لیا تھا۔

برہا اس قدر محنتی ہو چکی تھی اور اپنے کام کو قدر جان لگا کر سمجھ کر کرتی تھی کہ وہ خود ہی اپنے جگہ بنائی چلی گئی تھی۔ وہ حمدان کی امیدوں پر اتری تھی اور پہلے ہی شو میں اس نے اپنا آپ ٹا کر دیا تھا۔ برہانے صندوق میں بند ہونا تھا اور اس نے اسی صندوق میں پانچ تلواریں گھسائی تھیں جیسے ہوئی لکڑی کی پرتوں کو نکال کر محفوظ ہو کر جانا تھا اور انہیں پرتوں سے نکل کر تلواریں مڑنا جانا تھا اور برہا کو کچھ نہیں ہونا تھا۔ ظاہری ہے کہ پھر برہانے خیریت سے باہر نکل آنا اسی کا نام تو جادو تھا۔

دوسرا کرتب ملیسا کے ساتھ تھا۔ وہ تبدیل کرنے کا تھا۔ ایک منٹ میں پندرہ

..... باہری لباس کے اندر ہی پندرہ اور لباس..... ہوتے تھے۔ حمدان اس کے سامنے کپڑا لہراتا تھا اور ملیسا کمال مہارت سے ایک ایک لباس ادا کرتی جاتی تھی۔ یہ کرتب بھی بہت جان دار تھا اور بہت شائقین بھی بہت متاثر ہوئے تھے۔

ایک ہفتے کے اندر اندر انہوں نے ایک ہی شہر میں مختلف جگہوں پر دس شو کیے تھے۔ کچھ شوز بچوں کے اسکولوں میں کیے گئے تھے اور کچھ ہسپتالوں میں۔ ایک جو لمبی بیماریوں کی وجہ سے عرصوں سے ہسپتال کے..... ایک بیڈ پر پڑے ہوئے زندگی کی باتوں سے محروم تھے۔ ان کے لیے بہت سی این جی ایس شوز مشفقہ کروائی تھی تاکہ انہیں زندگی کی بات کا احساس ہو..... ان کی اندر بیماری سے لڑنے کی طاقت آئے۔ ان کا تو یہاں نہیں لیکن برہا میں بہت طاقت آچکی تھی۔ اسے زندگی کی قیمت کا اب احساس تھا۔ جب اس نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو شوز خوشی سے تالیاں بجاتے دیکھا تھا اور پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ ان میں سے کئی بچے ڈیڑھ ڈیڑھ سال سے وہاں ہی تھے۔ ایک دن بھی اپنے گھر نہیں آتے تھے۔

”ہم خدا کے کس قدر ناشکرے ہیں۔ ہم خدا پر نعمت کو جھٹلاتے ہیں۔ ہر نعمت کو نظر انداز کرتے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی مشکل کو پہاڑ بنا کر اپنے سینے وار کر لیتے ہیں۔“ وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔

ایک شو انہوں نے جیل میں بھی کیا تھا۔ جیل قیدیوں کے لیے..... جہاں جا کر زندگی کی اصل بات کا احساس نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک ایک پل کی بات سے کروڑوں ڈالر کی تھی۔

ان کے لپک دار رویے کی بدولت این جی او انہیں مستقل طور پر باہر کر لینا چاہا تھا۔ جس کی آمدنی دے دی تھی۔ کام کے پیسے اگرچہ انہیں پھر بھی ٹیم بہت خوش تھی۔ این جی او نے انہیں اپنے کام کی شروعات کی تھی۔ جس پر وہ ان دنوں ہاتھ چاہتے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ

جیسے ہی ان کی این جی او ترقی کرے گی۔ ان کے پیسے بھی بڑھا دیے جائیں گے۔ حمدان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

”کامیابی کے دوسب سے اہم اصول ہی یہ ہیں۔ خطرہ اور بھروسہ..... اگر ہم کسی پر بھروسہ ہی نہیں کریں گے تو ہماری کوششیں پلٹ پلٹ کر ہم تک ہی آجائے گی۔ ہم ایک کمرے میں بند ہو جائیں گے۔ تاریک کمرے میں.....“ اس نے کہا تھا۔

دس دنوں میں پندرہ شو کر کے ساری ٹیم ہی تھک گئی تھی اور اب آرام چاہتی تھی۔ حمدان نے آخری شو کر کے ایک ہفتے کی چھٹی کا اعلان کر دیا تھا اور قافلہ واپس اپنے شہر، اپنے اپنے گھروں کو چلنے کو تیار ہو گیا تھا۔

برہا خوش خوش اپنا سامان پیک کرنے لگی تھی کیونکہ بہت دن ہو گئے تھے اسے ریکی اور کبھی سے ملے ہوئے۔ اس نے دونوں کے لیے بہت سی چیزیں بھی اکٹھی کر لی تھیں۔ خیال تو اسے جیڈ کا بھی آیا تھا جسے اس نے ٹال دیا تھا۔ لیکن پھر ایک دکان کے آگے سے گزرتے ہوئے اسے ”پی پی“ والا کھلونا نظر آیا تو وہ اس نے جیڈ کے لیے لے لیا۔

”بجایا کر بیٹھی کو سستا گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے سوچنے لگی تھی۔ ”اور پھر ایک دن یہ تھی غصے سے جیڈ کے سر پر کچھ دے مارے گی۔“ سوچ کر ہی وہ خوشی سے اچلی۔

حمدان پیک کرنے ابھی وہ راہداری سے گزر رہی تھی۔ جب کوئی اس سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ ملیسا تھی۔ جس کے ہاتھ میں چھوٹا چھوٹا میک اپ کا سامان تھا۔ جو میک اپ کا کام اور کسی سرجری کا سامان زیادہ لگ رہا تھا۔ خیر سے ملیسا میک اپ کرتی بھی اتنا تھی کہ اس کی امی تک اسے پہچاننے سے انکار کر دیں کہ یہ ان کی بیٹی ہے ہی نہیں۔ ٹکرانے سے وہ سارا سامان سرجری ہونے کی کارپٹ چھٹی راہداری پر گر گیا تھا۔ ”سوری ملیسا!“ وہ کہہ کر اس کا سامان اٹھانے کے لیے چلی گئی۔ لیکن ملیسا نہیں جھکی تھی۔ اس نے



اس اکیلی کوئی اپنا نوکر سمجھتے ہوئے سامان اٹھانے دیا تھا۔

”یہ لو.....“ برہا سامان اسے واپس پکڑا رہی تھی اور ملیسا سامان کے بجائے اسے دیکھ رہی تھی۔  
”بہت اسارٹ بھرتی ہو خود کو.....“ وہ آنکھوں میں طفر سے پردے سوئیاں چھونے والے لہجے سے پوچھ رہی تھی۔  
”کیا مطلب ملیسا.....؟“ برہا واقعی ہی کچھ نہیں سمجھتی تھی۔

”یاد رکھنا..... جب کوئی اور آ جائے گا تب تم بھی میری طرح ایک کونے سے لپک جاؤ گی۔“  
سامان پکڑتے ہوئے ملیسا نے بڑی جھکی بات کی تھی۔ برہا نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔  
”نہیں ایک ماہ ہو گیا ہے ساتھ کام کرتے ہوئے۔ تم ابھی تک مجھے قبول نہیں کر سکی ہو؟“ ملیسا نے ناں میں گردن ہلاتی تھی۔

”مجھے کروں گی بھی نہیں۔“ اور کہتے ہوئے تن کر چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ برہا گہرا سانس بھر کر واپس اپنے کمرے میں آ کر پیٹنگ کرنے لگی۔ ری کی کو اس نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ کل وہ واپس آ جائے گی۔ کیتھی کو اس نے کال کی تھی لیکن کیتھی نے رسیو کرتے ہی کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ بڑی ہے۔ وہ اس کے ”بڑی“ کا سر پھوڑنے کا انتظام کر کے آرہی تھی۔

ری کی کیتھی کے پاس رہ رہی تھی اور ان دونوں کا سارا سامان بھی کیتھی کے گھر ہی تھا۔ لیکن جوں ہی برہا کو اپنے پہلے دس شوز کے پیسے ملے اس نے ری کی کو پیسے دے کر کہا تھا کہ وہ فلیٹ کے مالک کا کرایہ اس کے منہ پر..... نہیں ہاتھ میں تھمائے کیونکہ انہیں ابھی فی الحال وہاں ہی رہنا تھا۔ ری کی سامان لے کر واپس اپنے فلیٹ میں چلی گئی تھی۔ اب اگلے دن اسے بھی وہاں ہی جانا تھا۔

رات کو وہ سوئے گی تو نچانے کیوں ملیسا کا فقرہ کمرے میں اندھی چگاڑی تک چک پھیریاں

لینے لگا تھا۔

”جب کوئی اور آ جائے گا تب تم بھی میری طرح ایک کونے سے لپک جاؤ گی۔“  
”ایسا ابھی نہیں ہو گا ملیسا میڈم“ اس نے

عزم سے سوچا تھا۔ بہت سا وقت اس نے زندگی میں فضول میں گزار دیا تھا۔ اب برہا کی جگہ لینا آسان نہیں تھا۔ ہمت والے کسی بھی انسان کو بے ہمتا کر دینا آسان نہیں ہوتا..... جو بے ہمتا ہو جاتا ہے وہ اصل میں شروعات میں بھی ہمت سے کام نہیں لے رہا ہوتا۔ صرف ہمت کا مظاہرہ کرنے کی اداکاری کر رہا ہوتا ہے۔

اس ایک ماہ میں ان کے گروپ نے چالیس شوز کیے تھے۔ مختلف تھیٹر میں اور ہوٹلوں میں، بڑے اور چھوٹے شو۔ ساری ٹیم پر سکون سوار تھی۔ سوا برہا کے..... وہ جیسی اپنی زندگی کی ماضی کی قوت کی حالت میں لے آئی تھی۔ فارغ وقت میں وہ گزرتے جادو گروں کی جادوئی کرتب پر ٹیوب پر نکال کر دیکھ رہی تھی۔ لائبریری سے ان کی کتابیں لانی تھی انہیں بغور پڑھتی تھی۔ اب زندگی نے اس کے لیے اگر جادو کی فیلڈ کوچن لیا تھا تو وہ بھی اس میں ناکام نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اب وہ اس میں ہی نام بننا چاہتی تھی۔ پیسہ نہیں.....

☆☆☆

حمدان خود ابھی جدو جہد نامی ایسی شاہراہ گزر رہا تھا۔ جہاں تیزی سے بھاگنے والوں کی تھی۔ ایسی بھیڑ جس میں راستہ بھی تلاش کرنا ہوتا اور سب کو پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے بھی نکلنا ہے۔ وہ خود ابھی کوششیں کر رہا تھا۔ اپنا نام اجا کرنے کی، اپنے کام سے شہرت پانے کی۔ وہ دور میں رہ رہا تھا جہاں ہر کوئی ہی ٹیلنڈ ہے۔ موقع کی تلاش میں ہے۔ ایسے میں کم ٹیلنڈ والے کو کون پوچھتا ہے۔ موقوفے سے پہلے اسے فوجی کی طرح مشقیں کرنی تھی اور ہمہ وقت تیار تھا۔ زندگی کی جنگ کا طبل نہیں بجاتا..... وہ جانتا

ابھی سحرا میں پھول اُگانے، دریا میں جزیرہ بنانے، پہاڑ پر قطعہ تلاش کرنے، ہوا میں گراہ بننے، پانی کو قالب میں ڈھالنے کا نام ہے۔ یہ بھی معلوم تھا۔

جادو سے اس کا لگاؤ بچپن سے ہی تھا۔ پہلے وہ چھوٹے موٹے کرتب کر کے اپنے کلاس فیلوز کو حیران کیا کرتا تھا۔ وہ ہر روز کچھ نیا کیکھنا چاہتا تھا۔ انہیں بھی وہ کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے ان ہی باتوں میں مصروف رہتا تھا۔ پھر اسکول میں اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی کہ رزلٹ کے موقع پر پرنسپل نے اسے کہا تھا کہ وہ سب کے سامنے اپنے کرتب دکھائے۔ یہ اس کا پہلا اسٹیج تھا۔ جس کے بعد جادو میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی تھی۔ وہ پیسے جمع کر کے نئے سے شوز دیکھنے چلا گیا کرتا تھا۔ تی۔ دی پر ایسا لوٹی پروگرام مس نہیں کرتا تھا۔ لائبریری سے وہ جادو کی کتابیں لا کر پڑھتا رہتا تھا۔ ”ہیری ہودی نی“ کو وہ خاص طور پر پسند کرتا تھا۔ اس کے بارے میں بننے والی ساری فلمیں اس نے کی کئی بار دیکھ رکھی تھیں اور اس کے بارے میں شائع ہونے والی تقریباً ہاری ہی کتابیں اس کے پاس موجود تھیں۔ وہ انشوری طور پر ہیری ہودی نی کا مین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایسے ہی اپنا استاد سمجھتا تھا اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس وقت امریکا کا تقریباً ہر جادوگر ہی ہودی نی کو کاپی کر رہا تھا جبکہ وہ تو صرف اس سے ناظر تھا۔

پھر بہت کوششوں کے بعد اسے ایک چھوٹے جادوگر ٹائیجیل کے ہیلپر کی جاب مل گئی تھی۔ ان دنوں ایسے دور سے گزر رہا تھا جس سے جادوگر خود گزر رہا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے شوز کرتا تھا اور شہور ہونے کی کوششوں میں تھا۔ حمدان کا کام وہ اس سے بہت خوش ہوا تھا۔ حمدان حقیقی طور پر جادوگر تھا بلکہ اس کے لیے بخنتی کا لفظ کم تھا وہ اس لیے جنونی بننا چاہتا تھا۔  
”کامیابی کے لیے شدت چاہیے، دیوانگی نہیں

کیونکہ دیوانگی اندھیرے کا دوسرا نام ہے اور شدت جوش کا۔ تم جوش میں کام کرو، اندھیرے میں نہیں۔“  
ٹائیجیل نے ایک دن اسے خوب صورت نصیحت کی تھی۔ حمدان پر سکون ہو گیا تھا۔ جیسے دکتی چٹان پر کسی نے دریا کا میٹھا پانی بہا دیا ہو۔

”جیسے جیسے ہم محنت کرتے جاتے ہیں۔ ہماری کامیابی کا گراف بڑھتا جاتا ہے۔ قدرت ہمیں کچھ زیادہ دینی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یاد رکھنا..... ایسے موقع پر ضد کرو گے تو وہی چھوٹی والی کامیابی مل جائے گی۔ صبر کرو گے، کوشش کرو گے تو بڑی والی کامیابی تک پہنچ جاؤ گے۔ جو راستے کی ساری ٹھکن اتار دے گی۔ میں نے ضد کی تھی۔ تم نہ کرنا۔“ حمدان کے لیے ان کی نصیحتیں زمر، یا قوت سے بھی بڑھ کر تھیں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے اپنا سب کچھ حمدان کو دے دیا تھا۔ جو کسی اور کے کام کا تھا بھی نہیں۔

یہ انہی کا پھیلا یا ہوا جال تھا جس پر حمدان اب مزید گرہیں ڈالتا چلا جا رہا تھا۔  
وہ شہر شہر جا کر مختلف شوز کر رہا تھا۔ کچھ کم پیسوں کے عوض اور کچھ بے حد کم پیسوں کے عوض۔ بہت سی این جی اوز، آرٹ کونسلوں، ہوٹل کے ساتھ وہ منسلک تھا۔ لیکن ابھی وہ اتنا مشہور نہیں ہوا تھا شاید اس کے فن میں کیاں تھیں یا اسے ابھی بہت کچھ سیکھنا تھا کہ ایک دم سے وہ راتوں رات کامیاب یا دولت مند نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

شو شروع ہو چکا تھا۔ مدھم میوزک کے ساتھ پردے اٹھ چکے تھے اور شور بلند ہوا تھا۔ یہ بلند شور اس بات کا اشارہ تھا کہ حمدان کی شہرت اب دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اسٹیج پر پہلے سے موجود ایک صندوق کے دائیں طرف وہ کھڑی تھی اور بائیں طرف حمدان۔

حمدان نے شو کا آغاز کیا تھا۔ اسٹیج پر پڑے صندوق کو چاروں طرف سے عوام کو دکھایا تھا۔

صندوق خالی تھی پھر اس صندوق میں حسب معمول برہانہ گئی تھی اور صندوق کا مقفل کر دیا گیا تھا۔ اندر جاتے ہی اس نے صندوق کی اطراف میں سے لٹری لٹی چھپی ہوئی پرتیں نکالی تھیں اور اندر بیٹھی سیب کھانے لگی تھی۔ روئین اس قدر مصروف ہو چکی تھی کہ اب اس طرح ہی کھانا پیا جاسکتا تھا۔ دوسرا اب وہ اس صندوق کی کافی حد تک عادی ہو چکی تھی۔ پہلی بار والا ڈرنکل چکا تھا۔ حمدان اپنے کام کا ماہر تھا اور وہ اپنے..... اسے پتا تھا کتنی دیر لگے گی اور اسے سیب کب تک ختم کر لینا ہے۔

وہ تیزی کی تیزی سے اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔ مسلسل شوق تھا جس میں اسے یمن کرتب میں حمدان کا ساتھ دینا تھا۔ اب اس طرح سے ہی کھانا پیا جاسکتا تھا۔ باہر حمدان اپنے فن کا جادو دیکھ رہا تھا۔ انھی اس نے سیب کی دوسری بائیس ہی لٹی بھی کھائی تھی۔ اس کی گردن کے پیچھے سے گزر گئی تھی۔ اس کی گردن کا ماس چیرنی ہوئی۔ ایک آہ اس کے منہ سے نکلی تھی۔ کیا وہ غلط بیٹھی تھی؟ نہیں وہ تو صحیح طرح سے بیٹھی تھی۔ اطراف کی چھپی ہوئی پرتوں کو بھی اس نے کھول لیا تھا۔ پھر..... پھر یہ کیا ہوا تھا؟

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی اور اپنی گردن کا درو لے کر بیٹھی تھی کہ پھر دوسری تلوار اندر کو آئی تھی اور اس کے بازو کا ماس چیرنی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ درو سے بلبل اٹھی تھی۔ یہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ وہ تو یہ کرتب تقریباً چالیس بار کر چکی تھی۔ پھر اب کیا ہوا تھا۔ اس نے صندوق کو ٹٹولنا شروع کیا تھا اور جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کسی نے اندر کی چھپی ہوئی پرتوں میں بھی سوراخ کر دیے ہیں۔ وہ دم سا دھ کر بیٹھ گئی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ ذنی صندوق میں سے اس کی آواز باہر نہیں جاسکتی تھی۔ خود وہ باہر نکل نہیں سکتی تھی کیونکہ صندوق مقفل تھا اور اگر اس کی آواز باہر جانی بھی تو وہ حمدان کا نام پکارتا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کا شوق خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر تیسری تلوار اندر کو آئی تھی۔ ساری احتیاط

کے باوجود بھی اس کی ٹانگ چھل گئی تھی۔ پھر چوتھی، اور پھر آخری، پانچویں..... پھر چند لمحوں کے بعد ایک ایک کر کے ساری تلواریں باہر نکالی گئی تھیں۔ ہلاکھولا گیا تھا اور صندوق کا ڈھکن پرے ہٹا دیا گیا تھا۔ مجمع و ساموہ اس کی شیخ و سلامت باہر نکل آئے۔ پر پہلے سے ہی حیرانگی سیٹھ ہوئے تھے۔

وہ صندوق سے باہر نکلی تھی۔ چھلے ہوئے بازو، زخمی گردن، خون رستی ٹانگ کے ساتھ۔ ہال میں تالیاں گونگی تھیں اور حمدان اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ وہ وہ دیکھ رہا تھا جو دوری کے باعث ہال میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ برہا کا سارا جسم خون آلود ہو جانے کے لیے تیار تھا۔ اس کے باوجود وہ تن کر کھڑی تھی۔ جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

☆☆☆

وہ درو سے بلبل رہی تھی۔ آنسو نہ نکل رہے تھے اور نہ ہی واپس جا رہے تھے۔ ادیور نے فوراً سے فرسٹ ایڈ باکس نکالا تھا اور اس کی طرف بڑھا تھا۔ سارا کردیران تھا۔ یہ برہانے اپنے ساتھ کیا کر لیا تھا؟ وہ تو یہ ایک کئی مرتبہ کر چکی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں حمدان بھی آ گیا تھا۔ اس نے پروے گر کر ایک لے لی تھی۔ آتے ہی اس نے برہا کو دیکھا تھا۔ درو کے باعث اس کی آنکھوں میں آنے آنسوؤں کو اور پھر اس کی وہی ہوئی سسکیوں کو۔ کسی نے جیسے اس کے دل پر مکا مارا تھا۔ ”کس نے کیا ہے یہ سب..... کس کی کوتاہی ہے یہ؟“ حمدان چلا تھا۔ کوئی کیا جواب دیتا، یہ کسی کی کوتاہی نہیں تھی بلکہ کسی کی سازش تھی اور سازشوں والے کہاں خود سے جرم قبول کرتے ہیں۔

”ادیور.....“ حمدان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ”صندوق ہمیشہ تمہارے پاس ہوتا ہے ادیور!“ ”ہاں..... حمدان..... لیکن یہ سب میں نے نہیں کیا ہے؟ میں نہیں جانتا ہوں کہ اندر والے پرتوں پر کس نے سوراخ کیے ہیں۔ یہ کوتاہی ہے؟“ ”کسی نے جان بوجھ کر کیا ہے۔“ ادیور نے حمدان کی

طرف دیکھا تھا۔ اس کے دیکھنے اور اس کے لہجے نے ”نہان کو بتا دیا تھا کہ غلطی اس کی نہیں ہے۔“ ”یہ کسی نے جان بوجھ کر کیا ہے۔“ حمدان پاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک ایک گوشک سے ایلور ہاتھا۔

”کیا تم سے کسی نے صندوق کی چابی لی تھی ادیور؟“

”نہیں..... مجھ سے کسی نے چابی نہیں لی لیکن بیب بات ہے چابی آج صبح غائب تھی اور جب میں اسے ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ وہ ایک کھٹے بعد پھر سے واپس اپنی جگہ پر موجود تھی۔“ ادیور نے کہا تھا۔

”یعنی مکمل طور پر سازش ہوئی ہے۔“ اس نے پاروں طرف دیکھا تھا۔ سب اس نئے ہوئے واقعے پر حیران تھے۔ صرف ملیسا ہی جو ایک طرف کھڑی تھی۔ چست لباس پہنے، بالوں میں سرخ رنگ کے معنوی لہرے لگاتے ہوئے وہ اگلے کرتب کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا کہ برہا کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ کس نے کیا ہے۔ حمدان نے ملیسا کو دیکھا تھا۔

”عجیب بات ہے ناں ملیسا! میں نے آج ہی تمہیں ادیور کی چیزوں سے چھپڑ چھاڑ کرتے دیکھا ہے۔“ حمدان نے اس کے پاس پہنچ کر اس سے کہا تھا۔ سب نے حمدان کی بات سنی تھی اور پھر ملیسا کی طرف دیکھا تھا۔ ملیسا کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے ہی اپنا ہار سنگھار کرتی رہی تھی۔ بالوں کی کس کر پانی بناتے ہوئے اور پھر اسے جھکا دے کر مڑتے

”کیا کہنا چاہتے ہو حمدان؟“

”تم کیا کرنا چاہ رہی ہو ملیسا؟“ ”مجھے شو کی تیاری کرنے دو۔ مجھے نہیں پتا کہ کس نے کیا ہے۔ بلکہ شاید برہانے خود ہی یہ ساتھ کیا ہے۔ تمہاری توجہ حاصل کرنے کے لیے۔“ اس نے اس پر طنز کیا تھا۔ برہا کی آنکھوں

”تمہیں شاید نہیں پتا ملیسا! اندر والا صندوق چیز کا بنا ہوا تھا اور تم شاید یہ بھی نہیں جانتی کہ چیز کو چیر دو تو اس کی خوشبو پورا دن گزرنے کے باوجود باہر سے نہیں جانی۔“ حمدان نے کہا تھا۔ ملیسا چپ ہو گئی تھی۔ پہلی بار وہ گھبراہٹ ہوئی دیکھی تھی۔

”ہاتھ دکھاؤ اپنے ملیسا! حمدان نے کہا تھا۔“

”تم میرے سالوں کے خلوص اور دوستی کا یہ صلہ دے رہے ہو کہ مجھ پر شک کر رہے ہو؟“

”اپنے ہاتھ آگے کر ملیسا!“

”مجھے یقین نہیں آ رہا حمدان! ایک ادنیٰ سی لڑکی جسے آئے ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تم اس کے لیے مجھ پر غمہ ہو رہے ہو۔“

”نہ وہ ادنیٰ ہے نہ تم..... ہم سب برابر ہیں۔ اپنے ہاتھ آگے کر ملیسا!“

”اوہ..... ہم برابر ہیں۔ میرے تین سال کی محنت اور اس لڑکی کے چھ ماہ کے ساتھ کو تم نے برابر کر دیا ہے۔“

”ہاتھ آگے کر ملیسا!“ حمدان نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ ملیسا اس کی شکل دیکھنے لگی تھی اور اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے تھے۔ پھر ناں میں سر ہلایا تھا کہ ایسا تو وہ اپنی جان جانے کے بعد بھی نہیں کرے گی۔ حمدان نے اسے دبوچ کر اس کے ہاتھ تھام لیے تھے، پھر ان پر سے گلوڑا تارے تھے اور اپنی ناک کے قریب کر کے سونگھا تھا۔ پھر ایسی نظروں سے ملیسا کی طرف دیکھا تھا کہ جیسے اسے ملیسا سے یہ امید نہ ہو اور جیسے اس کا اعتماد ٹوٹ گیا ہو۔

”ہاں..... ہاں..... میں نے کیا ہے یہ سب کیونکہ نفرت ہے مجھے اس لڑکی سے۔ پہلے دن سے، میں اسے تمہارے ساتھ، میں اسے ہماری ٹیم میں برداشت کر ہی نہیں سکتی۔“ ملیسا چلائی تھی۔ ساری ٹیم حیران رہ گئی تھی۔ اگرچہ شک ملیسا پر جا رہا تھا لیکن پھر بھی جیسے انہیں توقع نہیں تھی کہ ملیسا یہ سب کام کر سکتی ہے۔

”اب تمہیں اسے ہماری ٹیم میں برداشت

کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ملیسا! کیونکہ آج سے تم ہماری ٹیم میں نہیں ہو۔ تم میری بہت اچھی دوست رہ چکی ہو اس لیے میں پولیس کو نہیں بلاؤں گا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم خاموشی سے ہمیں چھوڑ کر چلی جاؤ۔“

”کیا واقعی.....؟“ ملیسا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ ”صرف اس لڑکی کے لیے.....“ ”اصولوں کے لیے.....“ حمدان نے سختی سے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا تھا۔ ”اب تم جا سکتی ہو۔“

”حمدان.....“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن حمدان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا تھا۔ ملیسا سمجھ گئی تھی کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ غضب ناک نظروں سے اسے اور برہا کو دیکھتے ہوئے وہ باہر جانے لگی تھی۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ اس بات کا بدلہ لے کر رہے گی۔ ٹیم اپنی جگہ پر ساکت کی ساکت تھی۔

”نہ تو اندرونی پرتیں چڑی کی لکڑی کی ہیں اور نہ ہی چڑی کی خوشبو سارا دن ہاتھوں میں بسی رہتی ہے۔ لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ چور کیسے اپنا آپ خود بے نقاب کر دیتا ہے۔“ ملیسا کے جانے کے بعد حمدان نے کہا تھا۔ سب حمدان کی عقل پر دمک رہ گئے تھے۔ ”سب اگلے شو کی تیاری کریں۔“ حمدان نے حکم دیا اور بھیزوں کے چھتے کو جیسے کسی نے آگ لگا دی تھی۔ سب پھر سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

برہا ایک طرف سہی اور ڈری ہوئی بیٹھی تھی۔ درلجہ بہ لجہ بڑھتا جا رہا تھا۔ خون جو جلد کے اندر تھا اب باہر نکل آیا تھا۔ وہ دبی دبی سسک رہی تھی۔ حمدان آہستہ سے چلتے ہوئے اس کے پاس آیا تھا۔ ”مجھے نہیں پتا حمدان! وہ کب مجھ سے اتنی نفرت.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے لیکن حمدان نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”شش..... کوئی بھی وضاحت دینے کی

ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا تھا اور پھر اس کے ہاتھ سے مرہم لے لیا تھا۔ جسے وہ ہمت کے باوجود بھی خود پر لگا نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی رہی تھی اور کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کی کون کی خوشبو نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ حمدان نے روٹی پکڑ کر اسے بوتل کے منہ پر رکھ کر گلیا کیا تھا اور پھر اس نم روٹی کو وہ برہا کے زخموں پر لگانے لگا تھا۔ برہا اس کے بارے میں بھاری وجود تلے کسی چھوٹے بچے کی طرح بیٹھی تھی۔ دور کہیں محبت نے اسے مردنگ نکال لی تھی اور اب اس پر بے ترتیب دھڑکنوں نے اپنا اپنا کھیل کھیلنا شروع کیا تھا۔ وہ نمک کے کھلونے کی طرح اس نم روٹی کے باعث ٹوٹ کر گر رہی تھی۔ ڈھسے ہی تو گئی تھی۔ مردنگ کے ٹھٹھے سراٹھے تھے اور سارے عرض و سماں میں پھیل گئے تھے۔ برہا کی آنکھیں پھلکی تھیں۔ اپنے اوپر جھکا وجود اسے کسی دیوتا کا لگا تھا۔ اور وہ اپنی جگہ پر ساکت اس دیوتا کے چروں میں بیٹھ کر تیس نو اس کر رہی تھی۔

وہ اس کے زخموں پر مرہم لگا تا رہا تھا اور برہا نے ایک آنکھ نہیں کی تھی۔ اس کے سارے زخم بھر چکے تھے۔

☆☆☆

شفاف رات میں یاقوت کے سے ستارے آسمان سے اتر کر زمین پر چلے آ رہے تھے۔ زمین بہت بڑے خزانے کی مالک بننے والی تھی۔ ہوا ملک بنی چکی تھی اور اب اپنے زرنگار لباس کی جھکار عالم کو دم ہوش کر رہی تھی۔

برہا نے اپنے زخموں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ہلکے..... دھیرے سے..... جیسے وہاں کچھ تلاش کر رہی ہو اور ہاتھ لگانے سے اس کے کھوجانے بھی ڈر ہو۔ وہ مسکرائی تھی اور پھر سے یادوں کی میں جا پھٹی تھی۔ آج کے دن کی یاد کی تہ میں..... یہ کی سطح پر ٹھہراتا ہوا ایک لمس بڑی مشکل سے اس قید میں آیا تھا۔ حمدان کے ہاتھ کا لمس۔ ”برہا تم ابھی تک سوئی نہیں۔“ ری

لروٹ بدلتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور سامنے ہنڈ آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ لیکن ٹی وی پر اسپورٹس چینل کھلا تھا۔ ری کی جانتی تھی کہ برہا کو اسپورٹس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ”ہاں.....“ برہا چوکی تھی۔

”کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ ری کی فکر مندی سے پوچھنے لگی تھی۔

”کوئی بات؟“ اس نے خود سے پوچھا تھا اور کب سے ہی تو پوچھ رہی تھی۔ کیا بات ہوئی تھی؟ کس بات نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ زخموں پر مرہم لگ گیا تھا لیکن اس کا لمس کیوں نہیں جا رہا تھا۔ اسے یاد صبا چلتی کیوں محسوس ہو رہی تھی جبکہ ابھی تو رات تھی۔ دن کے نکلنے میں وقت تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ مفکر اسے جیت کی خوشی کہتے ہیں اور شاعر اسے کیا کہتے ہیں۔ وہ جانتی تھی۔

”ہاں..... مجھے محبت ہو گئی ہے۔“ برہا نے کہا اور ری نے ”ہائے اللہ“ کہہ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

☆☆☆

جس این جی او کے ساتھ وہ کام کر رہے تھے۔ اسی این جی او کے ساتھ ایک شو انہوں نے معذور بچوں کے اسکول میں کرنا تھا۔ جہاں وہ اس وقت سب موجود تھے اور شو کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسی پہوٹی جگہوں پر تیاری مزید تھکا دیتی تھی کیونکہ وہ اپنے مطلب کی سہولیات ڈھونڈنے میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ ساری ٹیم اسی بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی۔ سوائے حمدان کے جو صحافی کو انٹرویو دے رہا تھا۔

این جی او اپنا ایک میگزین نکال رہی تھی اور اس پہلے شمارے میں انہوں نے حمدان کو خاص جگہ دے رکھی تھی۔ میگزین چھوٹی نوعیت کا تھا اور حمدان سے ہوتا تھا۔ ابھی چھوٹی ہی نوعیت کا تھا۔ سب شو کے لیے اپنی تیاری کر رہے تھے کسی کو اس انٹرویو سے کوئی تپسی نہیں تھی۔ ”آپ اپنی اب تک کی کامیابی کو کس پر فخر

کرتے ہیں؟“ جب صحافی نے یہ سوال پوچھا تھا۔ عین اسی وقت برہا شو کی تیاری کرنی وہاں پر آئی تھی۔ ”محنت پر.....“ میں نے اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی ہے اور کر رہا ہوں۔“ حمدان نے انتہائی سادگی سے جواب دیا تھا اور افراتفری کا شکار برہا ایک دم سے رک گئی۔ ”محنت.....“ میں نے یہ دو الفاظ اسے ساکت کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس کے دل کی کھال سکڑی تھی۔ حمدان کو صرف ”محنت“ اور ”میں“ کا نام نہیں لینا چاہیے تھا۔ وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔ اسے کیا کہنا چاہیے تھا۔ اسے برہا کا نام لینا چاہیے تھا؟ ہاں اسے برہا کا نام لینا چاہیے تھا بلکہ اسے برہا سمیت سب کا نام لینا چاہیے تھا۔ اس کا جاو صرف اس کی مرہون منت نہیں تھا اس میں اس کی ساری ٹیم کا ہاتھ تھا۔ لفظ ”میں“ کافی نہیں تھا۔ ”ہم“ کہنا چاہیے تھا۔ جو بات وہ سوچ رہی تھی وہ یہ بات اس نے بڑے اچھے طریقے سے حمدان کو سمجھا دی تھی۔ شو کے دوران برہا نے عجیب حرکت کی تھی۔

وہ صندوق میں بندھی، بارہا دفعہ کیا ہوا ایکٹ کر رہی تھی۔ حمدان نے تلواریں صندوق کے اندر گھسائی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد باہر نکلی تھیں۔ برہا کو تب باہر نکلتا تھا لیکن وہ باہر نہیں نکلی تھی۔ وہ اندر والے پوشیدہ صندوق میں ہی تھی۔ سامنے تماشاخانے، معذور بچے تھے جو برہا کے باہر نکلنے کے منتظر تھے اور برہا ابھی تک چھوٹے صندوق میں تھی۔ حمدان نے پھر ڈبا بند کر کے کھولا تھا۔ برہا اب بھی صندوق سے باہر نہیں نکلی تھی۔ تماشاخانے پہلے تو اسے کرب ہی کا حصہ سمجھتے تھے لیکن اب ان میں بے چینی بڑھنے لگی تھی۔

برہا تیسری دفعہ بھی باہر نہیں نکلی تھی اور حمدان کے آواز دینے پر اور پکارنے پر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اندر ہی مڑے سے انگوٹھا نکال رہی تھی۔ ”برہا! باہر نکلو۔“ تیسرے بار اپنی جھجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے حمدان نے ہولے سے برہا سے کہا تھا۔ لیکن اس نے کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ وہ باہر نہیں نکلی تھی۔ سامنے بچوں میں سے کچھ بچے ہنسنے لگے تھے۔

چوتھی دفعہ پر حمدان کا غصہ بھی عروج پر تھا۔  
تمنا شانی اب بننے لگے تھے۔ یا نجویں دفعہ کے  
صندوق کھولنے پر وہ باہر نکلی تھی۔ انگوڑ کھاتے ہوئے  
اور تمنا شانی اسے دیکھ دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ  
ہو گئے تھے۔ وہ بچوں کی طرح چوس چوس کر انگوڑ  
کھاتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ حمدان نے اپنی خفت پر بشکل  
ہی قابو پایا تھا۔ اپن جی اوکے اوزنے اسے دیکھا تھا  
اور وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا۔  
”یہ سب کیا تھا برہا؟“ بیک اسٹیج جا کر وہ برہا پر  
وجہ ڈالتا تھا۔ سب نے حمدان کی یہ غصے بھری آواز سنی  
تھی اور وہ اپنی اپنی جگہ پر رک گئے تھے۔ وہ سکون  
سے لباس تبدیل کر کے، اپنا ہنڈ بیگ لے کر باہر  
جانے کے لیے نکل رہی تھی۔ اس نے جیسے حمدان کی  
کوئی بات سنی ہی نہیں تھی۔

”میں پوچھ رہا ہوں کیا تھا یہ سب برہا تم وہاں  
مجھے شرمندہ کیوں کر رہی تھیں۔ صندوق سے باہر  
کیوں نہیں نکل رہی تھیں؟“ اس نے اس کا بازو تھاما  
تھا۔ بات اتنی بھی تو نہیں لیکن اب ساری صورت حال  
نے بڑھا دی تھی۔

”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ تمہاری  
کامیابی کے پیچھے صرف تمہاری محنت کا ہاتھ نہیں ہے  
بلکہ تمہاری ٹیم کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے۔“ اس نے اس  
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا اور اپنا بازو  
چھڑوا کر باہر نکل گئی تھی۔ حمدان جیسے وہاں ہی پھر کا  
بت بن گیا تھا۔

☆☆☆

زندگی ان رنگوں سے مشابہہ تھی جو جب ملتے  
ہیں تو سب سیاہ کر دیتے ہیں۔ آخری رنگ صرف  
سیاہی کا ہی بچتا ہے۔ نام کارنگ، سوگ کارنگ.....  
اس نے تو ویسے بھی اتنی سی عمر میں زندگی کے بہت  
سے رنگ دیکھ لیے تھے۔ پاکستان سے باپ کے  
مر جانے کے بعد وہ جن رشتے داروں کے بار بار  
بلانے پر امریکا آئی تھی انہوں نے اسے رشتے دار کم  
اور نوکرائی زیادہ سمجھ لیا تھا۔ ان کی نوکری کرنے سے

بہتر اس نے ان کا گھر چھوڑ دینے کو سمجھا اور ریگی کے  
فلیٹ میں چلی آئی۔ ریگی کی کہانی بھی اس سے ملتی  
جلتی تھی۔ اسے اس کا شوہراپنے ساتھ پاکستان سے  
لایا تھا اور جو کام وہ اس سے یہاں پر چاہتا تھا وہ ریگی  
مر کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔  
..... برہا تو وہ نہیں سکتی..... لیکن اس نے طلاق ضرور  
لے لی تھی۔ دونوں مل کر کسی نہ کسی طرح زندگی کو  
تھکھٹ ہی رہی تھیں۔ ریگی ٹانگوں کی کمزوری کی  
وجہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ وہ گھر سنبھال رہی  
تھی اور برہا سے باہر سنبھالائیں جا رہا تھا۔ پھر ایک  
دن سب بدل گیا جب وہ فلیٹ تک آئی تو ریگی  
سامان رکھے باہر بیٹھی تھی۔ اس دن کیتھی نے اسے  
زندگی کا نیا راستہ دکھایا تھا۔

اب یہ اس پر تھا کہ وہ اس راستے کو چنتی ہے یا  
مردہ بچے کی طرح ساری زندگی گرداب میں ہی چکر  
لگاتی رہتی ہے۔ اس نے اس رستے کو چن لیا تھا اور  
پھر اس پر چلنا شروع نہیں کیا تھا۔ اب اس پر وہ  
بھاگنے لگی تھی۔ اس نے سخت اور بھرپور محنت نہی تھی۔  
وہ حمدان کے ساتھ ہر شوش جان لگا دیتی تھی۔ ہر شوکو  
اس طرح کرتی تھی جس طرح پہلی بار کر رہی ہو.....  
اگر کامیابی میں صرف اس کا ہاتھ نہیں تھا تو صرف  
حمدان کا بھی نہیں تھا۔ اس لیے اسے حمدان کی بات پر  
ڈکھ ہوا تھا۔ اسے ساری ٹیم کا نام لینا چاہتے تھے۔

گھر آ کر اس نے حمدان کو تنگ کر دیا تھا کہ وہ  
کل کے شو پر نہیں آ سکے گی۔ وہ کسی اور کو اپنی ہیلپر  
لے۔ حمدان کی طرف سے صرف ایک تنگ آیا تھا  
”اوکے“ اور اس تنگ نے اسے مزید تپا دیا تھا۔ اسے  
اسے آمادہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ جیسے خود اس  
جان چھڑوا گیا تھا۔

☆☆☆

تین دن ایسے ہی گزرے تھے۔ وہ اگلے  
کے شو پر بھی نہیں گئی تھی اور نہ ہی اس سے اگلے  
پر..... حمدان کی طرف سے کوئی تنگ نہیں آیا تھا نہ  
فون۔ اس نے اسے نہیں بلایا تھا اور نہ ہی پوچھا

تھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہی۔ برہا کو ہر آن اس کی آمد  
اور اس کے فون کا انتظار رہا تھا۔ آن آن پر اس کی  
ہال جاتی رہی تھی۔ اس نے غصے میں تنگ تو کر دیا تھا  
لیکن جب وہ شو پر نہیں گئی تو سارا دن بے چین رہی  
تھی۔ رات میں بھی حمدان کا کوئی تنگ نہیں آیا تھا۔ نہ  
ہی فون کا بل..... محبت میں ایک یہ ہی تو پریشانی ہے  
کہ یہ اتنا کو ختم کرتی ہے اور یہ ہی اتنا کو جنم دیتی ہے۔  
یہ ظہور بھی ہے اور اسی میں اختتام کی چاہ بھی نہیں  
ہے۔ اس کی اتنا بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ  
ایک ہفتے سے نہیں جا رہی تھی۔ حمدان کی طرف سے  
بھی بدستور خاموشی رہی تھی اور یہ خاموشی اس بات کا  
اشارہ تھی کہ وہ اس کے سنا بھی کام چلا سکتا ہے۔ وہ  
خود کو کوئی پسے خان نہ سمجھے..... اس سے پہلے بھی اس  
کا کام چل رہا تھا۔ اب بھی چل جائے گا۔

”ٹھیک ہے۔“ اسے یہ اشارہ منظور تھا۔ اگر  
حمدان یہ ہی سوچ رکھتا تھا تو وہ اضطراب میں خود کو  
مطلبین رکھنے کی ناممکن کوشش کر رہی تھی۔ ریگی نے  
اس سے پوچھا تھا کہ وہ شو پر کیوں نہیں جا رہی جبکہ وہ  
پنڈون پہلے ہی تو وہ اسے تپا چکی تھی کہ آنے والے  
دن اس کے لیے کس قدر اہم ہیں۔ لگا تار شو ہیں۔  
کوئی ایک بھی چٹائی نہیں ہے۔ پھر جب وہ بالکل ہی  
دلی ہو کر گھر بیٹھ گئی تھی تو ریگی کیسے نہ پوچھتی۔ اسے  
اُڑھتی تھا کہ یہ پھر سے کام چوری پر نہ اتر آئے اور  
انڈس پھر سے فاقوں کو نہ گھر پر مہمان خصوصی کے طور  
پر بلانا پڑے۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے  
بان چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔  
”کس کی..... تمہاری یا تمہارے دل کی؟“  
بی نے معنی خیزی سے پوچھا اور پھر اس کے تئو را کر  
اپنے بر رخ موز لیا تھا۔

گھر کی میں بیٹھے بیٹھے گرم کانی کو شفا کر کے  
نہاؤے ہی اس نے مزید تین دن گزار دیے تھے۔  
یہ اتوار کا روز تھا۔ چھٹی کا روز..... دوسرے  
سے دنوں کی طرح کا اداس سادہ۔ بس ایک

تبدیلی کی بات یہ تھی کہ آج ریگی کی سالگرہ تھی اور  
ریگی اپنے گھر والوں کو یاد کرتے ہوئے بہت اداس  
ہو رہی تھی۔ اگرچہ پیچھے پاکستان میں کسی کو اس کی  
کمانی کے بعد اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ریگی سانس  
بھی ٹھیک سے لے رہی ہے کہ نہیں لیکن پھر بھی وہ  
ڈھینٹا نہیں بھی بھی یاد کر لیتی تھی۔ وہ گھرانے جو  
لڑکیوں کے امریکا جانے کے خیال سے ”توبہ  
استغفار“ کرتے ہیں۔ جب ان ہی لڑکیوں کی کمانی  
امریکا سے گھر میں آتی ہیں تو ان کی ساری ”توبہ  
استغفار“..... ”سبحان اللہ“ میں بدل جاتی ہے اور  
انہیں ایک دم سے اس بات کا اور اک ہوتا ہے کہ  
امریکا سے زیادہ نیک ملک تو لڑکیوں کے لیے کوئی  
اور ہے ہی نہیں۔

حمدان کی بے رخی کو برداشت کرنا اب ناقابل  
برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ شال اوڑھ کر وہ ہوائی کے  
لیے گھر سے نکلی تھی۔ ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ  
واپس جاتے ہوئے ریگی کے لیے ایک اچھا سا ٹیکہ  
لیتی جائے گی۔ کیتھی کو بھی اس نے کال کر کے کہہ دیا  
تھا کہ وہ شام کو آجائے۔

”میں بھی آؤں گا۔“ پیچھے سے جڈ کی آواز بھی  
اسے سنائی دے گئی تھی۔ یعنی ریگی کی سالگرہ اس کے  
لیے ہی ملون بننے جا رہی تھی۔

کافی دیر وہ یوں ہی بلا مقصد سڑکوں پر گھومتی  
رہی تھی۔ موسم دلکش ہو رہا تھا۔ لیکن اسے نہانے کیوں  
اداس کر رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ساری فضا اس کی حق  
میں اپنا آپ سو بچا ہو..... پھر وہ بیکری گئی۔ اس  
نے دل کی شکل کا ایک اچھا سا ٹیکہ خریدا..... بیکری  
سے وہ نکل ہی رہی تھی جب بارش شروع ہو گئی تھی۔  
لیکن ابھی مدھم تھی، اتنی تیز نہیں تھی کہ وہ بھگ جاتی۔  
دکانوں کے باہر بنے شیڈوں کے نیچے سے ہوتی وہ  
آگے بڑھنے لگی تھی جب وہ کسی کو نہ سے نکل کر اس  
کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ برہا کے قدم ملنے کی انداز  
سے رکے تھے۔

سر پر ٹوپی پہنے، سفید ٹی شرٹ کے اوپر نیلی



کھلے بٹن کی شرٹ پہنے اور ڈھیلی ڈھالی سیاہ جینز کے نیچے براؤن دلیوٹ کے شوز۔

اور سے ہونٹوں کو گول کرتا وہ سیٹی بجار ہاتھا۔ ”مالو ما“ کے گانے ”ہولا“ کی اور خود میں ہی گھونٹتے ہوئے جھوم رہا تھا۔

اللہ..... ایسے مرد سے ناراض رہنے کے لیے پہاڑ جیسی مضبوطی چاہیے۔ اس اچانک آمد سے برہا ایک لمحے کو بولکھائی تھی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھل گئی تھی اور اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ جیسے اس نے اسے دیکھا ہی تو نہیں۔

”ہائے“ بھی نہیں کہو گی؟“ اس نے سیٹی روک کر پوچھا۔

”تم ہو کوں؟“ آگے آگے تیزی سے بڑھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

”اچھا..... اتنی ناراضی؟“ وہ پھر سے اس کے آگے آکھڑا ہوا تھا۔ مدھم بارش میں تیزی آنے لگی تھی۔ ایسے دلکش موسم میں وہ اتنا دلکش لگ رہا تھا کہ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ وہ دھڑکنوں کو تو سنبھال نہیں سکتی تھی۔ ایک سنبھال سکتی تھی۔ وہ ہی اس نے سینے کے ساتھ لگالیا۔

”کیوں.....؟ ایک ہیلپر (مددگار) کو ناراض ہونے کا حق نہیں ہے کیا؟“ اس نے لفظ ”ہیلپر“ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس کا ہلکا سا ہنسنے والا لہجہ تھا۔

”تم ہیلپر نہیں ہو، تم ٹیم کا حصہ ہو۔ ہم سب ایک ٹیم کا حصہ ہیں۔“

”تم ٹیم میں نہیں ہو حمدان! ٹیم میں ہم ہیں۔ تم سربراہی میں ہو اور خود کو سربراہ ہی سمجھتے ہو۔“

”یہ بات اس طرح سے بھی ہو سکتی تھی۔ صندوق سے نہ نکل کر تم نے مجھے بے پناہ شرمندگی کروائی ہے۔“

”اور صرف اپنا نام لے کر تم نے میرا بے انتہا دل توڑا ہے۔“ برہانے بے اختیار ہی کہا تھا۔ حمدان کی آنکھیں تباہ کن حد تک سکڑی تھیں۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اللہ..... یہ کیا کہہ دیا تھا

اس نے لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ دل کی طرح اس کی زبان بھی بے اختیار ہو چکی تھی اور اسے آج اس کا اختیار ہونا بھایا تھا۔

حمدان بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برہا کی آنکھوں میں کتنی بھی تو حمدان کی آنکھوں میں چمک بڑھ رہی تھی۔ وہ جادو میں ہی مگن رہا اور کسی کی ذات پر اس کا جادو چل گیا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ کوئی لڑکی اسے چپکے چپکے چاہ رہی تھی اور وہ بے خبر تھا۔ یہ بے خبری کا احساس، یہ کسی کو چاہنے کی چھٹی شرارت کا سا احساس اس قدر دلربا تھا کہ وہ مسکرا اٹھا۔ ہوا تو نہیں چلی تھی لیکن برہا کے بال اڑ گئے تھے اور اس کا تمام چہرہ بالوں کی قید سے آزاد ہو کر سورج بھی کے پھول کی طرح نھنھ کر حمدان کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔

برہا خود کو چھپاتے ہوئے پھر سے آگے بڑھ گئی تھی۔ حمدان چند لمحے دہاں ہی کھڑا رہا تھا لیکن پھر سے بھاگ کر اس تک آیا تھا۔

”مجھ سے غلطی ہوئی..... سو رہی۔“

”تم سے غلطی نہیں ہوئی، تم نے حقیقت بیان کی ہے۔ یہ بات تمہارے ذہن میں بھی جس کا تم نے اظہار کیا ہے۔ اب میرے سامنے سو رہی بول رہے ہو لیکن اندر سے تم اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر دو گے۔ تمہارا ذہن ہمیشہ اسی ڈگر پر رہے گا۔ تم ہمیشہ یہ سوچو گے کہ تمہاری کامیابی صرف تمہاری وجہ سے ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ تم میرے ذہن کی ڈاکٹر مت بنو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اور تم میرے گارجین مت بنو، راستہ چھوڑو میرا۔“ اس نے اس طرح تیز اور آواز سے کہا کہ حمدان کی ہنسی ختم ہو گئی تھی اور وہ ساکت ہو گیا تھا۔ برہا آگے بڑھ گئی تھی۔ حمدان وہاں ہی کھڑا رہا تھا۔ اب کہ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ برہا چند قدم ڈھکی تھی۔ پھر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔ حمدان وہاں پر نہیں تھا۔

”اتنی جلدی تھک گیا مجھے منانے میں.....“ اس نے غصے اور طنز سے سوچا تھا۔ ہائے شرقی لی..... وہ اپنے شہر کا روٹھنا اور منانا یاد کر رہی تھی کہ اب تک سہیلی مان نہیں جاتی تھی اس کے گھر کے چکر لگنے ہی رہتے تھے۔

بارش ایک دم سے ہی بڑھی تھی اور چاروں طرف چھا گئی تھی۔ کالے بادلوں نے شام کے اندھیرے کو بھی مزید بڑھا دیا تھا۔ اس کا غصہ بوجھل ہوا تو چال بھی سست ہو گئی۔

”مجھے بھی اتنی سرد مہری نہیں دکھانی چاہیے تھی۔“ وہ سو رہی بول تو رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا۔

بارش سے بچتی بچتی وہ آگے بڑھ رہی تھی جب تیزی سے آئی ایک ہیوی بائیک اس تک قدموں کے پاس آ کر چڑھا کر رک گئی۔ وہ اچانک سے رک گئی ورنہ عین ممکن تھا کہ بائیک والا اس کے قدموں پر بائیک چڑھا دیتا۔

”اندھے ہو کیا.....“ اس نے چلا کر کہا تھا۔ حمدان کا غصہ وہ اس پر نکال رہی تھی۔ لیکن بائیک والے نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ہیلمٹ کے اندر سے وہ اسے گھورنے لگا تھا۔ اس کی سیاہ جیکٹ اور سیاہ گلووز پر احمات کے بہت سے ہنن دیکھ کر برہا کو خطرے کی بو آئی تھی۔ جرائم پیشہ افراد اسی طرح کے گلووز پہننے میں ہمت رکھتے تھے۔

اس کے لئے سستی سے قدم چلتے تھے پھر دیر ہی وہ اٹھ کھڑا جیسا برہا کو امید تھی۔ وہ ایک خطرے میں نہیں گئی تھی۔ بائیک والے لڑکے نے اپنی پیٹ کی ڈاک والی جگہ سے پستول نکال لی تھی اور برہا پر تان لی تھی۔ برہا کی آنکھیں پھٹکی تھیں اور وہ پیچھے کو بھاگ گئی تھی۔ بائیک والا بڑی جلدی سے پھر اس کے پاس آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اب برہا ایک ہندوکان کے شٹر لگی تھی اور بائیک والے نے بائیک سے اتر کر پستول برہا کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔

”حمدان.....“ وہ چلائی تھی۔ وہ اتنی جلدی دور

نہیں جاسکتا تھا۔ اسے یہی کہیں ہونا چاہیے تھا۔ ”حمدان.....“ وہ اور زور سے چلائی تھی۔ پستول والے لڑکے نے اس کے ہاتھ پستول رکھ کر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔

”کیا چاہتے ہو؟“ وہ بے حد ڈری ہوئی تھی۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے الفاظ بھی صحیح طرح سے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے اپنا بیگ لڑکے کی طرف اچھال دیا تھا کہ اس کے پاس جو ہے وہ لے جا سکتا ہے۔ لیکن بائیک والے نے اس کا پر سر برے پھینک دیا تھا اور سر کو ایسے ہلایا تھا کہ اسے یہ نہیں ”پچھا اور“ چاہیے۔

”حمدان..... مجھے بچاؤ.....“ اس کے ارادے جان کر وہ پوری طاقت سے چلائی تھی اور اگلے ہی لمحے پستول کا ٹریگر دب گیا تھا۔ ذرن کی آواز آئی تھی۔

”ای.....“ موت کے وقت اسے کلمہ پڑھنا تو یاد نہیں رہا البتہ ای ضرور یاد آگئی تھیں اور ان کا نام پکار کر اس نے انہیں یاد کر لیا تھا۔ لیکن پاکستان میں موجود اس کی ای کا نہ تو دل دھڑکا تھا، نہ نوالہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر رہا تھا۔ نہ آنکھ پھڑکی تھی، نہ ان کی کھڑکیاں دروازے دھڑوہڑائے تھے اور نہ دیئے بجھے تھے۔ لیکن دیئے تو خیر ہندوؤں میں ہوتے ہیں۔ تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا کیونکہ پستول سے گولی نہیں نکلی تھی۔ بلکہ ایک پھول نکل آیا تھا۔ سرخ پھول..... جو ہیلمٹ والے نے اس کے آگے کر دیا تھا۔ وہ مجسمہ بنی سب دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا ہیلمٹ اتار لیا تھا اور ایک چاند جیسے گرہن سے آزاد ہو کر پورے آسمان پر چھا گیا تھا۔

”صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ لڑکیوں کو ہمیشہ گارجین کی ضرورت رہتی ہے۔“ کہہ کر وہ مسکرایا تھا۔ برہا کی جان میں جان آئی تھی۔ پھر بھی اس کی سانس نارمل نہیں ہو سکی تھی۔

”اپنی شکل دیکھو ذرا..... بھوت بھگانی ہوئی ہو اور تمہاری آواز۔ کاش میں اسے ریکارڈ کر لیتا

ای! اس نے اس کی نقل اتاری تھی اور پھر دل کھول کر ہنسا شروع ہو گیا تھا۔ بارش سے بے پروا ہو کر، ہاتھ اس نے اپنے گھٹنوں میں دے لیے تھے اور اب دہرا ہوا جا رہا تھا۔ ”حمدان..... مجھے بچاؤ.....“ وہ سارا منظر جیسے پھر سے یاد کر رہا تھا۔

”اگر یہ میرا ہو جائے تو میں دنیا کی اس سلطنت کی مالک بن جاؤں گی جو آج سے پہلے شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔“ اسے ہنسا ہوا دیکھ کر وہ سوچنے لگی تھی اور مسکرا اٹھی تھی۔

”اب اس طرح بارش میں ہی بھکتی رہو گی یا گارجین کی مدد کو قبول کر دو گی۔“ اس نے ہاتھ اگے کیا تھا۔ برہانے ایک لمحہ سوچے بنا مسکرا کر اپنا ہاتھ اگے کر دیا تھا۔ (تو کیا خواب کی تعبیر یہ تھی؟)

”اب کیک بھی بنالیا ہو گا جس طرح تم نے اسے بھینچا ہوا ہے اس کے اندر کی تو جین بھی پھس گئی ہو گی۔“ اس کی ہنسی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی ہی بے وقوفی اور نادانی پر مسکراتی رہی۔ اس نے بانیگ اسٹارٹ کی تو وہ اس کی ہیوی بانیگ پر بیٹھ گئی۔

”تم نے اتنی جلدی کپڑے کیسے بدل لیے؟“ ”میں جادوگر ہو۔“ حمدان نے کہا۔ ”کچھ بھی کر سکتا ہوں، کسی کا دل بھی چرا سکتا ہوں۔“ وہ منہ پیچھے کیے اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ بانیگ منظر سے دور جانے لگی تھی۔ ان کی باتیں کرنے کی آوازیں مدھم مدھم ہونے لگی تھیں۔ بارش تیز تر ہو رہی تھی۔ لیکن ان دو دیوانوں کو جیسے کوئی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

”امریکا گوٹ ٹیلنٹ“ کے آڈیشنرز کا زور عروج پر تھا جس کا حمدان نے دو سال اور برہانے آٹھ ماہ انتظار کیا تھا۔ پورے ملک میں امریکا گوٹ ٹیلنٹ کے آڈیشنرز چل رہے تھے اور جیسا پورا امریکا ہی امریکا گوٹ ٹیلنٹ کے آڈیشن میں اٹھ آیا تھا۔ حمدان اور برہانے بھی اس شو کے آڈیشنرز کے لیے خوب تیاری کر لی تھی۔ جس کی انہیں ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ وہ

کوئی عام جادوگر نہیں تھے بلکہ ملک کے چھوٹے سے شہر یافتہ جادوگر تھے جس کا انہیں یہ فائدہ ہوا تھا کہ انہیں آڈیشن نہیں دینا پڑا تھا۔ انہیں ڈائریکٹ اسٹیج پر جانے کی تیاری کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

برہان بہت خوش ہوئی تھی۔ کسی پچھلی محنت کا صلہ اس طرح سے بھی ملتا ہے اسے اب اندازہ ہوا تھا۔ وہ لمبی لائنوں میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنے کی کوفت سے خج گئے تھے اور اب جم کر پہلے شو کی تیاری کر سکتے تھے۔ اس کی زندگی کے سفر کا یہ پہلا ہدف تھا۔ جس میں وہ ضرورت پورا اترنا چاہتی تھی۔ وہ ہدف، منزل اور زندگی کو پاپس نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ کہتے ہیں کہ زندگی اپنی ناراضی بڑی جی دیر تک بھاتی ہے۔ حمدان کے بھی خواب پورے ہونے والے تھے۔ وہ دن رات بس یہی کہتا تھا۔

”یہ شو میرا ہی ہے۔ میں ہی اسے جیتوں گا۔“ جس دن شہر شہر آڈیشن مکمل ہوئے اور اسٹیج کی تیاریاں ہونے لگیں اس سے ایک دن پہلے حمدان کو شو کے فیئر کیئر کی کال آئی تھی۔

”آپ کل آؤں آجایے گا۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ ”جی ہم آجائیں گے۔“ حمدان نے کہا تھا۔ ”لگتا ہے آپ نے ٹھیک سے سنا نہیں۔“ میں نے کہا ہے کہ آپ..... یعنی صرف آپ۔ آپ کی پارٹنر برہانہیں۔“ کیئر کیئر بنا تاثر کے تھا۔ پھر بھی حمدان نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اگلے دن حمدان ان کے آؤں چلا گیا تھا۔

”آپ کل کی صورت میں پر فام کرنا چاہتے ہیں ناں۔ میں نے آپ کو یہ ہی بتانے کے لیے بلایا ہے کہ ہم اس بار جادو میں کل کو نہیں لے رہے۔ آپ کو اکیلے ہی پر فام کرنا ہو گا۔“

”آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ مجھے چانس دے رہے ہیں لیکن میری پارٹنر برہانہیں۔“ ”آپ تو واقعی جادوگر ہیں۔ دونوں کی بات جانتے ہیں۔“

”لیکن ایسا کیوں؟“ وہ ناشکی سے بولا۔ ”بتا تو چکا ہوں کہ ہم اس بار جادو میں کل کو نہیں لے رہے۔ آپ نے اگر یہ شو کرنا ہے تو آپ کو ہر پر فامس اکیلے ہی دینی ہو گی۔“ کیئر کیئر نے توقف کیا۔ ”آپ کے پاس سوچنے کے لیے صرف آج رات تک کا وقت ہے۔“

حمدان خاموشی سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔ ساری بازی ایک دم سے ہی پلٹ گئی تھی۔ اب وہ کیئر کیئر کو کیا جواب دے گا اور برہان کو کیا کہے گا۔ وہ بھی ”امریکا گوٹ ٹیلنٹ“ کو جیتنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ وہ تو خوابوں ہی خوابوں میں ٹرائی بھی جیت چکی تھی۔ اب وہ چاہتا ہے کیسے بتاتا کہ فیئر کیئر نے اسے لینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس کے فلیٹ تک جاتے ہوئے لفٹوں کو تریب دے رہا تھا۔

”حمدان تم.....“ وہ اسے اپنے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ حمدان خاموشی سے اندر داخل ہو گیا تھا۔ برہانے اس کی خاموشی سے بڑے مطلب اخذ کیے تھے۔

”حمدان سب خیریت تو ہے ناں؟“ برہانے تشریح سے پوچھا۔ حمدان نے اس کی طرف دیکھ کر ناں میں سر ہلایا اور پھر اسے ساری بات بتادی۔ جس کی برہان کو ہرگز توقع نہیں تھی۔ لمبے بھر میں اس کے سارے خواب ٹوٹے نہیں تھے تو اس سے کھو ضرور گئے تھے۔ وہ تو حمدان کے ساتھ امریکا گوٹ ٹیلنٹ جیتنے کا تہیہ کر چکی تھی اور دن رات اس پر کام کر رہی تھی۔ وہ بالکل نئے کتب متعارف کر دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ دیے نہیں جیسے سالوں سے چل رہے تھے۔ اپنے کرتوں کے بارے میں دونوں نے ایک دوسرے سے خوب ڈسکس کیا تھا اور دونوں ہی بہت پر جوش تھے۔ اب برہانے سب سنا تو خاموش ہو گئی اور مشروب سے بھرے گلاس کے کناروں پر اپنی اکلیاں چلانے لگی۔

”میں نے انہیں منانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مان ہی نہیں رہے۔ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ

تم نہیں تو میں بھی نہیں۔“

”نہیں..... نہیں حمدان! ہرگز نہیں۔ تم ایسا مت سوچو پلیز..... اگر وہ لوگ صرف تمہیں چانس دے رہے ہیں تو تم ضرور جاؤ۔ میں..... میں ایسا کرتی ہوں کہ میں الگ سے آڈیشن دے دیتی ہوں۔“ اسے حمدان کی بات ”تم نہیں تو میں بھی نہیں“ سے خوشی ہوئی تھی۔ اسے لیے وہ قدرے سنبھل گئی تھی اور سوچ سمجھ کر بات کر رہی تھی۔

”میں نے اس حوالے سے بھی بات کی تھی لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ آڈیشنرز بند ہو چکے ہیں اور اس بار وہ دولڑکیاں سلیکٹ بھی کر چکے ہیں اور ایک لڑکا بھی۔ ایک اور لڑکا وہ سلیکٹ کرنا چاہتے ہیں یعنی مجھے، تمہیں اگلے امریکا گوٹ ٹیلنٹ کا ٹک کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ اداسی سے اس نے باقی صورت حال سے بھی اسے آگاہ کیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں کروں گی۔ اللہ کو یہ ہی منظور تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ نہ جیتے بلکہ الگ الگ جیتیں۔“ اس نے بظاہر ہنس کر کہا تھا لیکن اندر سے وہ ڈھکی تھی۔ ”تم میری فخر مت کرو حمدان! تم اپنی تیاری کر دو بلکہ اب تو میں بھی مکمل فارغ ہوں۔ ہم دونوں اچھے سے فہماری تیاری کریں گے۔“ حمدان بھی پچھلی سی مسکراہٹ سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

موقع کی نزاکت ہے کہ اس کے بعد پھر دقت برآمدت کیا جائے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اسے نچوڑ لیا جائے۔ اس کا ایمان ہے کہ اس پر بھر دسا کیا جائے۔ اس کی پیش کش ہے کہ اسے فوراً سے قبول کیا جائے۔ اس کی التجا ہے کہ اسے رد نہ کیا جائے اور اس کی دھمکی ہے کہ وہ پھر بھی پلٹ کر نہ آئے گا۔ دونوں نے اس قدر محنت کی تھی کہ اتنی محنت سے ایک پہاڑ بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ جس موقع کا انہیں انتظار تھا اور جو زندگی نے ان کو دیا تھا اس سے وہ بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس طرح موقع بھی خوش ہوتے ہیں اور بار بار پلٹ پلٹ کر ان کے پاس آتے ہیں۔

جوان کی اچھے سے خاطر واری کرتے ہیں۔  
 حمدان نے اپنی پہلی پرفارمنس میں ہی ججز کو  
 حیران کر دیا تھا۔ اس کا ہانا تھ لگا دس ماہی کیروں  
 کو توڑنے کا کرب تھا۔ ججز خوش ہوئے تھے اور وہ  
 اگلے مرحلے کے لیے کوالیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اگلے  
 مرحلے کی پرفارمنس ایک جتنے بعد کی تھی۔

اس ایک ہفتے میں وہ اور پرجوش ہوئے تھے۔  
 انہوں نے نئے نئے جادو دریافت کئے تھے۔ نئے  
 نئے کرتب کیے تھے۔ بہت سے کرتبوں کو آزمایا تھا۔  
 گوٹ ٹیلنٹ کی ٹیم بھی ان کے ساتھ تھی۔ لیکن وہ  
 مطمئن نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اس ٹیم کی سوچ سے  
 آگے جا کر کچھ کرنا چاہتے تھے۔ پھر شیشے والے  
 تابوت کا مظاہرہ کرنے پر دونوں ہی راضی ہو گئے  
 تھے۔ تین دن بعد پھر سے حمدان کو پرفارم کرنا تھا اور  
 وہ ان تین دنوں میں کوئی تین سو بار وہ کرتب کر کے  
 اس میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔

”تمہارا شکریہ برہا! اگر تم نہ ہوتیں تو میرے  
 لیے یہ سب بہت تھکا دینے والا مرحلہ ہوتا لیکن.....  
 اب مجھے اس سب میں مزا آ رہا ہے اور مجھے پختہ  
 یقین ہے کہ یہ شو میں ہی جیتوں گا۔“ وہ یقین تھا۔  
 یہ امریکا کا گوٹ ٹیلنٹ کا دوسرا مرحلہ تھا جس  
 میں حمدان اپنی پرفارمنس دے رہا تھا۔ وہ ایک شیشے  
 کے تابوت میں لیٹا ہوا تھا جس میں آہستہ آہستہ پانی  
 بھر رہا تھا اور اس کے آس پاس بہت سے سانپ اور  
 بچھو تھے۔ حمدان کے ہاتھ پاؤں اور پورے جسم پر  
 دس تالے لگے ہوئے تھے۔ اسے دو منٹ کے اندر اندر  
 سارے تالے کھولنے تھے۔ ٹھیک دو منٹ بعد تابوت  
 کے اوپر پڑاؤنی پتھر اس پر گر جاتا تھا۔ پانی، سانپ اور  
 بچھوؤں سے لڑتے ہوئے اسے یہ سارا کام ٹھیک دو  
 منٹ میں کرنا تھا۔ ججز سمیت سب کی جان خشک تھی۔ دو  
 منٹ میں سے ایک ایک سکنڈ سب پر بہت بھاری بن کر  
 گزر رہا تھا اور سب کو محفوظ کر رہا تھا۔

برہا بیک اسٹج کھڑی تھی اور وہیں سے اسے  
 دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ وہ بالکل بھی نہیں ڈر

رہی تھی اسے پتا تھا۔ حمدان یہ سب بڑے اچھے سے کر  
 لے گا۔ وہ آج بھی ججز کو حیران کر دے گا اور یقیناً اگلے  
 مرحلے میں جانے کے لیے کوالیفائیڈ ہو جائے گا۔  
 ”ہائے.....“ اس نے اپنے قریب ایک  
 بارعب آوازنی تو چونک کر پٹی..... یہ کیرن تھا۔  
 ”لگتا ہے کافی محنت کی ہے تم دونوں نے۔“  
 محبت ہو تو تم جیسی..... کاش مجھے بھی کوئی تمہاری  
 طرح کی چاہنے والی مل سکتی۔ تم نے اپنے سارے  
 ٹرک اسے دے دیے تاکہ وہ جیت جائے۔“ کیرن  
 نے کہا تھا اور برہا ہنسی تھی۔  
 ”ہم تو دونوں اسٹج پر جا کر آگ لگانا چاہتے  
 تھے لیکن آپ نے ہی پہل کی اجازت نہیں دی۔“ برہا  
 نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”کیا.....؟“ کیرن نے حیران ہونے کی  
 اداکاری کی تھی۔ ”میں نے اجازت نہیں دی یا اس  
 نے میری بات نہیں مانی۔ کتنی محنت کی میں نے حمدان  
 کی کہ ہمارے پاس آج تک کوئی پہل جادوگر نہیں آیا  
 اور تم جیسا خوب صورت تو ہرگز نہیں۔ تم دونوں آؤ  
 گے تو اس شو کو پکٹی ملے گی۔ لیکن وہ مانا ہی نہیں۔“  
 کیرن نے بڑے طریقے سے برہا کے قدموں تلے  
 سے اسٹج کھینچا تھا اور سر پر سے سانبان۔  
 ”ایک منٹ..... ایک منٹ رکھیے..... کیا کہہ  
 رہے ہیں آپ؟“

”دبی..... جو تم سن رہی ہو بچی! حمدان کا تو  
 بس یہی کہنا تھا کہ وہ پرفارم کرے گا تو اکیلا ہی.....  
 تم دونوں ایک ساتھ پرفارم کرنا نہیں چاہتے اور ایسا  
 تم ہی چاہتی ہو..... ورنہ میں تو تمہیں الگ سے  
 کال کرنے والا تھا کہ پہل کی صورت نہیں کر سکتے  
 اکیلے اکیلے ہی کر لو..... لیکن اس نے اس حوالے  
 سے بھی انکار کر دیا۔“ کیرن بول رہا تھا اور برہا ہنسی  
 طرح سے وہ جواز ڈھونڈنے لگی تھی جن کی بنا پر  
 کیرن کو جھوٹا سمجھے۔ اس کے ہاتھ ایسے کوئی وجہ  
 لگی جس کی بنا پر وہ کیرن کی بات کا یقین نہ کر لی  
 بھلا وہ کیوں جھوٹ بولے گا؟

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”میں جھوٹ بولوں گا لیکن..... لیکن مجھے لگتا  
 ہے کہ مجھے یہ سب تمہیں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ مجھے تو  
 لگتا تھا کہ حمدان نے تمہیں اعتماد میں لے کر ہی سب  
 لیا ہو گا لیکن..... اوہ..... لگتا ہے مجھ سے غلطی ہو چکی  
 ہے۔ میں دو محبت کرنے والوں کے بیچ میں آ گیا ہوں۔  
 مجھے معاف کر دو بچی! کھمو میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔“  
 کیرن جلدی جلدی سفاکی سے بول رہا تھا۔

”نہیں..... آپ نے کچھ غلط نہیں کیا بلکہ مجھے  
 زندگی کی سب سے بڑی غلطی سے بچا لیا ہے۔“ اس  
 نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا اور اسٹج پر تابوت کے  
 اندر دم سا وہ حمدان کو دیکھا تھا۔ جس کے آس پاس  
 سانپ اور بچھو تھے۔ اسے حمدان اور ان سانپ اور  
 بچھوؤں میں کوئی فرق نہیں نظر آیا تھا۔ اسے تینوں کے  
 چہرے ایک جیسے ہی لگے تھے۔

”میں نے جو کہا اسے بھول جانا بچی! احباب  
 میں چلتا ہوں۔“ کیرن چلا گیا تھا اور برہا کی آنکھیں  
 آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

دو منٹ گزر چکے تھے۔ حمدان تابوت میں سے  
 صحیح سلامت باہر نکل آیا تھا۔ اسٹج پر حمدان کے لیے  
 تالیاں بجائی جا رہی تھیں۔

بیک اسٹج اس کی محبت کا وقت بھی پورا ہو چکا  
 تھا۔ اس سے دفا کے تالے نہیں کھلے تھے۔ وہ سانپ  
 اور بچھوؤں کے درمیان ہی رہی تھی اور اب ایک وزنی  
 پتھر اس پر آگرا تھا۔ وہ تڑپ ہی تو اٹھی تھی۔

☆☆☆

اس نے تین بار تالیاں بجائی تھیں۔ زور زور  
 سے بڑے ہی گونج دار طریقے سے..... حمدان  
 تالے سے جسم خشک کر رہا تھا جب وہ اس کے اس  
 طرح تالی بجانے کے انداز سے مڑا تھا۔

”مبارک ہو مسٹر حمدان! فائل کے لیے اور  
 بے وقوف بنانے کے لیے بھی۔“ اس کی اس  
 سے وہ جسم خشک کرتا وہیں جا رہا تھا۔ برہا  
 لہجے میں بہت کچھ تھا۔ وہ مذاق پر گز نہیں تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو برہا؟“

”کس خوب صورتی سے حیران ہو رہے ہو  
 حمدان! اب تو بس کر دو، مجھے الو ہمارے ہو۔“ ٹیجر پر  
 جھوٹا الزام لگا رہے ہو کہ وہ پہل کو نہیں لینا چاہتا تھا۔  
 یوں کیوں نہیں کہتے کہ تم میرے ساتھ یہ شو نہیں کرنا  
 چاہتے تھے۔ تم اس شو کی ساری کامیابی اکیلے سینا  
 چاہتے تھے۔“

”یہ سب کس نے کہا تم سے؟“  
 ”جس کے نام پر تم نے یہ سب جھوٹ گھڑا  
 ہے۔ کیرن نے۔“  
 ”کیرن؟“ بکو اس کر رہا ہے وہ۔ کیرن نے تو  
 خود.....“

”وہ یا تم؟“ برہا کی آنکھوں میں انگارے  
 دھک رہے تھے۔ حمدان کے لیے ان کی تاب لانا  
 مشکل ہو رہا تھا۔

”میں ابھی ساری بات واضح کر دیتا ہوں۔“  
 حمدان باہر گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ساتھ کیرن  
 اور ٹیم کے لوگ تھے۔

”بتاؤ کیرن! کیا تم نے مجھے نہیں کہا تھا کہ شو  
 میں مجھ اکیلے کو پرفارم کرنا ہو گا۔ اس بار پہل کی  
 اجازت نہیں ہے۔“

”میں نے کب کہا؟“ کیرن نے کمال  
 معصومیت سے کہا تھا۔ حمدان کی گویا روح فنا ہوتے  
 ہوتے رہ گئی تھی۔

”کیوں جھوٹ بول رہے ہوں خبیث؟“  
 حمدان غصے سے پاگل ہونے لگا تھا۔ اس کی آواز اس  
 قدر بلند تھی کہ شو کے لیے اپنی اپنی باری پر تیار  
 کرتے سب وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ایریل سبک پر  
 مشق کرتی ایک لڑکی گرتے گرتے بچی تھی۔ پول  
 ڈانس کرتا گروپ ایک دے پردھڑام سے گرا تھا  
 اور بارہ گیندوں کو اچھالتے جو کرکا دھیان بنا تھا اور  
 اس کی ساری گیندیں گر گئی تھیں۔ کیرن نے چاروں  
 طرف دیکھا تھا۔

”زبان سنہال کر بات کر دلا کے! آج تک

کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے اونچی آواز میں بات کرے۔ جن لوگوں نے تمہیں کسی فاسل تک پہنچایا ہے وہ میرے کہنے پر تمہیں نیچے کرانے میں ایک منٹ بھی نہیں لگاؤ گے اور جو آج تمہارے نام کے، تمہاری شکل کے دیوانے ہیں۔ وہ تمہاری شکل بھلائیں گے تو پھر پلٹ کر یہ بھی یاد نہیں کریں گے کہ ایک لڑکا حمدان نام کا بھی ہوا کرتا تھا۔ کیرن نے غصے سے کہا تھا۔

”کیوں کر رہے ہو کیرن ایسا؟“ حمدان ضبط، دکھ، کرب سے بوجھل ہو کر بولا تھا۔ ”تم نے خود مجھے فون کر کے بلایا تھا۔“

”میں یاد کروں یا تم یاد کرو۔۔۔۔۔ مجھے یہ تمہارا کوئی آپسی معاملہ لگتا ہے۔ تم جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہے ہو۔ تم خود آئے تھے میرے آفس کہ تمہیں یہ شواہد کیلئے کرنا ہے اور اگر نہیں یاد تو ہمارے آفس کے ایک ایک کرنے میں کیرن نے نصب ہیں۔ اس دن کی فوج تم با آسانی دیکھ سکتے ہو۔ شاید اس سے تمہیں کچھ یاد آجائے۔“ کیرن غصے اور طنز سے بولا تھا۔ حمدان اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ وہ کس ڈھٹائی سے اسے مجرم ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا اور کیوں۔۔۔۔۔؟

”میں وہ ویڈیو دیکھنا چاہوں گی۔“ برہانے کہا تھا۔

چند لمحوں بعد ویڈیو لگا دی گئی تھی جسے لگ بھگ پچاس لوگ ایک ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اندر ہال میں بھی چوگولیاں ہو رہی تھیں کہ بیک اسٹج کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ اگلا کرب بھی پیش نہیں ہو سکا تھا۔ سی سی ٹی وی کمرے کی ویڈیو اور حمدان کے بولے جانے والے جملوں کو اس طرح سے ایڈٹ کیا گیا تھا کہ کیرن جو کہہ رہا تھا وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہو گیا تھا۔

”حمدان آپ نے مجھے اس لیے کال کی تھی کہ آپ یہ شواہد کیلئے کرنا چاہتے ہیں۔“

”جی سر۔۔۔۔۔“

ویڈیو کے پہلے ہی دو جملوں نے سب واضح کر دیا تھا۔ برہان پر بھی کہ وہ ایک دھوکے باز شخص پر اعتبار

کرتی رہی ہے اور حمدان پر بھی کہ وہ سارے پتے ہار گیا ہے۔ اس کے ساتھ بہت بڑا کھیل بہت بڑے طریقے سے کھیلایا گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اب کچھ یاد آیا مسٹر حمدان؟“ کیرن چہرے پر مسکراہٹ سجائے پوچھ رہا تھا۔ جمع نے حمدان کو دیکھا تھا۔ وہ سب اس دھوکے باز لڑکے سے نفرت کرنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں میں واضح طور پر دم تھا۔ ”دع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ جس نے ایک معصوم لڑکی کا فائدہ اٹھایا تھا۔“ حمدان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ کیسے اپنے سچائی ثابت کرے۔ کیا کوئی اسے سننے کے لیے تیار تھا؟

”میں اس ویڈیو کو پلٹ کر دیکھوں۔ یہ اصل نہیں ہے۔“

”ویڈیو اصل نہیں ہے یا تم اصل نہیں ہو؟“ برہان آنکھوں میں آنسو بھرے اس سے پوچھ رہی تھی۔

”برہان۔۔۔۔۔“ وہ خود رو دینے کے قریب تھا۔

”اب کون سا جادو دکھاؤ گے جادوگر! میرے دل کے ساتھ تو دکھائی چکے ہو۔“ وہ رونے لگی تھی۔ کہاں تک ضبط کرتی۔ حمدان نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کیرن اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ جہوم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”دھوکا دینے سے بہتر تھا کہ مجھے صندوق میں بند کر کے مصنوعی تلواروں کے بجائے تم اصلی تلواں استعمال کرتے اور مجھے صندوق میں ہی مار دیتے لیکن یہ سب۔۔۔۔۔“ رونے کے باعث وہ ٹھیک سے نہیں بول پا رہی تھی۔ حمدان سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی اسے سنائیں جانا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ ابھی اسے صرف سننا تھا۔

”تم نے جیت کو اس طرح خود پر حاوی کر لیا کہ انسانوں کو بھول گئے۔ بارہم نے کہا یہ شوت تمہارا ہے۔ تم ہی اسے جیتو گے۔ تم نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ شوت ہمارا ہے۔ ہم ہی اسے جیتیں گے۔ میں نے ہمیشہ اس بات کو نظر انداز کیا لیکن تم نے آج ثابت کر دیا کہ یہ شوت تمہارا تھا اور تم اسے جیتنے کے لیے کچھ بھی کر

سکتے تھے۔ کچھ بھی۔۔۔۔۔ اور اب میری دعا ہے کہ یہ شوت ہی جیتو۔۔۔۔۔ لیکن جب جیت جاؤ تو پیچھے پلٹ کر ضرور دیکھنا۔۔۔۔۔ شاید تمہیں وہ نظر آجائے جو ہم ہار چکے ہو۔“ برہان نے اپنے آنسو پونچھے تھے اور کہہ کر چلی گئی تھی۔ حمدان اس کے پیچھے نہیں گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کیرن سٹی بجاتا ہوا جہوم کو چیرتا باہر چلا گیا تھا۔ حمدان کی خوں خوار نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ جہوم نے حمدان پر ایک قہر بھری نظر ڈالی تھی اور پھر سب اپنا اپنا کام کرنے لگے تھے۔ وہاں سے نکل کر کیرن سیدھا اپنے آفس گیا تھا۔ جہاں یلیسا دیوار پر لگی اسکرین پر۔۔۔۔۔ کیرن روم میں ہوتا یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ کیرن کے اندر آتے ہی اس نے کیرن کو چومنا تھا۔

”تمہارا شکر یہ کیرن! آج تم نے میری بے عزتی کا بدلہ لے لیا۔ جو اس لڑکی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور جسے حمدان نے تکمیل تک پہنچایا تھا۔“ غصے سے دانت پیس کر کہتے ہوئے وہ اگلے ہی پل مسکرائی تھی اور کیرن کے گلے سے جھوم گئی تھی۔

نیم سے نکالے جانے والی بے عزتی کا بدلہ اس نے کہیں زیادہ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

”برہان! میری بات سنو۔“ شو سے نکل کر وہ اس کے گھر آیا تھا۔ بار بار دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو اس نے دروازہ پھینکا شروع کر دیا تھا۔

”برہان! ایک بار میری بات سن لو، صرف ایک بار۔۔۔۔۔“ دروازہ کھل گیا تھا۔

”تمہارے پاس ایک منٹ ہے۔ جلدی بولو۔“ ان نے سختی سے کہا تھا۔ حمدان خاموش ہو گیا تھا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو، یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم بے گناہ ہو۔ اتنے شہوتوں کے بعد بھی تم خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ تم کس آدمی کے ہوئے انسان ہو اور اب چاہتے کیا ہو۔ تم

جیتو یہ شو، اب کس بات کا مسئلہ ہے۔ کیا رکاوٹ ہے۔ سب رکاوٹیں ختم تو ہو گئی ہیں۔“

”برہان! ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”یہاں سے چلے جاؤ حمدان! میں تمہاری کسی بھی بات کا کوئی یقین نہیں کروں گی۔“ اس نے کہہ کر دروازہ بند کرنا چاہا تھا۔ لیکن حمدان نے خود کو اس کے اور دروازے کے درمیان میں کر لیا تھا۔

”مجھے تھوڑا وقت دو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے۔“

”مجھے تمہاری بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں چاہیے اور اگر تم چاہتے ہو کہ میں کھڑکی سے کود کر خود کو ختم نہ کر لوں تو یہاں سے چلے جاؤ۔“ اس نے سختی سے سخت بات کی تھی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ ایسا کرنے سے پہلے ایک منٹ بھی نہیں سوے گی۔

حمدان وہاں سے چلا آیا تھا۔ رات میں کسی ایک بھی لمحے اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ اس رہ رہ کر برہان کا رونا اور دکھ سے چور اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ صبح وہ پھر اس کے فلیٹ کے سامنے تھا۔ دروازہ ریمکنے کھولا تھا۔

”وہ یہاں سے جا چکی ہے۔“ ریمکنے نے کہا تھا۔ حمدان کے پیروں تلے سے عمارت نکل گئی تھی۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو، اتنی جلدی کوئی کیسے جاسکتی ہے؟“

”جب دل ٹوٹتا ہے نہ تو ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن جاتا ہے حمدان! اس نے نجانے کتنے سالوں میں اپنا سامان سمیٹا ہے اور نجانے کتنی صدیوں میں وہ یہاں سے گئی ہے۔ آپ کے لیے محض ایک رات گزری ہے لیکن اس کی ساری زندگی بیت گئی ہے۔ وقت کے اس فرق کو سمجھو حمدان! وہ بہت دیر لگا کر گئی ہے یہاں سے۔ جلدی میں نہیں گئی۔“ اداسی ریمکنے نے دکھ سے کہا تھا۔

”لیکن وہ گئی کہاں ہے؟“

”مجھے اندازہ نہیں۔ وہ رات میں ہی کہیں کا نور ہو گئی ہے۔ صبح ابھی تو وہ جا چکی تھی۔ یہ خط پھوڑ



گئی ہے جس پر آپ کا نام ہے۔“ ریکی نے خط اس کو دے دیا تھا۔ حمدان نے اسے وہاں ہی کھول لیا تھا۔ ”تمہیں شہرت چاہیے گی اور مجھے تم..... لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ اب مجھے ثرائی چاہیے۔ اس لیے میرے دل میں تمہاری کوئی جگہ باقی نہیں بچتی۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا کہ یہ بے کار ہے۔“ خط پڑھ کر وہاں ہی زمین پر ڈھس گیا تھا۔

☆☆☆

”آپ کو ہر حالت میں پر فارم کرنا پڑے گا۔ ہم اس وقت دنیا کا سب سے مقبول رائٹلی شو چلا رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم نے یہاں کوئی جینز بیچنے کی دکان کھول رکھی ہے۔“ ”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل میری تیاری نہیں ہے۔ میں اگلے راولڈنڈ میں پر فارم نہیں کر پاؤں گا۔“

”تیاری آپ کو ٹیم کر دے گی۔ اس کے باوجود اگر آپ نے پر فارم نہ کیا تو آپ کو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔“ تیزن اب اس کے منہ نہیں لگتا تھا۔ اس نے کسی اور کو اسے ہینڈل کرنے کے کام پر لگا دیا تھا۔ ”جرمانہ؟ کس بات کا؟“

”آپ کو کنٹریکٹ سائن کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح پڑھ لینا چاہیے تھا۔“ دوسرا میجر کہہ کر چلا گیا تھا۔

اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اگلے راولڈنڈ کی تیاری کرے۔ وہ بے دلی سے تیاری کرنے لگا تھا۔ ٹیم اسے تیاری کروا رہی تھی اور برہا کو تلاش کرنے کا کام ملتو ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ برہا کو تلاش کر سکے۔ وہ اب دونوں بری طرح سے بے چین تھا۔ کچھ ہی دور پر بھی اسے اپنے اپنے طور پر تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔

اسی دوران سبکی فائل کا دن آچنچا۔ اس نے اپنی پر فائمنس دے دی اور جب ججز نے اگلے راولڈنڈ کے کوآلیفائیڈ کا اعلان کیا تو..... تو وہ نہ ہی روس کا اور

نہی دیکھ سکتے تھے وہیں گرسکا۔

وہ سبکی فائل میں امریکا کوٹ ٹیلنٹ کی ریس سے باہر ہو گیا تھا۔ اس کا امریکا کوٹ ٹیلنٹ جیتنے کا خواب منوں مٹی تھے دب گیا تھا۔ اسے جیسے کسی کی بددعا لے ڈوبی تھی۔

☆☆☆

دن اذیت بن گئے تھے اور راتیں کرب۔ دھڑکنیں فوج کتاں تھیں اور سانسیں ماتم کدہ۔ ایک ماہ ہو گیا تھا۔ برہا کا کہیں اتنا پتا نہیں تھا۔ وہ کہاں تک گئی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں جا چکی تھی کسی کے پاس کوئی سراغ نہیں تھا۔ ریکی، حمدان، کچھ بھی، جیڈ سب نے اسے ڈھونڈا تھا اور پھر سے بے دم ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ انویا نہیں ہوئی تھی۔ جہاں بھی گئی تھی اپنی مرضی سے گئی تھی اور اب اپنی مرضی سے ہی واپس آسکتی تھی۔ ایک چھوٹا سا خط جو حمدان کے نام چھوڑ گئی تھی اسے حمدان سمیت ہر کوئی بار بار دفعہ پڑھ چکا تھا۔ اس دن بھی وہ بیڈ پر لیٹا اس کا خط پڑھ رہا تھا۔ اس کی لکھائی میں اس کی خوشبو ڈھونڈ رہا تھا جب ایک دم سے اس کے ذہن میں جھپکا ہوا تھا۔

”تمہیں شہرت چاہیے تھی اور مجھے تم..... لیکن اب وقت بدل گیا ہے۔ اب مجھے ثرائی چاہیے۔ اس لیے میرے دل میں تمہاری کوئی جگہ باقی نہیں بچتی۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا کہ یہ بے کار ہے۔“ وہ اس خط کے ایک فقرے پر رکا تھا۔ ”اب مجھے ثرائی چاہیے“ ثرائی؟ کون سی.....؟ اس نے اسی وقت اپنا لپ ٹاپ آن کیا تھا۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا جب اس نے ”برطانیہ کوٹ ٹیلنٹ“ کے آڈیشن میں برہا کو دیکھا۔

”تو تم برطانیہ چلی گئی ہو برہا! خود کو ڈھونڈنے میں مجھے پھر سے شکست دینے۔“ اس نے دھک سے سوچا تھا۔ واقعی تم یہاں نہیں ہو۔ ورنہ جتنا میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا تم مجھے ضرور مل جاتیں۔

☆☆☆

”کیسے ہو حمدان؟“ وہ ایک دن بلا مقصد،

منزل کے راستے سے گزر رہا تھا جب ایک کار اس نے باس آ کر رکی تھی اور اس میں سے ملیسا نکلی تھی۔ ملیسا کی آواز میں نینروں کی کاٹ تھی۔ حمدان اسے دیکھتا رہا تھا۔

”ایک اوٹلی لڑکی کا سوگ منا رہے ہو؟“ وہ ’بھڑ آئے والی نہیں تھی۔“

”چلی جاؤ یہاں سے ملیسا!“ اس نے عاجز آتے ہوئے کہا اور اسے برے کر کے آگے ہوا تھا۔ وہ ملیسا جیسی مخلوق کے منہ لگنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ملیسا کو اپنی ہنک کا احساس ہوا تھا۔

”تم نے مجھے کم جانا..... لیکن دیکھو۔ کیسا کرتب کیا میں نے..... تم کس حال میں ہو اور وہ کہاں گم ہے۔ ابھی بھی میرے ٹیلنٹ کی داد نہیں دو گے؟“ حمدان جاتے جاتے پلٹا تھا۔ اس نے ملیسا کو دیکھا تھا۔ جواز ہر کی لپ اسٹک ہونٹوں پر سجائے مسکرا رہی تھی۔

”تو..... یہ سب تم نے کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ملیسا نے ایسے کندھے اچکائے کہ ہاں میں نے ہی کیا ہے جو ہوتا ہے کرلو۔

”تم تو میری سوچ سے بھی زیادہ غلط فہم لگتیں ملیسا! تمہیں یہ سب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“ ”مجھے سب کے سامنے ذلیل کرتے ہوئے تمہیں بھی تو شرم نہیں آتی تھی۔“

”اس فرسبی دنیا کا یہ ہی تو مسئلہ ہے ملیسا کہ یہاں ہر کوئی خود کو جیتتا ہے۔ میری دعا ہے کہ وقت تم پر آنکار نہ کرے کہ تم غلط نہیں کیونکہ جب وقت بدل لیتا ہے تو سارے لحاظ بلائے طاق رکھ دیتا ہے۔“

”تمہاری دعا کا شکریہ حمدان!“ اس نے آگے بڑھ کر اسے چومنا تھا، پھر کار اسٹارٹ کر کے اس میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ حمدان وہی کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

یہ ججز کے سامنے اس کا دوسرا شو تھا جس کی اس نے بہت تیاری کی تھی۔ برطانیہ کوٹ ٹیلنٹ کے

آڈیشن میں وہ بہت آرام سے سلیکٹ ہو گئی تھی اور اس کے بعد ججز کے سامنے ایک پر فارمنس بھی دے چکی تھی۔ وہ مختصر تھی، ماہر تھی اسی لیے ٹیم بھی اسے خاص محنت کرواتا تھا۔ وہ بہت پر امید تھی کہ وہ دیکھنے والوں کو حیران کر دے گی لیکن وہ خود حیران رہ گئی تھی۔ جب اس نے ابتدائی نشستوں پر حمدان کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ہوا میں ایک دم سے آئینے کے ذرات کاربن میں بدل گئے تھے۔ اس کا سانس کیسے نہ اکھڑتا؟ وہ پورے دو ماہ کے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں حمدان کی کیا حالت تھی۔ وہ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جیسے پتھر کا بتا وہاں پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے برہا کا کرتب خراب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن کرتب خراب ہو چکا تھا۔ اس کی سانسوں کی طرح اس کے ہاتھوں کی ترتیب بھی اڈیٹر بن کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ سب رٹارنا بھول گئی تھی۔

کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، وقت کی اہمیت..... اسے جیسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ بہت حد نروس ہو گئی تھی اور لگ بھگ رہی تھی اور جب اسے پکا یقین ہو گیا کہ وہ ٹوٹے ششے اکٹھے کرنے میں ناکام ہو رہی ہے تو اس نے ججز سے سوری کہہ دیا تھا۔

”کوئی بات نہیں..... اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ ہم آپ کو ایک اور چانس دیتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد آپ ججز سے پر فارم کر سکتی ہیں۔“ وہ آنکھوں کے آنسو صاف کرتی ہوئی واپس گرین روم میں گئی تھی۔

”اب کیوں آ گیا ہے یہ یہاں..... اب کیا چاہیے اسے۔“ وہ ڈیرینک پر بڑی اپنی چیزیں ایک ایک کر کے چھیننے لگی تھی۔ ایک گھنٹے بعد اسے پھر سے اسٹیج پر جانا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ ایک گھنٹے بعد بھی کچھ نہیں کر سکے گی۔

”ڈیٹیل..... کیا تم ناظرین میں سے کسی ایک کو باہر نکال سکتے ہو؟“ اس نے میجڈ ڈیٹیل سے کہا تھا۔ ”لوگ یہاں پر ٹکٹ خرید کر آئے ہیں مائی

ڈیر! میں کیسے کسی کو نکال سکتا ہوں۔“

”کسی بھی طرح..... پلیز میرے کہنے پر..... میری خاطر..... اگر وہ وہاں پر ہوا تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گی۔“ اس نے منت بھرنے نیچے سے کہا تھا۔

”وہاں سے نکلوانے سے بہتر ہے کہ تم اسے پہلے دل سے نکالو۔“ ڈینیل ایک لمحے میں ساری بات سمجھ گیا تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔

”اچھا بتاؤ ان میں سے کون ہے وہ..... کوشش کرتا ہوں۔“ ڈینیل اسکرین پر لوگوں کے جھوم کے فوج اسے دکھانے لگا تھا۔

”وہ تیسری رد میں بیٹھا ہے۔ ججز کے دائیں طرف۔“ اس نے یاد کرتے ہوئے کہا تھا۔

”لو دیکھو..... بولو کون ہے وہ.....“ ڈینیل اسے وہاں کی ہی فوج دکھا رہا تھا جہاں اس نے بتایا تھا۔ وہ وہاں حمدان کو تلاش کرنے لگی تھی لیکن اسے حمدان وہاں کہیں بھی بیٹھا نظر نہیں آیا تھا۔ حمدان تو وہاں تھا ہی نہیں۔

”بولو بھی..... کہاں ہے وہ؟“

”لگتا ہے وہ چلا گیا ہے۔“

”سینس تو ساری بک ہیں۔ وہ چلا گیا ہوتا تو اس کی سیٹ خالی ہوتی۔“ ڈینیل ٹھیک کہہ رہا تھا تو کیا وہ واقعی یہاں نہیں آیا تھا۔ یہ اس کا خیال تھا؟ لیکن کیوں تھا؟ وہ تو اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی اور دشمن اس طرح تجلیوں میں نہیں آتے جیسے وہ آیا تھا۔

”تم تیاری کرو..... مایوس مت کرنا۔“ ڈینیل اسے تھکی دیتا ہوا چلا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد وہ پھر سے اسٹیج پر گئی تھی۔ حمدان وہاں نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بمشکل ہی شو پیش کر سکی تھی۔ اور بمشکل ہی اگلے مرحلے کے لیے کوالیفائیڈ ہوئی تھی۔

تھک کر وہ ہوٹل واپس آئی تو اس کے کمرے کے دروازے پر ایک کارڈ لگا ہوا تھا۔

”اگلے رائونڈ کی مبارک باد..... تمہاری

کامیابی کے لیے دعا گو۔“ کارڈ سے ”ڈارک نائٹ“ کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

تو وہ وہاں آیا تھا۔ اس کے دل کی کھال سکڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

”کیسے تم یہاں.....؟“ وہ کبھی کوہاں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں دستک ہوئی تھی۔ وہ بھی کبھی کہہ سکتا تھا۔ اس نے آؤر دیا تھا لیکن یہ تو کبھی تھی۔

”کیسے نے برہا کی حیرت کی کوئی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ٹیڑھی نظروں سے برہا کو دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی برہا!“ اندر پہنچ کر اس نے کہا تھا۔ ”اس طرح چھوڑ کر آگئی ہو مجھے۔ بتائے.....“ کبھی نے شکوہ کیا تھا۔ برہا کے پاس کبھی کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”میں نے تو سنا تھا کہ مشرقی لوگ، دوستی اور تعلق داری بنانے میں بہت مشہور ہیں۔ کچھ ان کی لاج ہی رکھ لیتی تھی۔“

”مشرقی لوگ نازک دل کے ہوتے ہیں۔ وہ حساس ہوتے ہیں۔ کیا یہ نہیں سنا تم نے؟“ اس نے اسے لا جواب کیا تھا۔

”جو بھی لڑائی تھی وہ حمدان سے تھی۔ مجھ سے اور رچی سے تو نہیں..... تم اتنی دور چلی آئیں۔ میرے گھر رہنا شروع کر دیتیں۔“

”مجھے ڈرتا تھا کہ اگر میں نے اپنے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تو تم حمدان کو بھی بتا دو گی اور اسی لیے تمہارے گھر رہنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ کبھی نے تھوک تھکے ہوئے کہا تھا کیونکہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ ایسی بات تھی۔ اگر برہا اس کی طرف رہتی یا اسے اپنے بارے میں کچھ بتاتی تو کبھی نے اب تک حمدان کو بتا دیا ہوتا۔

”دیل..... میری پاس تمہارے لیے ایک

ماس نیوز ہے۔ اس دن جو حمدان نے.....“

”کیسی.....“ برہا نے اسے درمیان میں ہی نہ تھا۔

”کیا ہے؟“ اس کی آنکھوں کی سختی دیکھ کر کبھی ناؤش ہوئی تھی۔

”کیرن کے بارے میں کچھ مت کہو۔ تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔“

”اور اگر میں بھی یہ ہی کہوں کہ تم کچھ نہیں جانتی.....“

”کیسے اتنی سہمی میری دوستی کی قسم۔ ایک لفظ ہی مت کہنا، میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔“

”لیکن برہا!“ کبھی اسفردگی سے بولی تھی۔ وہ تو غلط فہمی دور کرنے آئی تھی اور برہا کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

”اگر تم اب آگے سے ایک بھی لفظ بولی تو میں بھی اس بات پر یقین کر لوں گی کہ آسمان کے لوگ بے مہر ہوتے ہیں۔“ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”حمدان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں۔“ برہا نے سختی سے کہا تھا۔ کبھی کے پاس خاموشی دو جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

اگلا شو پانچ دن کے بعد تھا اور وہ پہلے کی طرح بنز کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ جلدی سے پریکٹس روم میں آ جاتی تھی اور پاگلوں کی طرح پریکٹس شروع کرتی تھی۔ لیکن اس سے نارمل لوگوں کی طرح بھی پریکٹس نہیں کی جاتی تھی۔

”تم مشکل ایکٹ نہ لو..... بلکہ کوئی عام سا ایکٹ لے لو۔“ ڈینیل نے اسے بلکان ہوتا دیکھا تو اس سے کہا تھا۔

”عام ایکٹ تو سب کرتے ہیں۔ میں کچھ نامس کرنا چاہتی ہوں۔“

”خاص کے چکر میں کام خراب کرنے سے باز ہے تم عام کر لو لیکن ٹھیک سے کر لو۔“ ڈینیل نے بھرہ کیا تھا۔ وہ غصہ دہانی ہوئی چونچک روم میں

آئی تھی، اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ پانی کی بوتل کو اس نے اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔ لیکن پانی ہونٹوں سے بہہ کر نیچے گر رہا تھا۔ منہ میں نہیں جا رہا تھا۔ نجانے اسے کس کس بات کا غصہ تھا۔

”میں پریکٹس کر دوں۔“ ایک نرم آواز کمرے میں گونجی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تھا اور اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کمرے میں ڈارک نائٹ کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ جو اسے باگل کر دیتی تھی۔ برہا کو کچھ میں نہ آئی کہ وہ اپنا پہلا رول کیا ظاہر کرے۔

”آؤ میں تمہیں پریکٹس کر دوں؟“ اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پیار سے کہا تھا۔ (تو کیا یہ بھی اس کے خواب کی تعبیر.....؟)

”ایک ہارا ہوا شخص مجھے کیا پریکٹس کر دے گا۔“ اس نے اس پر طنز کیا تھا۔

”مجھے اپنی ہار منظور ہے۔ تم کیوں جیت.....“

”کیا کرنے آئے ہو یہاں؟“ اس نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا تھا۔ ایک دم سے جیسے اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ یہ یہاں آیا کیوں ہے؟

”تمہیں جوتانے۔“ اس نے مسکرا کر بڑے پیار سے کہا تھا۔ اپنے غصے کو قائم رکھنا برہا کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

”لیکن مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھی تھی اور باہر جانے لگی تھی۔

”برہا.....“ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”چھوڑ دو میرا ہاتھ مسٹر حمدان!“ وہ نفرت سے چلائی تھی۔ آواز گردش کرتی ہوئی چاروں طرف پھیلی تھی جو جہاں جہاں چل رہا تھا وہاں ہی رک گیا تھا۔

”تم سمجھتے کیا ہو خود کو..... کتنے روپ و حارو گے خود پر..... میں نے مان لیا کہ تم بہت بڑے جادو گر ہو..... بہت بڑے۔ عوام کے ساتھ کھیلنا فحش جاننے ہوا درلوں کے ساتھ بھی..... لیکن مجھ پر اب تمہارا کوئی زور نہیں چل سکتا..... سمجھے تم۔“ وہ اتنی تیزی سے چلائی تھی کہ سب اپنے اپنے کام بھول کر

ان دونوں کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔ حمدان اس کی شکل دیکھتا رہ گیا تھا۔

”اتنی نفرت؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔  
 ”اگر تم میری نفرت کو ناپ سکتے تو تمہیں  
 انداز ہوتا کہ دنیا کا بلند پہاڑ بھی اس کے آگے کچھ  
 نہیں ہے۔ گہرے سمندر کی گہرائی بھی اس نفرت  
 کے آگے کم ہے۔ تم نے دھوکے سے بھی بڑھ کر دھوکہ  
 دیا ہے۔“

”اس سب کی ہی توضاحت کرنے آیا ہوں۔“  
 ”مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے، سنا نے۔“  
 ”کچھ نہیں جانتا مجھے۔“ وہ چلائی تھی اور اس نے پاس  
 ہر اگلا در زمین پر دے مارا تھا۔ شور کا جھنکا ہوا تھا۔  
 ڈینیل بھی کمرے میں آیا تھا اور ٹوٹے ہوئے گلدان  
 کو دیکھنے لگا تھا۔  
 ”آخری موقع بھی نہیں دوں گی؟“

”دوں گی۔ اپنی آخری سانس کے وقت .....  
اگر تم چاہتے ہو کہ میں خود کو قسم نہ کروں تو یہاں سے  
چلے جاؤ اور پھر بھی یہاں منت آنا۔“ وہ اتنی شدت  
سے اس سے نفرت کرنے لگی تھی جہاں کو اندازہ بھی  
نہیں تھا۔ وہ بیک تک اس کی شکل دیکھتا رہتا تھا۔

”جارہا ہوں اور اب ایسے جاؤں گا کہ تم بھی مجھے ڈھونڈنا چاہو گی تو میں تمہیں نہیں ملوں گا۔“

حیدر نے جاتے وقت کہا تھا۔ نجانے کیوں برہا کا روم روم اس آواز اور اس ڈھمکی پر کانپ کر رہ گیا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی حیدر کو نہیں روک سکی تھی۔ حیدر چلا گیا تھا۔ سب اس کو دیکھنے لگے تھے۔ جو غصے کے باعث کانپ رہی تھی اور جس کی سانس نارمل حالت میں واپس نہیں آ رہی تھی۔

”اگر تم برطانیہ کوٹ یٹلنٹ جیت گھس تو امید ہے کہ مجھے اس ملکدان کے پیسے دے دوگی جو تم نے ابھی ابھی توڑا ہے۔“ ڈینیئل نے حمدان کے جانے کے بعد کہا تھا۔ برہانے اسی وقت اپنا ہینڈ بیگ پکڑا تھا اور بتا گئے بہت سے پیسے نکال کر ڈینیئل کے ہاتھ میں دے مارے تھے۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“

ڈینیل پتا نہیں فرمندی گی سے کہہ رہا تھا کہ نہیں۔  
 ”لیکن میرا مقصد یہی ہے کہ اسے تمہارا  
 رد دے ماروں۔“ اس نے غصے سے کہا تھا۔ خود کو  
 تکرہتی ہوئی وہ پھر سے پریکٹس روم میں لڑی تھی۔ ”تم  
 آج مشق نہیں ہو سکتے گی، بہتر ہے کہ تم گھر چلی جا  
 پریکٹس کروانے والے نے اس سے کہا تھا۔

☆☆☆

یہ یہی فاضل کا شوق تھا۔ جس میں اسے پر فارم کرنا تھا۔ اگر وہ اس میں باس ہوتی تھی تو آگے فاضل تک جاتی تھی۔ اس یہی فاضل کے لیے اس نے اتنی ہی محنت کی تھی جتنی وہ اپنی طور پر کر سکتی تھی اور جتنی اس سے ان دنوں ہو سکتی تھی۔ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی۔ اس سے کام پر نوکس نہیں ہوا جا رہا تھا۔ جتنا وہ سوچتی تھی کہ اب اس کا حمد ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ذہن اتنا ہی اس کے خلاف جا کر نجانے کون کون سے تعلق و عہدہ لانا تھا۔ دوستی کا تعلق، استاد کا تعلق، باس کا تعلق، مددگار کا تعلق اور ..... محبت کا تعلق۔

اس نے جیسا تیسرا پر فارم کر دیا تھا۔ ججز آپس میں مشورہ کرنے لگے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کی پر فائز اچھی نہیں تھی۔ ورنہ انہیں اس پر سوچ بچار نہ کرنی پڑتی۔

”آپ اگلے راؤنڈ کے لیے کوالیفائیڈ نہیں ہوئی۔ آپ کا سفر یہاں ہی ختم ہوتا ہے۔“ اس سے کہا گیا تھا اور اُنسو خود کار طرے سے اس کی آنکھوں سے نکلے تھے۔ ”ہمیں انسوس ہے۔ لیکن آپ اگلے راؤنڈ کے لیے نہیں جاسکتیں۔“ جبر اس کا دل رکھ رہے تھے اور اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ دو حائے مار مار کر روئے۔

ایک سے بیک اسٹیج آنے کا سفر جیسے صدیوں میں  
ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے شو کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی  
کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی اس کی وادری کرتا .....  
ایک ڈبیل ہی تھا جو اس کے پاس آیا تھا۔

”تم اس لیے نہیں ہاری! کہ تم میں ٹیلنٹ کی کمی ہے بلکہ تم اس لیے ہاری ہو کہ تم منتشر ہو۔“ ڈیوئل نے کہا تھا۔ لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

۱۔ دئے شخص سے جو بھی کہہ دیا جائے۔ اس کا  
لہو نہی نہیں لیں کر سکتا اور جتنے ہوئے شخص کو کچھ بھی برا  
کہا یا جائے۔ اس کی خوشی کوئی بات نہیں کر سکتی۔  
۲۔ دل کے کمرے میں واپس آ کر وہ دم سے  
۳۔ نے پرگری تھی اور رونا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے  
۴۔ جانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی اور اندھیرے  
۵۔ ابرے میں اب اس کے رونے کی آواز ایسے گونج  
۶۔ بنی تھی جیسے کمرے میں ایک ساتھ بہت سی چڑیا لیں  
۷۔ ائی ہوں۔ وہ اپنی اس ہار کا وہ دار بھی حمد ان کو ہی  
۸۔ مان رہی تھی۔

”تم آئے ہی کیوں میری زندگی میں حمدان!“  
 وہ روتے ہوئے شکوہ کر رہی تھی۔ اس سے جو حاضر  
 نہیں تھا۔

نجانے اسے اسی طرح روتے روتے کتنی دیر ہو  
گئی تھی۔ اس کی آنکھ لگ گئی تھی یا اس پر غنودگی طاری تھی  
کہ تھوڑی دیر کے بعد جبکہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

اندھیرے کمرے میں ٹی وی کی اسکرین روشن  
:دلی تھی اور وہاں پر ملیسا کی شکل نظر آئی تھی۔

”ہاں۔۔۔ میں نے ہی حمدان اور برہا میں پھوٹ ڈلوائی ہے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ لیکن نے اور میں نے مل کر دونوں کے ساتھ گیم بھی کھی لی تھی۔ حمدان خود سے نہیں آیا تھا کیون کے پاس۔۔۔۔۔ بلکہ کیون نے ہی اسے فورس کیا تھا کہ وہ شو ایلے کرے۔“ میڈا چلاتے ہوئے فی وی اسکرین پر لہری تھی اور بری طرح سے رورہی تھی۔

☆☆☆

ملیسارات گئے اپنے گھر آ رہی تھی جب ایک تیز رفتار کار اس کے پاس چڑھتا ہوا رکی۔ ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا تھا اور کار کے اندر سے ایسی نے جھپٹنے سے ملیسا کو اندر کھینچ لیا تھا۔ وہ چلا بھی نہیں سکی تھی۔ اس کے منہ پر نم رومال رکھا گیا تھا اور پورہ نہیں جانتی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ آٹھ کھلی ہاتھ ایک اندھیرے کمرے میں تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھ کر اسے ایک کرسی پر بیٹھایا گیا تھا۔

”کون ہے؟“ مجھے چھوڑو..... مجھے آزاد کرو..... کیا چاہتے ہو تم؟ کون ہے؟ کس نے مجھے اغوا کیا ہے؟“ بند اور اندھیرے کمرے میں وہ گھٹنوں چلائی رہی تھی اور کس نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ یہ سارا عمل اسے اپنی طور پر تھکانے کے لیے تھا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ محض دو ہی گھنٹوں میں طیسا چلاتے چلاتے بے دم ہو گئی تھی۔ اسے شاید بیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی سختی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ کل بار رہی تھی۔

”مجھے آزاد کرو، کوئی ہے؟“ وہ اب آہستہ آواز سے چلا رہی تھی۔

”مہاشکتی..... مہادیوی.....“ ایک جلالی آواز  
کمرے میں گونجی تھی اور ملیسا کی روح پرواز کرتے  
کرتے رہ گئی تھی۔

ک...ک...کون.....؟“

”تمہارے گناہوں کے بلیدان کے طور پر تمہیں اس قبر میں لایا گیا ہے۔ مہاشیخو خود تمہارے منہ سے تمہارے گناہ سننا چاہتی ہے۔ پھر ہی تم اس قبر سے نکل سکتی ہو.....“ آواز نے کہا تھا۔

☆☆☆

”ہاں..... میں نے ہی حیدران اور برہا میں چھوٹ ڈلوائی ہے۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ کیرن نے اور میں نے مل کر دونوں کے ساتھ کیم کھیلی تھی۔ حیدران خود سے نہیں آیا تھا کیرن کے پاس..... بلکہ کیرن نے ہی اسے فورس کیا تھا کہ وہ شو اکیلے کرے۔“ برہا چلاتے ہوئے ٹی وی اسکرین پر کھڑی تھی اور بری طرح سے رورہتی تھی۔

”مجھے وہ لڑکی شروع سے ہی پسند نہیں تھی۔  
میں چاہتی تھی کہ میں اسے مار دوں..... پھر میں نے  
اسے مار دیا، اس کی محبت کو مار کر.....“ عیسا رو تے  
ہوئے چلا رہی تھی۔

برہا حیرت سے سب دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک سے ٹی وی بند ہو گیا اور کمرے میں روشنی ہو گئی۔ برہا

کی اندھیرے کی عادی آنکھیں لمبے بھر کو چند حیاتی تھیں۔ کیتھی نے بچانے کہاں سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

”من لیا تم نے.....“ کیتھی نے کہا تھا۔  
 ”یہ سب کیا تھا کیتھی؟“ وہ ابھی بھی شکاک تھی۔  
 ”میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے۔“

”ابھی بھی نہیں سمجھیں، ابھی میں نے کر دیا ہے اس سے گناہ کا اعتراف..... مہاشتی نے.....“ کیتھی نے خود کو فخر سے بلند کر کے کہا تھا۔ ”اور جس کے تم اتنے خلاف ہو..... اس نے میسا کو اغوا کیا تھا۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر جیڈ نے۔ اس دن میں تمہیں یہ ہی بتانا چاہتی تھی کہ اس سب کے پیچھے میسا کا ہاتھ ہے۔ لیکن تم میرے آباؤ اجداد تک پہنچ گئی کہ اگر میں ایک بھی لفظ بولی تو تم سمجھو گی کہ ہم لوگ واقعی میں بے مہر ہوتے ہیں۔ پھر سوچا نہیں خط لکھوں اور اس میں یہ ساری تفصیل لکھوں۔ لیکن پھر وہ چینی قول یاد آیا کہ ایک تصویر ایک ہزار لفظوں سے بہتر ہوتی ہے اور دیکھو..... میسا کی ایک منٹ کی ویڈیو نے میرے ہزاروں لفظوں کو بچا لیا ہے۔“ کیتھی نے ساری تفصیل بتائی تھی۔ برہانے دم کی ہو کر رہ گئی تھی۔

”وہ میرے خدا! اس نے میسا کی ایسی ناقابل یقین حرکت برافسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیتھی اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔  
 ”نہ تم اتنے دعوؤں کے بعد برطانیہ گوٹ ٹیلنٹ جیت سکی ہو اور نہ ہی وہ امریکا گوٹ ٹیلنٹ..... پتا ہے کیوں؟ کیوں کہ خدا ہمیں بتانا چاہتا ہے کہ تم الگ الگ کچھ بھی نہیں ہو۔ جو وہ وہ ایک ساتھ ہو۔“ کیتھی نے بے حد گہری بات کہی تھی۔ اس نے کیتھی کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔  
 ”ہاں میری جان! یہ سچ ہے۔ تمہاری محنت پر

مجھے کوئی شک نہیں..... لیکن جڑ کے ہٹا پودا بھی با حاصل نہیں کر سکتا اور تنے کے ہٹاتے بھی نہیں آ سکتے۔ اسے تمہاری جیسی ہیملر نہ لی اور تمہیں اس سے استاد۔“ کیتھی جو کہہ رہی تھی سچ کہہ رہی تھی۔ برطانیہ گوٹ ٹیلنٹ کی پوری ٹیم جو اسے تیاری کر رہی تھی ان سب پر ایک حمدان والی میں بھاری تھا۔ وہ دیکھ کر دل کے ساتھ سب سن رہی تھی۔

”اپنی ہار کو اپنی جیت بنالو، میری پیاری.....“  
 ”کیسے؟“ وہ رندمی آواز سے پوچھنے لگی۔  
 ”اس ہارے ہوئے شخص کو کبھی اپنے ساتھ ملاؤ۔ وہ ہارے ہوئے لوگ پھر سے محنت کر دیا دیکھو کہ ساری کیسے تمہارے قدم چوتی ہے۔“  
 ”لیکن میں اسے اپنی زندگی سے نکال چکی ہوں اور وہ بھی کہہ چکا ہے کہ وہ اب بھی مجھے نہیں ملے گا۔“ برہانے کہا تھا۔ لیکن کیتھی جیسے سن نہیں رہی تھی۔ اس نے بنا برہانہ کی اجازت کے حمدان کو کال دی تھی۔

”کسے کال کر رہی ہو؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی تھی۔  
 ”حمدان کو..... لیکن اس کا نمبر بند جا رہا ہے لگتا ہے اب نیویارک جا کر ہی اس سے ملنا ہوگا۔“

☆☆☆

حمدان کہاں تھا اس کا کسی کو نہیں پتا تھا۔ اس کے گھر سے پوچھنے پر پتا چلا تھا کہ وہ وہاں غائب ہے یعنی جب برہانے چلینگ روم میں اس کے بے عزتی کی تھی تب سے..... اس کے دوستوں بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔  
 ”ہمیں تو خود نہیں پتا کہ وہ کہاں گیا۔ اچانک سے ہی غائب ہو گیا ہے۔“ سب کا یہی کہنا تھا۔ جہاں جہاں جا سکتی تھی وہ جہاں جہاں اسے شک تھا کہ وہ ہوگا اس نے اس کا پتا کیا تھا لیکن کہیں نہیں تھا۔

”جار ہا ہوں اور اب ایسے جاؤں گا کہ تم مجھے ڈھونڈنا چاہو گی تو میں تمہیں نہیں ملوں گا

ان نے جاتے وقت کہا تھا۔  
 اسے اس کی بات یاد آئی تھی اور اس کی روح میں مطلق ہو گئی تھی۔ ”تو اس نے وہ کر دکھایا تھا ان کا دعویٰ کیا تھا۔“

حمدان کی امی الگ رو رہی تھیں۔ ان کے ان بیٹے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ جیڈ الگ اسے تلاش کرتے ہوئے بلکان ہو رہا تھا۔ کیتھی الگ مہاشتی، بہاد پوی کی مدد لے رہی تھی اور فلپٹ میں ری می اس کا بند بانی سہارا بنی ہوئی تھی۔ جس طرح انہوں نے ایک وقت میں برہانہ کو تلاش کیا تھا اب وہ سب اسی طرح حمدان کو تلاش کر رہے تھے اور حمدان خود چھپ کر جیسے اپنی تلاش کا برہانے بدلے لے رہا تھا۔

”اگر یہ میرا ہونا جائے تو میں دنیا کی اس مملکت کی مالک بن جاؤں گی جو آج سے پہلے شاید ان کسی کو نصیب ہوئی ہو۔“ ایک بار اسے ہنستا ہوا دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔ یہ بات یاد آتے ہی اسے وہ اور اس کی ہنسی یاد آگئی جو اس وقت اس کے بس سے باہر ہو رہی تھی اور تھکنے میں نہیں آ رہی تھی۔

”اپنی شکل دیکھو ذرا..... بھوت بگلا بنی ہوئی اور تمہاری آواز..... کاش میں اسے ریکارڈ کر لیتا۔ امی.....!“ اس نے اس کی نقل اتاری تھی اور پھر دل کھول کر ہنسا شروع ہو گیا تھا۔

”حمدان..... مجھے بچاؤ.....“ ہاتھ اس نے اپنے منڈوں میں دے لیے تھے اور اب دہرا ہوا جا رہا تھا۔  
 سب یاد کر کے وہ خود بھی مسکرا اٹھی تھی۔  
 ”شکر ہے ان پندرہ دنوں میں تم بھی گمراہ نہیں رہی۔“ ری می نے کہا تھا۔ وہ پھر سے سنجیدہ ہو گئی تھی۔ جیسے اس کی مسکراہٹ کوئی گناہ ہو۔

”یعنی مجھے تمہیں پتہ ہے کہ کراہٹ کیسے ہونی چاہیے۔“ ری می افسردگی سے کہہ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔ بہار آچکی تھی۔ ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے ان اس کی آنکھوں کو بچانے کیوں کانٹے ہی نظر آ رہے تھے۔ عجیب کھیل کھیل رہی تھی اس کی تقدیر تھا اس کے ساتھ..... پہلے حمدان اس کے پاس آ رہا

تھا اور وہ نہیں مان رہی تھی۔ اب وہ اسے ڈھونڈ رہی تھی اور حمدان اسے نہیں مل رہا تھا۔ کیا محبت جدائی کا خراج ضرور لیتی ہے۔ کیا اسے ناراضی، غصے، انا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی انسانوں کو نفرت ہے۔

”مجھے اب پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔“ ایک دن اس نے ری می سے کہا تھا۔ ری می نے ڈھک سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اگلے دن سے اس نے اپنا سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا دہاں پر کوئی نہیں تھا تو یہاں پر بھی وہ سب کچھ کھو چکی تھی۔

☆☆☆

”کیتھی یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو۔“ وہ لڑکھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ کیتھی نے اس کے پیچھے ہارچ پکڑی ہوئی تھی جس جگہ وہ دونوں آئی تھیں اس جگہ دنیا بنے سے بھی پہلے والا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جگہ بہت دیران اور اونچی پٹی تھی۔ وہ یقیناً کوئی کھنڈر تھا۔ جہاں بہت سے درخت بھی تھے۔ کوئی تباہ شدہ ہوئی تھا یا بلند گئی یا شاید کیتھی اسے مرخ کر لے آئی تھی۔

”کیتھی..... یہ کون سی جگہ ہے۔“  
 ”جاو رہتی.....“ کیتھی نے اس کے کان کے پاس منہ لاکر فیسول خیزی سے کہا تھا۔  
 ”یہاں چوہوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا اور تم کہہ رہی ہو کہ یہاں حمدان ہے۔“ اس نے کہا تھا لیکن اسے اپنی بات کا کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا اور جیسے ملک الموت کو دیکھ لیا تھا۔ کیتھی وہاں نہیں تھی۔

”کیتھی.....“ اس نے ہلکی آواز سے پکارا تھا۔  
 ”کیتھی..... کہاں ہو تم..... کیتھی! پلیز مذاق مت کرو..... سامنے آ جاؤ..... میں اس طرح سے ڈرنے والی نہیں۔“ وہ کتنی ڈرنے والی تھی۔ یہ اس کی لڑکھائی ہوئی آواز بتا رہی تھی۔

”کیتھی.....! کہاں ہو تم.....؟“ وہ چلانے کے سے انداز میں بولی تھی۔ لیکن جواب نہیں آیا تھا۔  
 ”کیتھی.....“ اور اب کی بار وہ چلا اٹھی تھی کیونکہ اندھیرے میں نئی نئی آوازیں نے جنم لے لیا



# عمر بیکاروشی چلو

تشریفہ ریاض

ساتویں قسط

نارولٹ



اگلی دفعہ پر..... ”میں نے تمہاری سانسوں کی خوشبو کو اپنے جیسا پایا۔“  
اگلی دفعہ پر..... ”پھولوں کی خوب صورتی مجھے تمہارے آگے کھینچی۔“  
اگلی دفعہ پر..... ”مجھے لگتا ہے تم اور میں ایک مٹی سے بنے ہیں۔“  
اگلی دفعہ پر..... ”تو آؤ..... پھر ایک ہو جاتے ہیں۔“ روشنی بند ہو کر پھر سے روشن ہوئی تھی اور برہنہ دھک سے رہ گئی۔

”مجھ سے شادی کرو گی؟“ ساری تتلیاں اور پھول پھر سے نکل آئے تھے۔ بورڈ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ سر جھکائے اس عبارت کا عمل بنا بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ (تو کیا یہ بھی خواب کی تعبیر.....؟)

”جاؤ..... یہ ہی تو ہے تمہارے خواب کی تعبیر.....“ کبھی نجانے کہاں سے نکلی تھی اور اس سرگوشی میں اس کے کان میں کہہ رہی تھی۔ مکالمہ کبھی..... اس کے ایک خواب کی کوئی چوٹی تعبیر اسے بتا رہی تھی۔

نحمدان کا ہاتھ مستقل اس کے ہاتھ کا منتظر تھا کون سی تعبیر اصل تھی وہ نہیں جانتی تھی لیکن اس بڑھ کر کوئی اور تعبیر وہ چاہتی بھی نہیں تھی۔ ہاں..... ہی تو تھی اس کے خواب کی حقیقی تعبیر..... اس نے نہیں کی تھی اور آگے بڑھ کر حمدان کا ہاتھ تمام لیا تھا آسمان پر جلتی رنگ نگر رہے تھے۔ اس نے آ نکب آسمان سے اترتی ان آوازوں پر بھی توجہ دی تھی۔ اب جب وہی تھی تو جھوم اٹھی تھی۔

☆

تھا۔ جو جانی پہچانی نہیں تھیں اور جان نکال دینے والی تھیں۔

”امی.....“ اس نے نعرے لگانے کے سے انداز میں کہا تھا اور وہاں سے بھاگی تھی اور تب ہی ویرانے میں ایک قہقہہ بلند ہوا تھا۔ جس نے اس کے قدم روک دیا تھا۔ دور کہیں ایک روشنی ہوئی تھی اور اس نے دیکھا تھا کہ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ کون.....؟ آنکھوں کو پہچان ملی تو دل کو دھڑکن بھی مل گئی اور زندگی کو سانس لیں.....

وہ حمدان تھا..... قدرے دور اور اونچائی پر..... سیاہ پیٹ کوٹ میں۔ سر پر پیٹ ڈالے..... پھر اس نے اسی ہیٹ کو اتار کر سر کو تنظیم کے انداز سے نیچے جھکا دیا تھا۔

”مس برہنا.....! اپنی زندگی کا سب سے بڑا جاو..... آپ کے لیے.....“ اس نے اسی کے انداز میں کہا تھا اور اپنے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کے پاس لاکر بڑے پیار سے اور مدھرتا سے ایک پھونک ماری تھی۔ سنہری برادے، افشائ کی ایک لہر اس کے ہاتھ کی انگلیوں کی پوروں سے اس کی پھونک کے زور اثر اگلی تھی اور تو س بنائی، اُڑتی ہوئی برہنا تک گئی تھی۔ برہنا کی ساری نظریں اس ایک کرتب نے اپنے پاس تمام عمر کے لیے رہن رکھ لی تھیں۔

پھر ایک دم سے لائٹ بند ہوئی تھی اور اگلے ہی پل روشن ہوئی تھی۔ اب وہ تتلیوں کے جھرمٹ میں تھا۔ اس کے آس پاس بہت سی رنگ پرنگی تتلیاں تھیں۔ روشنی بند ہو کر پھر سے جلی تھی۔

اب اس کے آس پاس پھول ہی پھول تھے۔ پھر یہ کھیل شروع ہو گیا۔ روشنی بند ہو کر جلنے کا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک سفید بورڈ تھا۔ جس پر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ اگلی باری پر اس پر ایک عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ”تم نے پہلی نظر میں مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔“

اس سے اگلی باری پر..... ”میری زندگی سے ادھر واپس..... مجھ سے کہیں بہت دور چلا گیا۔“

ساتھیو! میرے بیٹے کے لیے وہ وقت بہت مشکل تھا لیکن آپ سب کو اس کے حوصلے کی داد دینی چاہیے کہ وہ بہت بہت کے ساتھ یہ سب برداشت کر رہا تھا۔ آپ کو اب احساس ضرور ہوا ہوگا کہ وہ منہ پھٹ اور خود پسند تو تھا لیکن خود غرض نہیں تھا۔ اس نے ہماری خاطر زر میں کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن اس نے اس مسئلے کا جو حل نکالا تھا وہ ہمارے گمان میں بھی تھا اور حراب عرف سونیا ہر قدم پر اس کے ساتھ تھی۔ اس کے باوجود ہماری زوجہ محترمہ کی خواہش کے پورے ہونے کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ ملتا تھا۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔

☆☆☆

”مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔“ عطیہ بیگم نے ماسٹر جی کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی دکان سے واپس آئے تھے اور عادت کے مطابق انہوں نے آتے ہی انٹش کے متعلق سوال کیا تھا۔

”آپ کے تحت جگر کے مزاج کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ماسٹر جی۔“ عطیہ بیگم نے بے تاثر سے لہجے میں کہا تھا۔ ”پہلے ہر وقت کمرے میں بند رہتا تھا کچھ پھر کچھ بھل سا گیا اور ہنسنے بولنے لگا۔ کھانا بھی وقت پر اور گھر میں کھانے لگا تھا۔ اب پھر کچھ دن سے پھر ہر وقت جلا بھٹا نظر آ رہا ہے۔ صبح کا گیارہ گھنٹے کو واپس آتا ہے اور بات کر دو تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ کھانے کا جب بھی پوچھا تو فرما دیتے تھے کہ کھا کر آیا ہوں یا بھوک نہیں ہے۔ میں نے بھی ناراض ہو کر پوچھنا ہی چھوڑ دیا تو سونیا سے کہتا ہے کہ تم نے میری ای کو نا صرف کامل بلکہ خود غرض بھی بنادیا ہے۔ انہیں فکری نہیں ہوتی کہ اکلوتے بیٹے کو کھانے کا بھی پوچھنا ہے۔ بتاؤ کل کی بیٹی سے ماں کی شکایتیں کر رہے ہیں حضرت۔“ عطیہ بیگم شکوہ کر رہی تھیں۔ ماسٹر جی بیٹے کی حمایت میں کچھ بولنے سے پہلے ذرا سا مسکرائے۔ عطیہ بیگم نے سر جھکا جیسے انہیں یہ مسکراہٹ ایک آنکھ نہ بھائی ہو۔

”جی جی مجھے پتا ہے۔ اب آپ کہیں گے۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے۔ وہ بد مزاج نہیں ہے۔ بس کچھ لا پر دے اور نہ محبت تو بہت کرتا ہے۔ مجھے وغیرہ وغیرہ۔ دراصل آپ کی ان ہی باتوں نے اس مزاج سوائیز پر پے پچھڑا رکھا ہے ماسٹر جی۔ بچپن آپ نے اسے بھی نہیں ٹوکا۔ ہمیشہ اس کی حمایت ہے۔ اس کی ہر بات مانی ہے تب ہی یہ دن دیکھتے رہے ہیں ہمیں۔ بہت بد مزاج اور خراب ملا سا ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے تو اس بات کی فکر ہے کہ بچپن کی سبیلی سے سامنے ناک کٹ جائے گی میری۔ کیسے گزارا کرے گی سونیا اس کے ساتھ۔“ وہ پریشانی کا اظہار کر رہے تھیں۔

ماسٹر جی چونکے اور کچھ کہنا چاہا۔ اپنی اہلیہ کو کر دانا چاہا کہ یہ قصہ تو تم ہو چکا تھا لیکن پھر کچھ کر خاموش رہے کہ وہ اس بحث سے اکتا چکے اب اور یہ بات بخوبی سمجھ چکے تھے کہ ہر تیسرے اہلیہ کو پیندو نصائح کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آج تو ان مزاج کچھ اچھا تھا اور بیگم سے الجھ کر وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتے تھے جبکہ وہ عادت کے مطابق انٹش کی شکایتیں کرنے میں ملن تھیں۔

”میری بات کہیں لکھ کر رکھیں ماسٹر جی۔ آپ کا ہونہار بیٹا ہمیں خاندان میں خوب شر کر دانے والا ہے۔ بے چاری بچی کو بہت مشکل اس کے ساتھ رہنے میں۔ گو نے دیا کرے گی۔ ممانی نے خاک تر بیت نہیں کی اپنی اکلوتے بیٹی سے جسے جلی بھٹی بیٹی تھیں۔ انٹش چند دن سے الجھا الجھا سا نظر آتا تھا جس وجہ سے وہ کچھ پریشان تھیں لیکن ان کا خیال رکھنے کا انداز ایسا ہی تھا ہی ماسٹر جی سے اس کی شکایتیں کرنے لگی۔ ماسٹر جی نے لفظ ”بھائی جان“ پر گہری سانس لی تھی۔ اب تو بالکل واضح ہو گیا تھا کہ وہ سونیا کی بات کر رہی تھیں۔

”آپ یہ کس سمت چل پڑیں۔ آپ کیوں نہیں آ رہا کہ اس اسٹیشن پر کھڑے رہے۔“

وہ نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے کی ٹرن اس اسٹیشن کو پہنچنے میں نہیں گزر رہی والی۔ اس لیے آگے بڑھیں۔ یہ کچھ سوچیں۔“ ماسٹر جی بچی بار اس موضوع پر بات کرتے ہوئے انداز میں بات کر رہے تھے۔ بیگم جھنجھلا گئیں۔ انہوں نے زندگی میں کسی بھی بار ماسٹر جی کا اعتراض یا مزاحمت برداشت نہیں کی تھی لیکن اس موضوع پر وہ ہمیشہ ہی ان کی مخالفت کرتے تھے جو انہیں بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

”ماسٹر جی! آپ اب بھی نہیں سمجھتے تو خدا کی قسم کب سمجھیں گے۔ آپ نے انٹش کی ماں کر لیا ہے۔ کچھ نہیں ہاتھ آیا آپ کے۔ اب آپ کو اپنی سنی پڑے گی اور میرا فیصلہ یہی ہے۔ سونیا ہی بیٹی ہوئے گی۔ اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے جانے والی پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔“ انہوں نے قطعیت سے لہجے میں کہا تھا۔ ماسٹر جی اس سمت میں بیٹھے سمجھ نہ پا رہے تھے۔ انٹش کی لڑکی تھی۔ انہوں نے اپنی دیر پہلے وہاں کرسی رکھے سونیا کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ اگر جواب دہاں موجود نہیں تھی لیکن وہ وہیں کہیں انٹش میں موجود تھی۔ اس نے یقیناً وہ سب سنا تھا جو بیگم کہہ رہی تھیں۔ ماسٹر جی کو اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ انٹش چاہتے تھے کہ یہ باتیں بار بار سونیا تک پہنچیں لیکن انہیں اس معاملے میں لا پر دہونی جاری تھیں۔

☆☆☆

”کیا سوچا ہے تم نے۔ اب کیا کرو گے؟“ انٹش نے اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

عطیہ بیگم پڑوس میں کسی کی بیمار پرسی کرنے گئی تھیں۔ انٹش آفس سے جلدی آ گیا تھا۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے سونیا اس کے لیے دوا دے رہی تھی۔

”نانی دن بعد کی بات تھی۔ اس رات کے بعد انٹش کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ سونیا چاہنے کے باوجود اسے کمرید نہیں لگتی۔ کیونکہ وہ بلا وجہ کی جرح سے بہت جلدی

چڑھایا کرتا تھا اور بد مزاجی پر اتر آتا تھا۔ اسی لیے اس رات کے بعد سے اس معاملے میں سناٹا ہی چھایا ہوا تھا۔ لیکن پھر اس کی مسلسل خاموشی سے اکتا کر سونیا کو ہی یہ موضوع چھیڑنا پڑا تھا۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس کے والدین کینیڈا سے آنے والے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ امی کی واپسی کے ساتھ ہی پھر وہی پرانا موضوع چھڑ جائے گا۔ وہ ان کی واپسی سے پہلے سب چیزیں ٹھیک کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے خود ہی بات کا آغاز کیا تھا۔ انٹش نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پہلے تو شور بے دالے سا لیا کہ کو دیکھ کر منہ بنایا پھر اکتا کر پلیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استغناء میں انداز میں پوچھنے لگا۔

”کھانا تم نے بنایا ہے؟“ سونیا نے اس کے چہرے کے تاثرات کی جانب دیکھا پھر ذرا سا آگے ہو کر اس کی پلیٹ کی جانب دیکھا۔

”ہاں۔ لیکن تمہیں کیسے پتا چلا۔“ اس نے کچھ حیران ہو کر پوچھا تھا کیونکہ اس نے تو ابھی ایک لقمہ بھی نالیا تھا۔ انٹش کے چہرے کے تاثرات مزید خراب ہوئے۔

”اتنا وسیع و عریض شور بے دالا سا میری امی نہیں بنا سکتیں۔ انہیں پتا ہے میں ایک بونی کی خاطر شور بے کے اس تالاب میں سوئمنگ کرنے کے سخت خلاف ہوں۔“ روٹی کے ٹکڑے کو توڑ کر پلیٹ میں گھماتے ہوئے اس نے ناپسندیدگی سے کہا تھا۔ سونیا کو اس کا یہ جملہ سخت برا لگا۔

”یہ ذرا سا شور بانٹیں تالاب لگ رہا ہے؟“ وہ بھی ناگ چڑھا کر پوچھ رہی تھی۔ عطیہ بیگم کی طبیعت کچھ ناساز تھی سو اس نے سا لیا تھا۔ انٹش نے سر جھٹک کر بڑے بالکل اپنے سامنے کی پھر ایک نظر سا لیا والی پلیٹ اور دوسری اس کے چہرے پر ڈھل کر بولا۔

”چار فٹ دس انچ کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ واقعی تالاب نہیں بلکہ سمندر ہے۔“ وہ اسے

چڑانے سے باز نہیں آتا تھا۔ سونیا کو مزید بزدل لگا۔  
 ”تو پھر لگا دو غوطہ اس سمندر میں۔ ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں تو فائدہ ہو تمہیں بھی، تمہارے اس چھٹ فٹ قد کا درنہ اب تک تو ہم نے گھانا ہی ہوتے دیکھا ہے۔“ اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ آتش کھوکھلی سی ہنسی دیا جیسے کسی بچے کے احمقانہ طرز عمل پر ہنسا جاتا ہے۔ سونیا کو شرمندگی سی ہوئی وہ اسے طنز نہیں دینا چاہتی تھی لیکن وہ اسے مجبور کر دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ معذرت کرتی وہ بولا تھا۔  
 ”اب نہیں ہو سکتا کسی کو بھی فائدہ۔ سیانے کہتے ہیں جب پھل پیری کا سایہ کسی مرد آہن پڑ جائے تو قدر میں بس گھانا ہی آتا ہے۔“ سونیا کو دو سیکنڈز لگے تھے اس کی بات سمجھنے میں پھر جب سمجھ گئی تو نہایت بری شکل بنا کر بولی۔  
 ”میں تو پھل پیری نہیں ہوں۔“

”ہاں تو میں نے بھی کب خود کو مرد آہن کہا ہے۔ وہ تو شور باد کیلک کر مجھے احتشام غریب کی یاد آگئی تھی۔“ سونیا اس ذکر پر مزید جھنجھلا سی گئی۔ اسے آتش کے منہ سے اس لڑکے کا ذکر بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اس بات پر وہ خود بھی حیران ہوئی تھی کیونکہ دیکھنے میں وہ بہت مہذب نیز دار اور وجہ لڑکا تھا پھر وہ سونیا کی طرف مائل بھی تھا لیکن پھر بھی اسے اچھا نا لگتا تھا۔

”تمہارے سیانوں کی ایسی کی تھیں۔ مجھے پرانے زمانے کی دانشوری والی باتیں سنا سنا کر مرعوب مت کر دو۔ میں خود بہت بڑی دانشور ہوں۔“ وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آتش اس سے زمین کی بات کرے لیکن سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ براہ راست کیسے پوچھتے۔

”ارے بھائی ہم نے لوگوں کو مرعوب کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں ہماری اوقات پتا چل گئی ہے۔ ہاں ہاں ہم دہی ہیں آتش..... آتش غلام حسین۔ خاندان غلام والے۔ اس لیے خاموشی سے ہمیں یہ شور با زہر مار کرنے دیا جائے۔“ وہ درویشانہ انداز

میں بول رہا تھا۔ سونیا نے اس کے بدلے ہوئے پر غور کیا تھا۔ وہ ابھی بھی سنجیدہ نہیں تھا اور بظاہر گھانے میں گھنٹا لپکن چہرے کے تاثرات بدل سے گئے تھے۔ سونیا نے چند لمحے کچھ نہیں کہا کچھ میں ہی نہیں آ رہا تھی کہ کیا کہے، اسے کیے دے پھر اس نے تسلی دینے کا ارادہ ترک کرتے ہو چھٹی لیا تھا۔

”زمین سے بات ہوئی تمہاری؟“ آتش اس سوال پر مزید ابرام نہ بنا کر نوالہ منہ میں رکھا تھا۔  
 ”کون زمین؟ میں کسی زمین کو نہیں جانتا۔ وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ سونیا نے گہری سانس بھری۔ وہ اس موضوع پر بات کرنا چاہتی تھی۔ آتش کے خچرے ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ کوئی باز لڑکی نہیں تھی لیکن سستی کا بلی سے چڑھی اسے جب کسی کام کو کرنے کا ٹھکان لیتی تھی تو اسے پایہ تک پہنچا کر ہی دم لیتی تھی۔ اس نے دل ہی دل آتش کی مدد کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ یہ اور بات ہے اس کے اس عزم کی خبر اس کے بوا صرف ایک گھنٹہ تھی۔

”تمہیں اس سے بات کرنی چاہیے آتش ایسے تو نہیں چھوڑا جا سکتا اس بات کو۔ تم مجھے اس فون نمبر دو۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔ مل کر بیٹھتے ہیں۔ بات کرتے ہیں۔ مل جل کر درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

منہ تک نوالہ لے جاتے آتش کے ہاتھ لہرے رکے تھے۔

”اس دادی پر خار میں کوئی درمیانی راستہ ہے مائی ڈیئر چارٹ دس اچ۔ تمہیں کیا خبر کہ تم زندگی سوئی میں دھاگے پڑتے ہوئے گزارا محبت خطرناک نہیں ہے۔ یہ سانپ سیرھی کا کھیل کرتی ہے یا تو آپ ہیں یا پھر نہیں ہیں۔ اس یہاں دہاں، ادھر ادھر والی چالوں کی گھنٹا کشم ہوئی ہے۔“ وہ ابھی بھی سنجیدہ نہیں تھا لیکن چہرے کے تاثرات میں نرمی بھی نہیں رہی تھی۔ اس

لوگوں میں ٹھکرائے جانے کا غم جھلکنے لگا تھا۔  
 ”غافل کہہ رہے ہو تم۔ محبت بھی ختم نہیں ہوتی۔“ وہ زچ ہو کر بولی تھی۔ ایک تو اپنے دل سے محبت جیسے معاملات پر بات کرنا بھی لازمی تھی کہ جس کے ساتھ آپ کے اپنے رشتے اہمات بزرگوں کے درمیان راکھ میں کہیں دبی ہوئی ناک کی طرح بڑی سنگ رہی ہو۔

”یہ کس بخت نے کہا کہ محبت ختم ہوگئی ہے۔ کیا ہے۔ جی نہیں۔ محبت دائمی ختم نہیں ہوتی لیکن ختم ہو جایا کرتا ہے اور دہی ہو گیا ہے۔ ختم شد۔“ وہ جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔

”اسی کو بچانے کی بات کر رہی ہوں۔ اے ل مند آدی۔ اس سے بات کر دو۔ کوئی حل نکالو۔“

وہ اپنے سر جھٹک کر مشورہ دیا تھا۔  
 ”محبت اب نہیں ہوگی اور محبت کی بات تو بالکل بس ہوگی۔ یہ میں نے نہیں کہا۔ یہ ایک عظیم شاعر نے خیالات ہیں آگے جا کر وہ مزید تفصیل سے باتیں ہیں کہ محبت اب نہیں ہوگی۔ یہ کچھ دن بعد ہی ہوگی۔ گزر جائیں گے جب یہ دن۔ یہ ان کی یاد کی ہوگی یعنی تھک بار کر تشریح ہوتی ہے کہ بخت نے سکون نہیں لینے دینا زندگی میں۔“ وہ اب نری نوالے بنا رہا تھا۔ منہ نوالے سے بھرا ہوا تھا، پے پر سنجیدگی کا نام و نشان نہیں تھا لیکن آنکھیں بس کہ بے روٹی چھپائی نہیں پاری تھیں۔

سونیا کا دل چاہا اپنے سامنے بیٹھے اس شخص کو چھت ختم کی باتیں سنائے اور یہاں سے اٹھ جائے۔ اس کے صبر کا پیمانہ باتوں کے معاملے میں اہلدی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ وہ کبھی بھی تقریروں سے اٹھ کر پریقین رکھتی تھی لیکن آتش اس کے بالکل متاثر تھا۔ وہ شاید ابھی اس غم سے نکلنے کا خواہش مند تھا۔ اس کی باتیں طویل اور بے سرد پانچھیں۔ انے گہری سانس بھری پھر اپنی جگہ سے اٹھتے نہ بولی۔  
 ”تم اس موضوع پر بات کرنا ہی نہیں چاہتے۔“

لیکن اگر تم بات نہیں کرو گے تو تکلیف میں رہو گے۔“ آتش کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اس نے سک میں ہاتھ دھوئے پھر بنا اس کی جانب دیکھے بولا۔  
 ”پہلی بات تو تکلیف ہوئی کیونکہ میں رخصت کو چھیل چھیل کر تازہ کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ دوسری بات مجھے جب تک تکلیف ہوگی۔ میں اپنے باپ کا چہرہ دیکھ لیا کروں گا۔ ان کی خاطر سب چھوڑ سکتا ہوں۔ سب کچھ..... تیسری بات میں ابھی خود سوچ رہا ہوں کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ جب سوچ لوں گا تو تمہیں بتاؤں گا ضرور۔“ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ سونیا بس اس کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ کتنا بدلا بدلا سنا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

”آپ کو چاہیے کیا میڈم؟“ آتش نے اسے ایک دکان سے نکل کر دوسری دکان اور دوسری سے تیسری میں خوار ہوتے دیکھا تو اتنا کرا کر سوال کر بیٹھا۔ اسے کچھ ضروری سامان چاہیے تھا وہ ماسٹر جی کے ساتھ ان کی دکان پر آگئی تھی۔ اس نے ان سے ذکر کیا تھا کہ وہ اپنے کام کو بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے اور اسے کچھ پرڈیشنل قسم کی مشینری درکار ہے اسی لیے ماسٹر جی نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ چاہے تو ان کے سب شاگردوں کے ساتھ مل کر اپنے بزنس کے سلسلے میں مشورے لے سکتی ہے لیکن وہ نالتی جا رہی تھی پھر اب جانے کیا دل میں سمائی کہ ان کے ساتھ چلی آئی۔ فیشن ٹریڈر، رنگ اور رجحانات پر سب سے ہی باتیں کرتی رہی پھر دہی پر اسے یاد آیا کہ اسے تو اپنے موتی دھاگے جیسی اشیاء کی خریداری بھی کرنی تھی۔ ساہیوال سے جو سامان ساتھ لائی تھی وہ ختم ہو چکا تھا۔ ماسٹر جی نے آتش کو نوں کر کے بلوایا تھا کہ وہ اسے خریداری کر داکر گھر واپس لے جائے لیکن وہ اس کی مطلوبہ دکانوں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا اسی لیے خوار بھی زیادہ اٹھانی پڑ رہی تھی۔ آتش اس بے وجہ کی مصروفیت سے جھنجھلا نے لگا تھا۔  
 ”میں غن تلاش کر رہی ہوں۔ ذرا بڑے ڈایا

میٹر کے۔ رنگ بھی کچھ گہرے ہونے چاہئیں۔“ اس نے اسے جواب دیا پھر دکان دار کو اشارے سے ایک جانب نمایاں کر کے رکھے گئے بن دکھانے کا اشارہ کیا تھا۔

”تم ان کا کردگی کیا؟“ اس نے سوال برائے سوال پوچھا تھا سونیا نے بظن غایت اسے دیکھا پھر بولی۔

”میں ایک نیا پر جیکٹ کرنے والی ہوں جو میں نے پہلے نہیں کیا۔ میری ایک کلاٹ ہے۔ اسے میرا کام بہت پسند ہے تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ڈریسز میں بھی ڈیل کر سکتی ہوں۔ میں نے ہاں بول دیا۔ اب اس نے مجھے آرڈر دیا ہے۔ اسے کچھ ٹرینڈی قسم کے جیکٹس چاہئیں۔ جو وہ گریسوں کے موسم میں بھی استعمال کر سکے۔ وہ ذرا مختلف قسم کی چیز چاہتی ہے یعنی فیشن کے مطابق بھی ہو اور گریس فل جی۔ ساری گفتگو کا کل خلاصہ یہ کہ میں اس قسم کی جیکٹ بنانا چاہ رہی ہوں جو ٹرینڈی اور اسٹائلش ہونے کے ساتھ ساتھ پروڈاکر بھی لگیں۔“ اس نے ایک اور بن دیکھتے ہوئے بتایا تھا۔

اتش اس دوران دکان کے اندر کی جانب ہو کر خود سے مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا تھا۔ وہ کشیدہ کاری سے متعلق سامان سے بھری ہوئی دکان تھی اور وہاں بڑی مختلف چیزیں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول رہی تھیں لیکن سونیا کی بات کا جواب دینا بھی فرض تھا اس پر سو چند منٹ کے وقفے کے بعد طنز یہ انداز میں بولا تھا۔

”اچھا یعنی تم اتنی دیر سے ایسے بن ڈھونڈ رہی ہو جو قطر بننے کیف بھی ہوں لیکن ضرورت پڑنے پر ہیما مانی بھی بن سکیں؟“ اتش نے پیچھے دیکھے ہانہ بنا کر کہا تھا۔ سونیا کو تو اس کی بات پر ہنسی نہیں آئی لیکن دکان دار کے ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اب کی بار اتش نے مزہ کر دیکھا۔ سونیا اسے نظر نہیں آئی تھی لیکن دکان دار کے چہرے پر مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

”آپ کو بہت ہنسی آ رہی ہے بھائی صاحب۔“

”میڈم چلی گئی ہیں سر! آپ خود سے ہی بات کرنے میں مگن ہیں۔“ اس نے وضاحت کی۔ اتش نے حیرانی سے دکان کی انگریز کی جانب دیکھا تھا سونیا واپسی جا چکی تھی۔ اتش دکان دار کی جانب دیکھ کر بغیر خود بھی باہر نکل گیا۔ سونیا چند قدم کے فاصلے چلتی نظر آئی تھی۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور ایک لمحے میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

”انتہائی بدتمیز ہوتم۔ میں وہاں کھڑا ہوا تھا اور منہ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔“ اس نے طعنہ دے والے انداز میں کہا تھا۔

”تم کیا چاہتے تھے۔ میں منہ وہیں چھوڑ آ جاتی؟ پھر خوش ہو جاتے تم؟“ سونیا کے انداز میں شرارت تھی اور چہرے پر ہنسی کی جھلک تھی۔ اتش اسے گھور کر دیکھا پھر گہری سانس بھر کر اس کے سامنے چلنا ہوا بولا۔

”ایک تو میں تمہارے اس گھسے بے نیلے آف ہیومر سے بہت تنگ ہوں۔ اتنی تنگی ہوئی بات کرتی ہو اور پھر ہنسی ایسے ہو جیسے بہت ہی کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ میری بات سنو۔ محراب عرف سونیا بی۔ یہ کراچی ہے۔ ایسے بوسیدہ لطیفے یہاں بچوں کتابوں میں بھی نہیں چھپتے۔“ اس کے کہنے کا اتش ایسا تھا کہ سونیا ایک بار ہنس دی۔

”ہاں، تنگی کچھ کہہ رہے ہو تم اور چھپیں بھی کیے ایسے لطیفے۔ جب چلتے پھرتے لوگ ہی ہنسانے ہوں تو کتابوں سے لطیفے کیوں پڑھے گا کوئی؟ اس کو سنار ہی تھی۔

”وہ جو ستائشی جملہ میں نے لمحہ بھر پہلے کے سنیس آف ہیومر کے لیے بولا تھا۔ اس کے جواب میں اسے ہی مکرر سمجھ لیا جائے۔“ وہ ہنسی سے کہہ رہا تھا۔ سونیا مسلسل مسکراتے مصروف تھی۔ اسی دوران وہ اس جیسے کی جانب تھے جہاں چند ایک بوئیکس بنی ہوئی تھیں۔

”دو منٹ کے لیے یہاں چلیں؟“

آنیدیا لینا جا چتی ہوں کہ آج کل کیسے رنگ

مجھے جیکٹس بنانے کے لیے ایسے رنگ چننے ہوں ہر رنگ کے ساتھ چل سکیں۔ لیکن کسی ویسی چیز نہیں۔“ سونیا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ اتش نے اصرار کرتے ہوئے کہا تھا۔ اتش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسی طرح باتیں کرتے ہوئے شیشے کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گئے تھے۔

”اگر اندازہ تھا کہ اتش عکالت میں ہے سو وہ فوراً ہی پاپا کیسے گئے بلوسات کی جانب چلی گئی تھی۔

”آج کل گہرے رنگ چل رہے ہیں۔“ ایسا بھی آنے والی ہیں تو مزید کچھ مہینے گہرے ہی چلیں گے۔ یعنی مجھے جیکٹس کے لیے ہلکے چننے چاہئیں۔ تب ہی تناسب درست ہوگا۔“ سونیا کو جیسے یقین تھا کہ اتش اس کی بات دہی سن رہا ہوگا۔

”یہ دیکھو اتش! یہ کتنی اچھی چیز ہے۔ حالانکہ یہ رنگ پسند نہیں ہے لیکن یہ اچھا لگ رہا ہے۔“ اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اب کی بار غور کر لیا تھا۔ وہ نظر نہیں آیا۔ سونیا کے چہرے پر لراہٹ پھیل گئی۔

”بہت چالاک ہو۔ بدلہ لے رہے ہو نا مجھ۔“ اس نے اب کی بار ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔ اسے سن سکے لیکن وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ سونیا دوبارہ اس کاؤنٹر والے حصے کی جانب گئی تھی۔ اتش وہیں رہا تھا۔

”یہاں کھڑے ہو تم۔ میں تمہیں مشورہ دینے کے لیے لائی تھی اسے ساتھ دیکھو تو ذرا۔ اس رنگ کی بات بنا دوں ایک؟“ اس نے بنا یہ دیکھے کہ کے چہرے کے تاثرات کچھ بگڑے ہوئے سے ان نے پوچھا۔

”اچھا آ آ۔۔۔۔۔ تو یہ بھی ساتھ ہنہ ہمارے۔“

اتش نے زمین نے کہ تمہاری ہی کزن گاؤں سے

آئی ہے۔ اس کا باپ بھی درزی ہے کیا؟“

اسے ساتھ کھڑی خاتون نے طنز یہ سے انداز میں

سونا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ اس جملے پر

وہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ ایک ٹائیپے میں ہی ان خاتون کے نفوش واضح ہو گئے تھے۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کون ہیں۔

”ویسے ماسٹر غلام حسین کے ہاتھ میں تو بہت صفائی ہے۔ میری توانائی بھی انہی کے ہاتھ کے سٹلے کپڑے پہنتی رہی ہیں۔ بہت اچھے درزی ہیں۔“ وہ لمحہ بھر کو کہیں۔ لہجے میں جان بوجھ کر ایسا تجسس پیدا کیا جیسے کسی گیم شو میں بیٹھی ہوئی میزبان ہوں جو آخر میں سوال کے درست ہو جانے پر کروڑ روپے کے انعام کا اعلان کرنے والی ہو۔

”لیکن اچھے درزی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اپنی لاکھوں کروڑوں کی بیٹی ان کے گھر دے دی جائے۔ نا بھی درزیوں میں بیٹی نہیں دے سکتے ہم۔“ وہ بہت کڑوے انداز میں بات کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں نہیں لہجے میں بھی کاٹ دار طنز چمک رہا تھا۔ سونیا کو اپنی پیشانی پر ہنسی محسوس ہوئی۔ وہ دو قدم بھر کر اتش کے برابر آئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی انتہائی رخ ہو رہے تھے۔ سونیا کو ڈر سا لگنے لگا تھا۔ یہ گھر نہیں تھا، پبلک پلیس تھی۔ یہاں ذاتی گفتگو اور اس طرح کے طعنے برداشت نہیں کیے جاسکتے تھے۔ اتش ان کے سامنے ہوا تھا۔

”درزیوں کو سنا زوے سکتی ہیں آپ۔ بیٹی نہیں دے سکتیں۔ بہت خوب۔“ وہ تنک کر بولا تھا۔ سونیا کے پورے وجود میں لرزش ہی ہونے لگی تھی۔

”چلیں اتش! ہو گیا ہے میرا کام۔“ سونیا نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اتش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”چلی جانا بی بی! میرا کام بھی ہو لینے دو۔ مجھے اس پیارے انفصل سے بات تو کر لینے دو۔ ہاں تو میں نہ کہہ رہی تھی کہ دوبارہ میری بیٹی سے ملنے کی کوشش نا کرتا۔ وہ آج کل کی لڑکی ہے۔ اسے خوب سمجھ ہے تم جیسے تھرڈ کلاس لوگوں کی کہ کیسے اپنا اسٹیٹس بدلنے کی خاطر تم جیسے چھوٹے لوگ بڑے گھروں کی لڑکیوں کو



اجی میٹھی میٹھی باتوں میں پھنساتے ہو۔ اسے تمہاری حقیقت بہت اچھی طرح پتا چل گئی ہے۔ وہ تمہارا طرف حقو کے کو بھی تیار نہیں ہے اب۔ اس لیے بہتر ہے اپنی اس کڑن پر محنت کرو۔ ”میڈم تمہیں کالج تو تنہا ہی مگر الفاظ نے تو اتنی ہی نہیں سونیا کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”آپ کا گھر نہیں ہے کہ میں لحاظ کروں۔ یہاں کوئی بھی مجھے کچھ بھی بولنے سے روک بھی نہیں سکتا۔ میں آپ کے اس بڑے پن کے جواب میں ایسا چھوٹا پن دکھا سکتا ہوں کہ آپ کانوں میں انگلیاں ڈال کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جائیں گی۔ لیکن میرے درزی باپ نے ایسی تربیت نہیں کی میری۔ ہم اگر اسٹیشن میں آپ کی برابری نہیں کر سکتے تو تسلی رکھیے بدتمیزی میں بھی نہیں کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

اتش نے اپنے لہجے کی کچی کو چھپائے بنا کہا تھا۔ ”اوہہ..... لڑکا درزی کا اور انداز مرضی کا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اپنے سے بڑے لوگوں سے جھک کر ملنا سیکھو قائدے میں رہو گے۔ اب چلو شہاباش۔ نکلو یہاں سے۔“ وہ اسی انداز میں بولی تھیں جو ان کا خاصہ تھا۔ دو سیلز میں بھی آواز سن کر ان کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہوں میں جھجھک تھی۔

”اپنی پرائیلم میڈم؟“ ان میں سے ایک نے میڈم تمہیں سے سوال کیا تھا۔

”نہیں بھئی۔ مجھے کوئی پرائیلم نہیں ہے۔ یہ درزی کی اولاد کو نہ لگو یہاں سے۔“ سچ لوگوں کو دیکھ کر میرا دم سا گھٹنے لگتا ہے۔“ وہ باز نہیں آئی تھیں۔ اتش کا چہرہ برداشت کرتے کرتے مزید سرخ ہو چکا تھا۔ سونیا نے بہت ہمت کر کے اسے بیرونی دروازے کی جانب دھکیلا اور باہر نکل آئی تھی۔

☆☆☆

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کے دل میں تمہارے لیے اتنا بغض ہے۔“ سونیا نے کافی دیر بعد تا ساف بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”بدتمیزی..... بلکہ انتہائی بدتمیزی کو سنا میں ”بغض“ کہتے ہیں؟“ اتش نے اس کی دیکھے بناظر یہ انداز میں کہا۔

”میں نہیں اس بات کا بہت اچھا جواب دے سکتی ہوں۔ لیکن تم ابھی ابھی اپنی بھی نا ہونے ساس سے اچھی خاصی درگت بنا کر آئے ہو۔

لے ترس آگیا ہے تم پر۔“ سونیا نے سادہ سے میں کہا تھا۔ اتش نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی کافی ناراض نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے

تاثرات ابھی بھی ناراض نہیں تھے۔ وہاں غصہ تو لیکن بے پناہ تش بھی جو اس کی سرخ آنکھوں سے لپک لپک کر باہر آرہی تھی۔ یہ وہ تش

احساس تو بین سے پیدا ہوتی ہے اور پھر سب کو خاستہ کر دیتی ہے۔ سونیا اس پیش کو استہمال جانتی تھی۔ اسی لیے اس نے گفتگو کا آغاز کیا

اتش اگر آج بھی اس تو بین کو تو بین نا سمجھتے ہو انداز کر دیتا تو پھر وہ سب کیسے ہوتا جس کی خاطر ساہووال سے کراچی آئی تھی۔ اس نے ذرا سا

موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ جب بوتیک سے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ اتش سب کو کچا کھا جائے گا اب اس کے چہرے کے تاثرات ذرا قابل بردا

ہو گئے تھے۔ چہرے پر خفگی تو تھی مگر زمانے بے زاری نہیں تھی۔

”میرا مشورہ ہے اتش تم ایک بار زر میں بات ضرور کرو، ایسے یہ معاملہ ہنڈل نہیں کیا جا

وہ چونکہ بالکل خاموش تھا تو سونیا کو ہی پھر سے باز اس جانب موڑنا پڑا تھا۔ اب کی بار اتش

کراسے دیکھا۔ سونیا با آہیں چہرے مصنوعی انداز مسکرائی تھی جس سے وہ مزید جل جھن گیا تھا۔

”تمہارا کیا مسئلہ ہے۔ ایک تو تم مانگ کر میں نے اپنی زندگی کا سب غلط فیصلہ کیا حالانکہ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ شریکے (دشتہ وا

میں اس معاملے میں۔ آخر تمہارا کنسرن کیا ہے اس اے معاملے سے؟“ وہ سخت ناراض ہوا تھا۔ ہونا

یہاں یہ تھا کہ سونیا اس کے برہم انداز پر زربانان ہانی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے گہری سانس

لی اور اپنا رخ مکمل طور پر اس کی جانب موڑ لیا ”میرا کنسرن؟“ استہسایہ انداز میں اسے

دیکھا پھر اطمینان سے بولی۔ ”تو پھر سنو۔ آج بتا ہی دیتی ہوں تمہیں کہ میرا

کنسرن ہے کہ کوئی بھی اس اذیت میں نا جٹے جس میں میں ہوں۔ میرے لیے یہ صورت حال بالکل

جی ٹی نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی ایسا زعم کسی کے ہرے پر دیکھا تھا جیسا آج مسز تمہینہ کے چہرے پر

تھا۔ ایسی ہی درگت کسی نے میری بھی بنائی تھی جب میرے رشتے کی بات کی گئی تھی۔ تمہیں تو یاد ہونا

چاہیے تھا اتش۔ وہ فخر جو دولت کی وجہ سے مسز تمہینہ کے چہرے پر چمک رہا تھا، وہی فخر میں نے بھی کسی

کے چہرے پر اس کے چھ فٹ قد کی وجہ سے دیکھا تھا۔“ وہ کچی پھر دوبارہ بولی۔

”یہ ہی زمانے کا چلن ہے اتش! کہیں کوئی درزی کی اولاد کہہ کر دھتکار دیا جاتا ہے اور کہیں کوئی

پارٹ دس انچ کہہ کر۔ بات تو ایک ہی ہے۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بول رہی تھی لیکن چہرے کے تاثرات بہت ملائم سے تھے۔ وہ

الحد دے رہی تھی تا جتا رہی بس یاد کروارہی تھی۔ اتش کے چہرے کا رنگ لہجہ بھر کو بدلا۔ اسے واقعی کچھ

لوں؟“ وہ زیادہ دیر شرمندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سونیا مسکرائی۔

”ہونا تو یہی چاہیے کہ تم کان پکڑ کر معافی مانگو۔“ اس نے سونیا کی بات کا لپی۔

”یہ لو پھر۔“ اس نے اسٹیرنگ چھوڑ کر اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ ”خوش ہو چار فٹ دس انچ؟ یا

مار دوں کہیں گاڑی؟ بولو کیسے معاف کر دوں گی تم اس درزی کے بیٹے کو؟“ خدا جانے وہ مذاق کر رہا تھا یا

سنجیدہ تھا۔ سونیا کو گمان گزرا کہ شاید وہ اپنے حواس کھو چکا ہے۔

”اوہو..... تم خود کشی کر سکتے ہو۔ تمہارا تو نیا نیا دل ٹوٹا ہے لیکن میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے اور نا

ہی میں اپنی احمق ہوں کر دل ٹوٹنے کے اس قیمتی مکمل کو ضائع جانے دوں۔ ہوش کرو اور گاڑی چلاؤ۔“ وہ

تک کر کہہ رہی تھی۔ سڑک پر چند ایک ہی گاڑیاں تھیں اور اتش کی اس حرکت کی وجہ سے گاڑی کا

توازن خراب ہو رہا تھا۔ ”ناشاء اللہ۔ یعنی اب دل ٹوٹنا بھی قیمتی ٹھہرا

آپ کے لیے۔“ اس نے دوبارہ سے اسٹیرنگ تھام لیا تھا۔ سونیا مسکرائی۔

”اے بڑھے لکھے انسان میرے لیے نہیں۔ سائنس کے لیے بھی یہ عمل قیمتی ہی ہوتا ہے۔ سائنس

فرماتی ہے کہ جب کوئی مادہ دو لخت ہوتا ہے تو توانائی خارج ہوتی ہے۔ توانائی جو کائنات کے سارے نظام

کو ”کوکلا چھپا کی جھرات آئی ہے (ہنجاب میں کھیلانا جانے والا بچوں کا ایک کھیل)“ کی طرح نچانی

ہے۔ حرکت میں رہتی ہے۔ یہ توانائی وہ محرک ہے جو کائنات کو چلانے کا باعث بنتی ہے۔ اب جو مکمل

توانائی پیدا کرنے کا باعث بنے گا قیمتی ہی کہلائے گا۔ کچھ آئی سمجھ میں یا نہیں۔۔۔ سو دل ٹوٹتا ہے،

نکلے نکلے ہوتا ہے کچی کچی ہوتا ہے تو بھی توانائی ہی خارج ہوتی ہے۔ قیمتی توانائی۔ اب یہ

انسان پر منحصر ہے کہ اس توانائی کو مثبت طریقے سے استعمال کر لے یا منفی طریقے سے۔“ اتش کے

چہرے پر مسخرانہ سے تاثرات چمکنے لگے تھے لیکن سونیا خاموش نہیں ہوئی تھی۔

”میں جب بس سال کی تھی نا تو اپنے قد کی وجہ سے چھ سال کی لگتی تھی۔ میرے بچہ زبچھے کسی گیم میں شریک نہیں ہونے دیتے تھے کہ یہ تو چھوٹی ہے۔ کوئی اسکول کا پلے یا ٹیلو یا پھر تقریری مقابلے میں مجھے حصہ نہیں لینے دیا جاتا تھا۔ یہ چھوٹی ہے۔ اس کا قد چھوٹا ہے۔ یہ چھوٹی لگتی ہے۔ رومزم کے پیچھے سے نظر ہی نہیں آتی۔ یہ گر جائے گی۔ اسے چوٹ لگ جائے گی۔ ہر بار ایک ہی طرح کے جملہ بول کر میرا دل ٹوڑ دیا جاتا تھا۔ وہی کام جو میرے ہم عمر اور ہم جماعت آرام سے کر سکتے تھے۔ مجھے کرنے ہی نہیں دے جاتے تھے اور وہ بس یہی بھی جسے تم چارٹڈ دس انچ کہتے ہو اور تب میں نے سوچا کہ بس اب میں کسی کی نہیں سنوں گی۔ میں ثابت کر کے دکھاؤں گی کہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ میں وہ سب کر سکتی ہوں جو میرے ہم عمر کرتے ہیں۔“

اس کے بعد آتش میں نے کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہر اس چیز میں حصہ لیا۔ ہر وہ کام کیا۔ ہر اس کھیل کا حصہ بنی جو میرے لیے صرف میرے قد کی وجہ سے ممنوع قرار دے دیا جاتا تھا۔ یقین کرو جب جب بھی کسی نے میرا دل توڑا۔ میں نے اس عمل کو قیمتی جانا۔ اسکول میں۔ کالج میں یا عملی زندگی میں۔ ہمیشہ میں نے دل کے ٹوٹ جانے پر کبھی غم نہیں منایا۔ انسان ہونے کے ناطے رونی ضرور ہوں لیکن کبھی اس توانائی کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

تم ساہیوال سے آتے ہوئے میرا دل توڑ کر آئے تھے۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ میں تم میں ذرا بھی اثر ملے نہیں ہوں۔ تم نے میرے چھوٹے قد کی بنا پر میری تحقیک کی تھی۔ میرا بھی دل ٹوٹا تھا لیکن دیکھ لو میں آج تمہارے سامنے ہوں۔ اتنا ضامن کہ تم مجھ سے مشورہ کرنے پر مجبور ہو کر نیکہ میں نے اپنی توانائی کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیا اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی کہ سوچو۔ کیسے خود کو تباہ کر سکتے ہو۔ یہ

نکل سکتے ہو اس صورت حال سے۔ کیسے پہنچ سکتے ہو اس مقام پر جہاں مسز تھینہ تمہیں اپنا داماد بناتے ہو۔ فخر محسوس کریں اور تم ان کے سامنے سر اٹھا کر کہہ سکو کہ لڑکا درزی کا تو انداز واقعی مرضی کا۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

انٹس کو اس لڑکی پر، اس کی دوستی پر پہلی بار بے پناہ فخر محسوس ہوا تھا۔ وہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔

دل ٹوٹ گیا تھا لیکن عزم سلامت تھا۔  
 ”واہ واہ..... بڑی دلی اللہ ہیں بھائی آپ تو۔  
 مجھے یقین ہے آخر میں تم نے زبردستی مجھ سے اپنے  
 ہاتھ پر بیعت لے لی ہے۔“ اس نے مصنوعی انداز  
 میں ناراضی میں چڑتے ہوئے کہا تھا۔  
 سونیا کچھ نہیں بولی کیونکہ وہ جانتی تھی اسے  
 لوگوں کو اپنا مرید بنانا آتا تھا۔ اسے وہ منتر آتا تھا جو  
 لوگوں کے دلوں کو اس کے حق میں رام کر دیا کرتا تھا۔  
 ☆☆☆

”تم مجھے نہیں؟“ سونیا نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر کمرے سے نکلی۔ آتشِ عطیہِ جہنم کے کمرے میں بیٹھائی دی دیکھنے میں محسوس تھا۔

”نہیں۔“ ایش نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ اسے حیرت ہی نہیں ہوئی بلکہ انتہائی غصہ بھی آیا۔ ”لیکن کیوں؟“ وہ چوڑی گئی۔ ایش اطمینان سے ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سرتقی نے کہا: ”تمہیں احساس بھی ہے میں نے سرتقی سے ان سے تمہارے لیے بات کی تھی۔ وہ اتنی بڑا اسٹاکسٹ ہیں۔ بڑے بڑے ماڈلز کو انہوں نے چانس دے کر اس مقام تک پہنچایا ہے۔ تم جیسے آموز کو تو وہ دروازے سے ہی باہر بیچ دیتی ہے لیکن میری ریکوریسٹ پر انہوں نے تمہیں ادا کر دیا تھا ایش۔“ آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ ناراض ہو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے ہر روز ایک موقع تلاش کرتی تھی اور دو ہر روز اسے رد کر دیتا تھا۔ سونا کے بنائے کچھ سچر ایک ڈریس ڈیزائن

۱۰ اے تھے۔ انہوں نے فیس بک پر اس سے رابطہ  
۱۱ امانہ۔ سنیانے ان کی فرمائش پر کلچر اور سنگ بینڈ  
۱۲ بتے۔ لیکن اپنا ایک بھی لگایا تھا۔ اس کا فیڈ بک  
۱۳ کافی اچھا ملا تھا۔ وہ فیز انسر اچھی خاتون تھیں اور  
۱۴ دبا کے ہنر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اسی لیے  
۱۵ ان کے لیے اس نے ان سے بات کی تھی کہ وہ اپنے  
۱۶ بی شو میں اسے ریب پر آ لیتے دیں۔ اسے ایک  
۱۷ سال مل جائے گا اور بعد میں وہ باقاعدہ ماڈلنگ کی  
۱۸ ل آسکتا ہے۔ کسی پروفیشنل سے اپنا پورٹ فولیو  
۱۹ بنا سکتا ہے۔ انہوں نے سونیا کی خاطر یہ بات  
۲۰ مانی لی تھی جبکہ انش نے اس پر خوب دیا ملا چایا تھا۔  
۲۱ ”میں نہیں کر سکتا یہ فضول کام۔ آج کل  
۲۲ انک مردوں کے کرنے والا کام ہی نہیں ہے۔ جس  
۲۳ انسر کا دل چاہتا ہے وہ اپنے اڑھار کر اچھے بھلے گھرو  
۲۴ ان کو ریب پر دھکیل دیتے ہیں۔ ابھی تو تم جیسے  
۲۵ انسر بھی مارکیٹ میں آنے باقی ہیں۔ ڈر لگتا ہے  
۲۶ اس وقت سے جب جھیکے پرانے بھی مردوں کو بی  
۲۷ بنا دیا کر دے تم لوگ۔“ وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

ریمپ برآنے سے اس نے قطعاً انکار کر دیا۔ وہ اس قسم کی ماڈلنگ میں بالکل بھی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کے بعد سوئیڈن نے اسے ایک اسٹاکسٹ ہالقات کے لیے ٹائم دے کر دیا تھا۔

”تم اپنی نوکری سے بھی زمین کی اماں کے  
 اس کو نہیں چھو سکتے۔ جہیں ایک بڑا بریک تھرو  
 ہے۔ جو الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے ہی مل سکتا  
 ہے۔ اس کام میں روپے بھی ہیں اور شہرت بھی۔  
 جس کی کوشش کرو۔ تمہارا چھوٹ سے ٹکٹے ہوئے قد  
 کوئی فائدہ نہ ہو۔“ سوینا اسے بہت مشکل سے  
 اند کیا تھا اور سمجھا بھی تھا کہ اگر تم اسٹاکس کی  
 امان کر چلو گے تو تمہیں ضرور جاس مل جائے گا۔  
 وہ وہیں جانے والا تھا لیکن اس کی گھر میں موجودگی  
 ہر رہی تھی کہ اسے یہ بھی منظور نہیں تھا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے امش۔ تم میری کوئی بات ماننے اور پھر خواہش تمہاری یہ ہے کہ اپنی

ہونے والی ساس کے اسٹیش کا مقابلہ کر دے۔ ایسے تو کبھی نہیں کر سکو گے۔“ وہ اس کی خاموشی سے رنج ہوئی تھی۔

”مجھے مقابلہ کرنا ہی نہیں ہے۔ میں بنا جنگ جیتے ہی فاتح ہوں میری پیاری پیچھو کی بیٹی۔“ وہ ناک چڑھا کر بولا۔ سونیا نے گہری سانس بھری۔ اسے انش کی کاٹلی سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ انش نے اس کے اکتائے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا پھر ذرا سانس مرندہ ہو کر بولا۔

”یار۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو تا میں ڈسپلے میٹر میں نہیں ہوں۔ میں باقاعدگی سے جم جانے والی۔ لڑکیوں کی طرح ویکس کروانے والی۔ ڈاننگ کرنے والی۔ پروٹین ٹیک پیسنے والی مخلوق نہیں بن سکتا۔ میرا انشیمائٹی نہیں ہے ان سب چیزوں کا اور پھر جن عجیب و غریب خاتون کے پاس تم نے مجھے بھیجا تھا نا انہوں نے کہا کہ اپنی زندگی سے چاکلیٹ اور چیز نکال سکتے ہو۔ میں نے کہا نہیں۔ تو وہ کہنے لگیں۔ پھر ماڈل بننے کا خواب بھی دل سے نکال دو۔ سو میں نے نکال دیا۔ لوگ مجھ سے شریٹس رکھ کر ملنے کے خواہاں کیوں ہیں۔ زرمین چاہتی تھی میں اپنی زندگی سے اپنے اما کو نکال دوں۔ یہ سختیہ فرمانی ہیں میں چاکلیٹ کو زندگی سے نکال دوں۔ مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب۔“

وہ خود بھی کچھ الجھا ہوا سا نظر آنے لگا تھا لیکن باتیں ابھی غیر سنجیدہ انداز میں کر رہا تھا۔ سو نیا چند لمحے اس کی شکل دیکھتی رہی۔

”تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ الجھے ہوئے انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ انٹش نے ہاتھ میں پکڑا ریسیٹ بیڈ پر پھینکا پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر عطیہ بیگم کی الماری میں سے کچھ نکالنے لگا تھا۔ سونیا اس کی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”ایک درزی کا بیٹا۔ یہی کر سکتا ہے بس۔“ اس نے ایک کرافٹ بک نکالی تھی اور سونیا کے سامنے رکھ دی تھی۔ سونیا نے فوراً اسے جھک کر کرافٹ بک قریب

کی اور اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحوں میں ہی کی جانب متوجہ رہی۔

”یہ سب تم نے بنائے ہیں؟“ وہ ایک ایک صفحہ پلٹتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ستائش تھی۔

”ہاں اور میں یہی بناؤں گا۔ میں نے اسی دن یہ سوچ لیا تھا جس روز میڈم تہینہ نے میرے باپ کو میرے سامنے ذلیل کیا تھا۔ تم دیکھنا میں ان پر ثبات کروں گا کہ درزی ہونا کس قدر قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔ میرا عزم ان کے اسٹیشن کا مقابلہ کرنا نہیں ہے۔ دولت روپیہ پیسہ اہم نہیں ہے میرے لیے۔ بلکہ میرا عزم ان کو دکھانا ہے کہ میرے باپ کا اسٹیشن کس قدر عظیم ہے میرے لیے۔“ وہ نہایت اعتماد بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سونیا نے ایسا اعتماد پہلی بار اس کے چہرے پر دیکھا تھا۔

”تم درزی بنو گے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ آتش کے چہرے پر فحاشانہ مفردی مسکراہٹ چمکی۔

”نہیں۔ میں ڈریس ڈیزائنرز بنوں گا۔ دنیا کو اگر کان مشرق کے بجائے مغرب سے پکڑنا اچھا لگتا ہے۔ دنیا اگر سادگی کی زبان بولنے والوں سے خار کھاتی ہے۔ دنیا کو اگر درزی کو درزی کہتے شرم آتی ہے لیکن ڈریس ڈیزائنرز کہنے سے شملہ اندھا بخوس ہوتا ہے تو ایسے ہی تھی۔ ہم بھی دنیا کو دنیا کی طرح ہی بن کر دکھائیں گے۔ ہم بھی کان کو مغرب سے ہی پکڑ کر دکھائیں گے اب۔“ وہ نہ عزم لہجے میں کہہ رہا تھا اور یہ عزم بھی اس کے چہرے پر سونیا کو پہلی بار نظر آیا تھا۔

دل ٹوٹ گیا تھا لیکن توانائی ضائع نہیں ہوئی تھی۔ دل کا ٹوٹنا کام آگیا تھا۔

☆☆☆

”زمین۔ طوطی نے کتنی پیاری شرٹ پہنی ہوئی تھی نا؟“ میڈم تہینہ نے بیٹی کو مخاطب کر کے پوچھا تھا۔ اس نے موبائل سے نظریں ہٹا کر ان کی جانب دیکھا۔

”جی اچھی تھی۔“ اس نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔ میڈم تہینہ کو اس کا انداز اچھا نا لگا۔ وہ اچھا کپڑا پہننے کی بے حد شوقین تھیں۔ ہر طرح کا اپنی عمر اور جسامت کا لحاظ رکھے بنا کر بیٹھی تھیں اور ان متعلق گفتگو میں بھی نہایت دلچسپی رکھتی تھیں۔ زمین نے ان سے یہ عادت ورثے میں ملی تھی۔

”پرسوں ناز کے بیٹے کی سالگرہ میں بھی بہت پیاری میکی پہنی ہوئی تھی اس نے۔ میں نے پوچھا تھا۔ کہاں سے لی؟ لیکن بتایا نہیں اس نے۔ ایک چھپا چھپا کے رکھنے کی عادت بالکل اپنی ماں سے لی ہے ان لڑکیوں نے۔ مجال ہے بھی کوئی چیز بتادے کہ کہاں سے یا کتنے میں خریدی۔“ وہ نہ اسامہ بنا بولیں۔ زمین صوفیہ پر ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھتے ہوئے ان کی جانب دیکھنے لگی۔

”زمین کے بریک اپ کو ڈیڑھ سال ہو۔ کو آتا تھا اور اب تو وہ کافی سنبھل چکی تھی۔ ایک دفعہ خود کشی کی ناکام کوشش۔ چھ مہینے ماموں کے یہاں لندن میں قیام اور تین مہینے استی ڈیپر سینٹ کے مستقل استیصال نے بھی اس کے دل سے آتش کی باگ کو کھریج کر نہیں پھینکا تھا۔ وہ اپنی ماما کے سامنے ذرا نہیں کرتی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ آتش کو کھول نہیں پاتی تھی اور نا ہی اس امر کو کہ وہ ان کے خاندان درزی ماسٹر غلام حسین کا بیٹا تھا۔ آتش کو نہیں بھولی لیکن اس سے شادی کے خیال کو بھلا چکی تھی وہ۔

”آپ مجھے پہلے بتائیں۔ مجھے پوچھنے کا ہنر ہے۔ میں آپ کو پوچھ کر بتا دیتی۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ اب کی بار میڈم تہینہ نے فخر سے کی جانب دیکھا۔ یہ بات تو وہ جانتی تھیں کہ ان بیٹی ان سے زیادہ ہی ہوشیار تھی۔

”ہاں تو پوچھ لیتی نا۔ میں بھی جاری ہوں ہفتے پاکستان۔ آتے وقت لے آؤں گی۔ آرمضان آجانا ہے۔ اتنی افکار پارٹیاں آتی ہیں ہمارے پاس اسٹاک ہونا چاہیے۔“ وہ اسے سمجھا دیتی تھیں۔ ان کے خاندان کے بہت سے

تھے اور مقابلہ بازی خوب عروج پر رہتی تھی۔

”بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ روزوں میں تو واقعی بہت زیادہ ایسٹرن کپڑوں کی ضرورت پاتی ہے۔ پھر عید کے تین دن بھی تو ایسے ہی کپڑے پہنیے ہوتے ہیں۔ میں تو تھک گئی ہوں جینز کے ماتھے شرٹس پہن پہن کر۔ پوچھتی ہوں طوطی آپنی۔“

ان کو ہی نہیں زمین کو بھی اچھا پہننے اور حسن کا بے حد شوق تھا۔ اس نے اسی وقت طوطی کو وائس ایپ بھیج کیا تھا اور پہلے تو اس کے ذوق کی، اس کی نزاکت و ذوقِ صوفی کی اور پھر اس کے لباس کی بے پناہ تعریف کی تھی اور اس کے بعد اس سے دریافت کیا تھا کہ اس نے اپنی شرٹس کہاں سے خریدی ہیں۔

”یہ نیا ڈیزائنر ہے۔ بہت اچھا اسٹاک ہے ان کے پاس۔ اچھی نئے لوگ ہیں لیکن آؤر پر کام کرتے ہیں اور کام بہت زبردست ہے۔ کراچی بیڈ ہیں۔ فلو بی شینگ کرتے ہیں۔ تم آؤ گی تو کانٹیکٹ نمبر دوں گی تمہیں۔“ اس نے بھی فوراً جواب دے دیا تھا۔

”کوئی۔ آن لائن لنک نہیں ہے آپ کے پاس؟“ اس نے دوسرا میسج بھیجا تھا۔ اس میسج کا جواب طوطی نے کچھ توقف کے بعد دیا تھا۔

”نہیں۔ میرے پاس سیل نمبر ہی ہے۔ ان کا فیس بک پیج بھی بنا ہوا ہے لیکن وائس ایپ گروپ بھی ہے۔ تمہیں نمبر دوں گی نا۔ تم خود دیکھ لینا۔ تمہیں اتنے گیس گے ڈیزائن۔“

طوطی نے ابھی بھی نمبر نہیں دیا تھا حالانکہ ایک دن کلک سے اگر میسج جاسکتا تھا تو نمبر بھی جاسکتا تھا۔ ان زمین سمجھ گئی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے نمبر نہیں دے گی۔ ان سب کمزور کا ایک مسئلہ تھا۔ کوئی بھی مامی سے اپنی چیزیں شیئر کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ بالخصوص کپڑوں جوتوں کے معاملے میں تو وہ بی بی بلا کی محتاط تھیں۔ ایک دوسرے کو بتاتی تھی کہ انہیں اور پھر اپنی چیزیں دکھا دکھا کر جلاتی بھی دیتیں۔

”میں نے کہا تھا نا کہ نہیں بتائے گی۔“ میڈم تہینہ نے کہا تھا۔ زمین نے ناک سے بھی اڑانے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

”نہیں تو نا سہی۔ اتنے ڈیزائنرز آگئے ہیں مارکیٹ میں۔ ان کو مل گیا ہے کوئی تو ہمیں ناپے گا کیا۔ آپ سرچ کر لیں۔ لاتعداد لوگ مل جائیں گے۔“ وہ لا پرواہی سے بولی تھی۔

”رمضان سے پہلے کوئی انتظام ہو جاتا تو اچھا تھا۔ یہاں تو انڈین مال بھرا پڑا ہے اور پھر مہنگا بھی بہت ہے۔ وقت کے وقت خریدیں گے تو مزید مہنگا پڑے گا۔“ میڈم تہینہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ زمین نے سر ہلایا تھا۔ خاندان بھر میں اس قسم کی باتوں پر سخت گفتگوں رہتی تھی۔

اس کے بعد کافی دن گزر گئے۔ ایک دن وہ بی بی پر رات کے وقت بیٹی کو بی بی مودی دیکھ رہی تھی۔ میڈم تہینہ بھی ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب طوطی نے میسج کیا۔

”زری۔ مارننگ شو لگا کر دیکھو۔ وہ جس ڈیزائنر کی بات میں کر رہی تھی نا۔ ”اچھر اب“ وہ بی بی پر آیا ہوا ہے۔ اپنا نیا اسٹاک اور عید الفی کی کوئیکشن شریک کر رہا ہے۔ ڈریسز تو بعد میں دیکھنا۔ پہلے بندہ دیکھو۔ کیا زبردست پر سنائی ہے۔ بڑا ڈشنگ ہے اور وہ بی بی میں بھی ایگری میشن کرنے والے ہیں اگلے مہینے۔“ اس کے میسج کو دیکھنے کے بعد زمین نے میڈم تہینہ کی جانب دیکھا تھا۔

”ماما۔ طوطی بتا رہی ہے کہ وہ ڈیزائنرز جس کا ایڈریس اس نے ہمیں نہیں دیا تھا۔ وہ بی بی پر آ رہا ہے۔ اپنی بی بی کو لکیشن دکھا رہا ہے۔

زمین نے اس کا بتایا ہوا جینل لگایا تھا۔ اسی وقت مختلف ماڈلز بہت پیارے کپڑے پہنے ایک کے بعد ایک تیز میوزک کی تان پر سامنے آ جا رہی تھیں۔ وہ دونوں ماں بیٹی اس میں مگن ہو گئی تھیں۔ اسکرین پر فیس بک پیج۔ فون نمبر اور دوسری تفصیلات بھی آرہی تھیں۔ زمین نے سب کچھ اپنے فون میں محفوظ کر لیا

تھا۔ اسی دوران میوزک دھیمیا ہوا تھا اور میزبان نے ڈیز انٹر سے بات شروع کی تھی۔ میڈم تہینہ تو لی دی اسکرین کی جانب ہی متوجہ تھیں لیکن زمین موبائل میں بھی ساتھ ساتھ گن گئی۔

”ڈیز انٹر آپ کتنا سونپا ہے۔“ میڈم تہینہ نے اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ زمین کو کسی کی وجاہت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس نے سرسری سے انداز میں سر اٹھا کر لی دی کی جانب دیکھا تھا۔ اسے جھکا لگا تھا۔ اس نے اپنی ماما کی جانب دیکھا۔ وہ لی دی اسکرین میں کھوئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے انٹش کو نہیں پہچانا تھا لیکن وہ تو اس چہرے کو لاکھوں چہروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے بنائے ہوئے ملبوسات کی تعریف کر رہا تھا۔ وہ ان شارٹ کورسز کے بارے میں بات کر رہا تھا جو اس نے گزشتہ ایک سال میں کیے تھے۔ وہ اپنی اس بوتیک کے بارے میں بتا رہا تھا جو اس نے کراچی کے بڑے اور مہنگے ترین مال میں بنائی تھی۔ وہ اپنے والد کے بارے میں بات کر رہا تھا جو اس کی انسا ٹریننگ تھے۔ جنہوں نے اسے یہ سب سکھایا تھا۔ اس کے انداز میں مہارت بھی فخر تھا، غرور تھا اور اعتماد بھی۔ وہ جو بھی کر رہا تھا اسے اس پر فخر تھا اور یہ فخر اس کے ہر عضو سے چھلکتا پڑ رہا تھا۔ وہ واقعی بدل تو گیا تھا۔ ایک بے پروا کھلنڈرا سا لڑکا اٹھارہ مہینوں میں ایک کامیاب ترین بزنس مین کے سے انداز میں ڈھل چکا تھا لیکن اس نے ثابت کر دیا تھا۔ وہ بے مثال تھا۔ وہ بے مثال ہے۔

زمین نے ایک بار پھر ماما کا چہرہ دیکھا۔ وہ تو داری صدقے جانے والی نگاہوں سے لی دی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

”دیکھ زمین۔“ ہے کتنا اچھا اور ذہین بھی۔ بہت قابل ڈریس ڈیز انٹر ہے۔ ماشاء اللہ۔ چھ مہینے کا کورس کر کے آیا ہے لندن سے۔ تو اس کا نمبر لکھ لے۔ تیری شادی پر اس سے کام کروائیں گے۔“ زمین کے منہ سے آواز نکل رہی تھی۔ اسے بس

ایک بات یاد تھی۔ وہ انٹش تھا۔ وہ انٹش جسے سب جانتا تھا۔ سب کچھ۔

☆☆☆

”اگر اب۔“ سونیا نے فخر و انبساط کے طے جلے تاثرات کے ساتھ اپنی بوتیک پر نگے اس بورڈ کی جانب دیکھا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں کراچی جیسے بڑے شہر کے ایک مشہور مال میں اپنی بوتیک بنالینا آسان نہیں تھا۔ سرمایہ تو اس کے ماں باپ ہی دے سکتے تھے۔ انٹش کی فرمائش پر ماسٹر جی بھی فراہم کر سکتے تھے۔ اصل بات سرمایہ کی فراہمی نہیں تھی بلکہ اس بوتیک کو چلانا، اپنے آپ کو ایک ڈیز انٹر کے طور پر منوانا سب سے مشکل کام تھا اور اس نے اور انٹش نے مل کر یہ کر دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جس پر وہ جتنا فخر کرتی کم تھا۔

یہ اس کا اور انٹش کا جوائنٹ وینچر تھا۔ ان دونوں نے اس کے لیے دن رات محنت کی تھی۔ اس کا منہ اور انٹش کے ٹوٹے دل سے حاصل ہونے والی توانائی نے یہ سب کر دکھایا تھا۔ یہ آئیڈیا انٹش نے ہی دیا تھا۔ سونیا نے اسے حقیقت کا روپ دیا تھا۔ وہ مل کر ڈیزائن بناتے تھے، ماسٹر جی کے کاریگر سونیا کی معاونت سے انہیں لباس کے روپ میں بدل دیتے تھے اور ایک ایسی چیز تیار ہو جاتی تھی جسے دیکھنے والا سراپے ہمارہ نہیں پاتا تھا۔

کام وہی تھا جو ماسٹر جی کرتے آئے تھے لیکن انٹش اور سونیا نے اسے زمانے کے رجحان کے مطابق جدید رنگ دے دیا تھا۔ وہ دونوں پڑھے لکھے تھے انفرادیت کے قائل تھے اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرنا جانتے تھے۔ ماسٹر جی کے تجربے اور ان دونوں کی جدت پسندی نے انہیں بہت جلد کامیاب کر دیا تھا۔ وہ دونوں ابتدا میں روپے کمانے زیادہ اپنے برانڈ کی پروموشن میں دلچسپی رکھتے اس لیے انہوں نے ابتدائی اشاک کو تحفہ بھی دیا تھا۔ اپنے فیس بک پر مختلف مقابلے کروا کر انعام

ملو رہی دیا تھا۔ پہلے ہی سال میں چار بار پچاس لاکھ کٹائی پر بھی بیچا تھا۔ اس لیے وہ مقبول بھی جلدی انٹش تھے۔ سونیا نے اپنی ایک کلائنٹ سے درخواست کر کے ایک مارنگ شو کے لیے اپنے لباس پہنائے تھے جو بہت پسند کیے گئے تھے بعد میں انہوں نے فرمائش کر کے مزید لباس منگوائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مارنگ شو تک رسائی بہت جلد ممکن ہو گئی تھی۔

”اگر اب۔“ سونیا نے یہ نام خود اپنی بوتیک کے لیے منتخب کیا تھا حالانکہ پہلے وہ صرف محراب کے نام سے اپنی چیزیں مارکیٹ میں متعارف کروانا چاہتی تھی لیکن جب انٹش نے اس کام کو اپنے پیشے کے طور پر اپنانے کی بات کی تو اس نے بخوشی اس کا ہاتھ دیا تھا۔ اس کی معاونت کی تھی اور تب ہی اس نے اپنے برانڈ کے نام کو ”محراب“ سے ”اگر اب“ کر لیا تھا۔

وہ دونوں اب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ انٹش نے ”اگر اب“ کے لیے اپنی انا قریبان کی تھی تو سونیا نے بھی اپنے شہر کو چھوڑنے جیسے امر کی قربانی دی تھی۔ اپنے والدین کی کینڈا سے واپسی کے بعد اسی نے اصرار کر کے انہیں کراچی منت ہونے پر مجبور کیا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے، ایک دوسرے کے کام میں خوب کڑے نکالتے، ایک دوسرے کی آراء سے بھی اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے کی اہمیت کو ایم کرتے تھے۔ اتنے عرصے میں اگرچہ بہت کچھ لڑا تھا لیکن ایک دوسرے کے لیے وہ ابھی بھی لڑتی ہی تھیں۔ انٹش سونیا کے لیے راجا انٹش تھا تو سونیا اس کے لیے چارنٹ دس انچ تھی اور اسی بڑی رگوں کی خواہش تھی اسی طرح قائم و دائم تھی۔

☆☆☆

”یہ کس نے بنایا ہے؟“ سونیا نے ایک نامکمل ایٹ کو دیکھ کر ناک پڑھائی تھی۔ وہ دودھیا سی

رنگ کی آدھی استیوں والی جیکٹ تھی جس پر جا بجا سرخ اور گلابی رنگ کے دائرے چپکائے ہوئے تھے۔ اس نے مزید قریب ہو کر دیکھا۔ ”ایپلک ہے یہ؟“ اس نے شوبی سے پوچھا تھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ سونیا کے انداز کو دیکھ کر اس نے موبائل جیب میں رکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ سونیا نے ناک پڑھائی۔

وہ عموماً بوتیک پر کم ہی جایا کرتی تھی لیکن درکشاپ پر صبح ہی پہنچ جاتی تھی اور سارا دن وہیں گزارتی تھی۔ انہوں نے ماسٹر جی کی زمرہ والی دکان کو ہی عارضی طور پر درکشاپ بنالیا تھا۔ اس دکان کے اوپر والے حصے میں ایک بڑا مال تھا جس کو ماسٹر جی نے ایک بڑے شوروم کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔ وہاں پر ہی وہ اپنا کام کر لیتے تھے کیونکہ اب وہاں پر سلائی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ مختلف کڑھائی اور کوٹا کناری کرنے والے کاریگر بھی ملازم رکھ لیے

تھے۔ سونیا کو ہر کام کو نہایت مہارت و محنت سے کرنے کی عادت تھی۔ وہ اسی لیے انٹش کے کام میں بہن دیکھ بھی خوب لگتی تھی جس سے وہ چڑتا تھا۔

”میں نے کر دیا ہے اسے شوبی سے۔ اچھا لگ رہا ہے نا۔ یہ جو دائرے دیکھ رہی ہونا۔ اس تھیم کو میں مزید رنگوں کے ساتھ کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ پلین شرٹ کے ساتھ چلائیں گے۔ بہت اچھا لگے گا۔“ اسی لمحے انٹش میز صفاں پڑھ کر اوپر آیا تھا۔ سونیا کی پیشانی پر تیوریاں بڑھ گئی تھیں۔

”تم بھی داغ بھی استعمال کر لیا کرو۔ اسپرنگ میں پلین (سادہ) کون اڑائے گا۔ فلورل ڈیزائن کی بھرمار ہوگی اس بار۔ اس پر یہ گول گول دائروں والی ایپلک کی جیکٹس کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس پر محنت کرنے کی۔“ اس نے سخت سے سنجے میں شوبی کی جانب دیکھ کر کہا تھا، انٹش کو بہت برا لگا۔ اس نے ہنسنے چوتھوں سے سونیا کو گھورا پھر قریب کھڑے شوبی کو دیکھا۔ وہاں موجود سب ملازم جانتے تھے کہ کام کے



معالے میں ان کے مالکان بچوں کی طرح لڑنے کے  
 عادی تھے۔ شوٹی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی  
 لیکن ڈانٹ کے ڈر سے وہ وہاں کھڑا رہنے کے  
 بجائے میڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا تھا۔ انٹل سونیا کی  
 جانب مڑا تھا۔

میں ہمیں ستر فیصد آف پرنٹیں کر کر کے بیچنا ہے۔“ وہ ایک کونے میں بڑے مینکن کوشید ہال کے درمیان میں لے آئی تھی۔ وہ کسی کلائنٹ برائیزل آرڈر تیار کر رہی تھی۔ وہ ایک کاسنی اور سر رنگ کے استراچ کا لمبا سفر اک تھا جس پر اس

”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ میتھس میں تو واقعی انہی ہوتے مگر سوال یہ ہے کہ اگر ولین چارٹس اس انج ہوئی تو کتنے انج کی ٹیکل میں یہ ٹیک کام سرانجام پانے لگا۔“ وہ اسے چڑھا رہا تھا۔ سونیانے کھا جانے والی ٹیکا ہوں گے اسے دیکھا۔

تھا۔ اس کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی، ستائش تھی۔ یونیا کو یہ ستائش اچھی تھی۔ اس نے گھوم کر انش کو مومنق دیا تھا کہ وہ جی بھر کر اس لباس کو ادرا سے دیکھ لے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اس کا دل چاہا تھا کہ انش دل کھول کر اسے سراہے۔ اسے خود اپنی کیفیت پر حیرت ہوئی ادرا سے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ اسے یہ کیفیت بری نا لگ رہی تھی۔ ایسے انش کی نگاہوں میں چھپی ستائش بری نا لگ رہی تھی۔ وہ اس کی جانب مڑی تھی۔

واپس آگئی ہے اور میڈم تہینہ نے اس بار خود اسے فون کر کے گھر والوں سمیت کھانے پر بلایا ہے جب ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ اب اگلا مرحلہ بہت مشکل ہونے والا ہے لیکن وہ بھی کیا کرتے۔ ایک طرف جوان اولاد بھی تو دوسری جانب من چاہا جیون سا بھی۔ وہ کسے مایوس کرتے اور کسے سرخرو بھڑاتے۔

”آپ کو کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنی بڑی بات ہے اور وہ بچی۔ جو آپ کے بیٹے کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں آگئی ہے۔ اپنے ماں باپ کو ضد کر کے مجبور کیا ہے کہ وہ اس شہر میں پھر سے سیرا کر لیں۔ اسے بھول گئے ہیں آپ اور پھر بہن کو کیا جواب دیں گے ماسٹر جی۔ آپ اتنے نا سمجھ کیوں ہو جاتے ہیں۔“ وہ دانت چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے اپنے کچھڑی کچھڑی بالوں میں ہاتھ پھیرا پھر گہری سانس بھر کر بولے۔

”میں تو بس آپ دونوں کے درمیان گھن چکر بن کر رہ گیا ہوں بی بی۔ ایک طرف آپ کا ڈالا بیٹا ہے تو دوسری جانب آپ خود ہیں۔ میں کس کی سنوں اور کس کی نظر انداز کر دوں؟“ وہ جو کر کہہ رہے تھے۔

”آپ مجھے ہی نظر انداز کریں بس ماسٹر جی۔ میں لگی کون ہوں آپ کی۔“ اتش کے آگے آپ کو نظر آیا ہے کبھی کوئی۔“ وہ سخت ناراض تھیں۔ انہیں یہ بات ہضم ہی نہ ہو رہی تھی کہ اتش ایک بار پھر اس لڑکی کی باتوں میں آکر میڈم تہینہ جیسی خاتون کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی کو بھول بھال چکا تھا۔

”آپ کل سے میری بات سن لیا کریں تو میرا کتنا وقت بچ جائے۔ لیکن آپ ایک دم جذباتی ہو جاتی ہیں۔“ عطیہ بیگم نے ایک بار پھر ماسٹر جی کی بات کاٹ دی۔

”جذباتی..... میں جذباتی ہو جاتی ہوں؟“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر واقعی انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اٹھو بیٹا ہے میرا اتش۔ میرے پاس کون سی چار پانچ اولادیں ہیں۔ ایک ہی تو پیدا دیا ہے اللہ۔

نے۔ اب اگر اس کے معاملے میں بھی جذباتی ناہوں تو کس کے معاملے میں ہوں۔ میرے دل میں کتنے ارمان ہیں اس کے لیے۔ یہ نہیں سوچتے آپ دونوں۔ آپ کے لیے بس بیٹے کی مرضی اور پسند اہم ہے۔ میں اور میری رائے آپ کے لیے ہمیشہ غیر ضروری رہے گی۔“ وہ روہا کی سی ہو گئی تھیں۔ وہ تو سوچا اور اتش کو اکتھے ایک ساتھ کام کرنا دیکھ کر خوش تھیں کہ اتش کے دل سے اس لڑکی کا خیال نکل چکا ہے لیکن یہ تو ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ ماسٹر جی کو بہت ڈکھا سا ہوا لیکن وہ واقعی مجبور تھے۔

اتش ان کو کہہ گیا تھا کہ میڈم تہینہ ان سب سے ایک بار پھر ملنا چاہتی ہیں اور اب کی بار صورت حال پہلے والی نا ہوگی۔ اتش کے چہرے پر جو اولاد کی خوشی انہوں نے دیکھی تھی، وہ انہیں یہ یاد کروانے کو کافی تھی کہ وہ کسی کی نہیں سنے گا تو پھر وہ کس بنیاد پر اسے سمجھاتے۔ وہ اولاد سے بلا وجہ کے بحث و مباحثہ کے شروع سے قائل تازہ تھے اور یہ ان کی خاشی تا بھی تھی بلکہ اٹھتے بیٹے کی محبت میں ایک خود ساختہ قسم کی مجبوری تھی۔

”ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر تو کوئی نہیں ہے۔ آپ اگر ایک اٹھوئی اولاد کے لیے جذباتی ہو سکتی ہیں تو میں ایک اٹھوئی زوجہ کے لیے جذباتی نہیں ہو سکتا۔ مگر میں کیا کروں اس معاملے میں ہمیشہ سے ہی غیر جانب دار رہا ہوں۔ بچے کی خوشی جس میں ہے، میرا وہ اسی طرف کا ہے۔“ وہ نہایت بودے سے انداز میں اپنا موقف بیان کر رہے تھے۔ عطیہ بیگم نے انہیں گھور کر دیکھا۔

”اور اس بچی کی خوشی؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیا نہیں کیا اس نے آپ کے بیٹے کے لیے۔ یہ وہی تھی جس نے آپ کے بیٹے کے اسٹینس کو اتنا اور بڑا کر دیا کہ آپ کی میڈم تہینہ سر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔ آپ نے اس کے نارے میں سوچا ہے کبھی۔ اس کے دل پر کیا گزرے گی؟“ وہ انہیں گھور رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے سر جھکا۔

”وہ بہت اچھی بچی ہے۔ بہت سمجھ دار اور ذمہ دار۔ یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمارے بیٹے کو ذمہ سے مانتا بھرت کر دیا ہے۔ اس کے لاپرواہی پن اور انتہائی ذمہ داری میں بدل دیا ہے۔ لیکن یہ صرف احسان ہے..... احسان۔ آپ اسے۔“ سستی محبت والی ٹینک لگا کر کیوں دیکھتی رہتی ہیں؟ آپ کیوں نہیں سمجھتی کہ اسے آپ کے بیٹے میں اس سے زیادہ اپنی نہیں ہے۔“ ماسٹر جی کا انداز ابھی بھی نا صاف تھا۔ عطیہ بیگم نے ایک گہری سانس بھری پھر عجیب سی رنجیدگی ان کے لہجے میں جھلکنے لگی تھی۔

”آپ کیوں نہیں سمجھتے ماسٹر جی۔“ وہ ”آپ“ پر زور دیتے ہوئے بولی تھیں۔ ”سونیا کی آنکھوں میں اتش کے لیے محبت دیکھی ہے میں نے۔ آپ نے نور نہیں کیا، بچی کچھ دنوں سے مڑ جھانی مڑ جھانی پھرتی ہے۔ اچھا مان لیتی ہوں یہ احسان ہی کسی لیکن عورت کو بھی بلا وجہ مرد پر احسان نہیں کرنی ماسٹر جی۔ وہ جب بھی مرد پر احسان کرتی ہے۔ اس کے پیچھے یہ میر جانی کجست محبت ہی ہوا کرتی ہے۔“

ماسٹر جی یہ بات سن کر دمگ رہ گئے تھے۔ ان کا دل چاہا وہ ایک دم اس بات سے انکار کر دیں لیکن وہ کر نہیں پائے تھے کیونکہ یہ بات بحیثیت ایک مرد وہ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ عطیہ بیگم غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں۔ سونیا کی کھل کھل کر ہنسی کئی دنوں سے نائی نہیں دی تھی انہیں۔ وہ تو ہر وقت ہنسی مسکراتی رہنے والی لڑکی تھی لیکن آج کل ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ ہنسی بھی سی رہنے لگی تھی۔

☆☆☆

”مجھے اتش کہتے ہیں۔ سب جتنا ہے مجھ پر۔“ انہا کی ساعتوں میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس نے فوراً رادی طور پر ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ وہاں موجود نہ تھا تو نظر آتا۔ سونیا نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے ہاتھوں کا جانب دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ خالی تھے کیونکہ زرین نے اسے سب کچھ لے چا چکی تھی۔ اس کے دل میں تیس اہائی اور اسے اس تکلیف سے رنج ہی نہیں پہنچا تھا،

یہ زاری بھی ہوئی تھی۔ اسے سخت الجھن بھی ہوئی تھی۔ اتش زرین کا ہی تو تھا، اس کا تو کبھی ہوا ہی نا تھا اور یہ بات تو ابتدا سے ہی سب جانتے تھے پھر اب اس کا اس طرح واپس آ جانا اتش کا سب کچھ بھلا کر پھر اس کا دم بھرنے لگ جانا ایسا کوئی عجیب عمل تو نا تھا۔ وہ اس لڑکی سے محبت کرنا تھا اور محبوب کو دیکھ کر تو سب ہی پھل چلا کرتے ہیں۔

اتش نے اگر اپنی تو بن بھلا دی تھی تو بھی یہ بات ایسی کوئی حیران کن تو نا تھی لیکن وہ یہ بات خود سے بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے یہ سب برا لگ رہا تھا کیونکہ اب اسے اتش اچھا لگنے لگا تھا۔ ”نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس کے بدن میں سخت لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے نفی میں سر جھکا تھا۔ یہ بات وہ مر کر بھی کسی کے سامنے تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ ”میں اتش ہوں۔ محبت جتنی ہے مجھ پر۔“ ایک بار پھر اس کی ساعتوں میں جیسے کوئی چلا یا تھا۔

وہ برملا، برجستہ برہنیل تذکرہ اور بات بے بات یہ جملہ کثرت سے بولنے کا عادی تھا۔ سونیا نے جب پہلی بار یہ جملہ سنا تو اسے نہایت برا لگا تھا۔ وہ اتش کو ہی نہیں اس کی ان تمام خود پسندی والی عادتوں کو بھی سخت نا پسند کرتی تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اتش کو سوجے سمجھے بنا۔ بس عادتاً ایسا کہنے کی عادت تھی۔ یہ بات بھی سچ تھی کہ وہ خود پسند تھا، اسے اپنی ذات کو سراہتے چلے جانا اچھا لگتا تھا یہی وجہ ہے کہ سونیا کو وہ شروع سے ہی پسند نا تھا۔ بزرگوں کے درمیان ان کے رشتے کی بات کے تذکرے نے اس نا پسندی کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیا تھا پھر سونیا پر آشکار ہوا تھا کہ وہ ہی اسے نا پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اتش بھی اس سے خار کھاتا تھا۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن پھر جانے کیسے سب کچھ بدلتا چلا گیا۔ وہ ان کے گھر میں آئی پھر جان بوجھ کر اس کے قریب آئی۔ وہ دوست بن گئے اور آہستہ آہستہ بزنس پارٹنر بھی۔ یہ بھی قبول تھا اسے۔ لیکن وہ اسے اچھا لگنے لگ گیا تھا۔ اتنا اچھا کہ وہ اس

کے دور جانے کے خیال سے تکلیف میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اتنا اچھا کہ زمین کی واپسی نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اتنا اچھا کہ اس کے اس عمل نے سونیا کی ہنسی کو کھلا کر رکھ دیا تھا۔

زمین کی واپسی اسے اچھی نا لگ رہی تھی اور یہ سب قبول نہ تھا اسے۔ وہ محبت و جنت کی تو قائل ہی نہ رہی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا محبت جنتی ہے مجھ پر۔“ وہ جیسے دور کہیں کھڑا اب چڑا رہا تھا اسے۔

سونیا نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ کہیں نہیں تھا اور اس بات کا سونیا کو اتنا دکھ تھا کہ اس سے کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسے اپنی کیفیت خود بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

یہ سب تو ہونا ہی تھا ”سونیا نے ایک بار پھر تاسف سے سوچا۔ زمین کو واپس آئے چند دن ہی تو ہوئے تھے اور سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ جکسا پزل کا ہر ٹکڑا جو آتش کے ایک درزی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے الٹ پلٹ ہو گیا تھا، اس کے ڈریس ڈیزائنز ہو جانے کے بعد واپس اپنی درست پوزیشن پر آ گیا تھا۔ اب تصویر بالکل واضح تھی، مکمل اور خوب صورت بھی۔ لیکن کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل گئی تھی تو وہ سونیا عرف محراب کا دل تھا۔

آتش آج باقاعدہ ایک بار پھر زمین کے والدین سے ملنے گیا تھا اور اب کی بار وہ صرف زمین کی دعوت پر نہیں گیا تھا بلکہ اسے میڈم تمہینہ نے خود بچ پورے خاندان کے مدعو کیا تھا۔ انہوں نے اس کی، اس کے ڈیزائنز کی پذیرائی کو اتنے کھلے دل سے قبول کیا تھا کہ آتش سب بھول بھال گیا تھا بلکہ وہ بے حد خوش تھا۔ اس کی جیسے دلی مراد بر آتی تھی اور سونیا اس کو بتاتی تھی نا جتنا بانی تھی کہ۔۔۔۔۔

”آتش! تم اپنی توہین کو اتنی جلدی کیسے بھول سکتے ہو۔ ایسے مت کرو۔ مجھے تمہاری اس حرکت سے تکلیف ہو رہی ہے۔ بے حد تکلیف۔“

یہ بات تو وہ خود کو بھی بتا نہیں پاری تھی تو آتش کو

بتانا تو دور کی بات تھی۔ وہ سب آج میڈم تمہینہ کے یہاں مدعو تھے۔

”یہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ وہ خود کو بار بار یہی سمجھاتی رہتی تھی لیکن اس کے ہاتھ سے سب کچھ برف کی طرح پھل کر بہہ گیا تھا مگر دنیا کو اپنے زخم دکھانے سے کیا حاصل ہو جاتا۔ اسے جموٹی ہمدردیوں سے چوٹی۔ دہائی جگہ سے اٹھی تھی۔

”دل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ لیکن عزم سلامت رہنے چاہئیں۔“ اس نے خود اپنے ہی سامنے اپنی پسندیدہ نصیحت کو دہرایا تھا۔

☆☆☆

”تم خوش ہو آتش؟“ زمین نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”نہیں۔ اس میں خوش ہونے والی بات ہی کیا ہے؟“ اس نے نیم سنجیدہ سے انداز میں کہا تھا۔

زمین نے زیادہ وضاحت نہ دیا تھا۔ اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ وہ خوش تھی۔ اس کی ہنسی نے اتنا اچھا ڈنڈا دیا تھا آتش کے اعزاز میں اور اس کے تایا اور پیچھو کی فیملیز بھی مدعو تھیں۔ بظاہر یہ ایک عام سا ڈنڈا تھا جو لوگ تعلقات بڑھانے کے لیے دیا کرتے ہیں لیکن آتش کا تعارف جس خصوصی انداز میں کروایا گیا تھا وہ سارے رشتہ داروں کو باور کبروائے کو کافی تھا کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

”تم کچھ بھی کہو۔ لیکن میں بہت خوش ہوں۔ میری سب کزنز تمہیں دیکھ کر حیران ہی ہو گئی ہیں۔ اتنے مشہور ڈیزائنر سے میری وابستگی انہیں ہضم ہی نہیں ہو رہی۔“ وہ پر جوش سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ آتش کو اس کے چہرے پر پھر سے رنگ اچھے لگے تھے۔ ایک آسودگی سی اس کے اندر اتر آئی۔ یہ ایک بہت خوب صورت احساس تھا۔ ہم جسے چاہتے ہیں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسے زمین کے چہرے پر پھیلا اطمینان اور سکون بے حد بھلا لگ رہا تھا اور اس کی اطمینان و سکون میں اسے وہ چہرہ یاد آیا جس کی مسکراہٹ اسے ہمیشہ اپنے لیے کسی لگی

چارم سے کم نا لگی تھی۔

”سونیا نہیں آئی؟“ اس نے خود سے سوال کیا تھا کیونکہ اس کی امی، ماسٹر جی اور پیچھو اور پیچھا جی تو موجود تھے۔ زمین نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس نے استفسار نہیں کیا تھا لیکن آتش کے چہرے پر جو ذرا سی الجھن چمکی تھی اس سے ایک بڑا سا سوالیہ نشان خود بخود زمین کے چہرے پر بچ گیا تھا۔

”میں نے سونیا کو نہیں دیکھا۔ وہ نہیں آئی؟“ آتش نے اب با آواز بلند سوال کیا تھا۔ زمین نے سر جھٹکا۔

”نہیں آئی تو نا سہی۔ اس کی مرضی۔“ اس کے لیے یہ اتنا اہم نہیں تھا۔

”ارے خواہ خواہ نا سہی۔ اسے یہاں آنا چاہیے تھا۔“ ”محراب“ کی اتنی پذیرائی اسی کی بدولت تو ممکن ہوئی ہے۔ ٹھہر دیں اسے کال کرنا ہوں۔“ اس نے کہہ کر انتظار نہیں کیا تھا بلکہ فون ملانے لگا تھا۔ کئی بار کی مسلسل کوشش کے باوجود سونیا نے فون نہیں اٹھا یا تھا اور یہ بات آتش کے لیے بہت حیران کن تھی۔ وہ کبھی فون کالز کو انکوری نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ برملا کہتی تھی میرا تو سارا بزنس ہی فون کالز کا محتاج ہے۔

”کیا ہوا؟“ زمین نے پوچھا تھا۔

”وہ فون نہیں اٹھا رہی۔“ آتش کے لہجے میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔ زمین کے چہرے پر فاتحانہ سی مسکراہٹ چمک اٹھی تھی۔

”وہ اٹھائے گی بھی نہیں کیونکہ وہ بھی جل بھن گئی ہے۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ آتش نے اس کی بات کے منہ بوم کو سمجھ بھناتر دیدی انداز میں گردن ہلائی تھی۔

”ارے نہیں بھئی۔ وہ نہیں جل سکتی۔ وہ جلا کر خاک کر دینے والوں میں سے ہے۔ تم نے سمجھا کیا ہے اسے۔ وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو تھکے چرائیوں پر پھونک مار دیں تو وہ بھی زندہ ہوا انھیں۔ وہ اپنی ہنسی میں روشنی کے کرچکتی ہے کہ جہاں تاریکی پائے دیں اُجالا کر دے۔ اس کی مسکراہٹ سے امید پھوٹی ہے اور جو وہ

کہیں ہنس دے تو راستہ بھولنے والے کو راستہ یاد آجائے۔ وہ زندگی میں ہارنے والوں کے ساتھ تب تک کھڑی رہتی ہے جب تک وہ جیتنے نہیں لگ جاتے۔ وہ محراب ہے یعنی سونیا۔ من چاہی۔ وہ نہیں جل سکتی۔ تم نے بارش کو جلتے دیکھا ہے بھی۔“

آتش کے لہجے میں وہی مان اور جھروسا تھا جو ایک اچھے دوست کو دوسرے دوست پر ہوتا ہے۔ اس کے ہر لفظ میں وہ احترام تھا جو کسی بھی معتبر دوست کے لیے کسی دوسرے دوست کے لہجے میں ہو سکتا ہے لیکن زمین پہلی بار خود جل اٹھی تھی۔ چارٹ دس انچ سے۔

”وہ دیکھو آگنی میری پھل پیری۔“ آتش نے ایک دم ہی اس طرف دیکھا تھا۔ وہ ہنستی مسکراتی ٹھٹھکھلائی سی اندر داخل ہو رہی تھی۔ سارے وجود سے وہی پُر اعتمادی روشنی پھوٹ رہی تھی جو سامنے نظر آنے والے پر شخص کو تازہ دم کر دے۔ وہی انفرادیت، وہی توانائی۔ جسے محراب عرف سونیا قیمتی قرار دیتی تھی، ایک لمحے میں ہر طرف چھانے لگی تھی۔

”دل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ لیکن اشتہار لگانے کا فائدہ۔ سول تو ٹوٹا تھا لیکن عزم سلامت تھا۔ ایک بار پھر۔۔۔۔۔

☆☆☆

پیارے دوستو! یہاں آکر معاملہ میرے ہاتھ سے بھی جیسے پھسلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ جو ہور ہا تھا، اچھا نہیں ہو رہا تھا۔ یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس سب کی توقع نہیں کی تھی۔ میں اگر اپنے بیٹے کی خوشی میں خوش تھا تو بیٹی جیسی بھانجی بھی مجھے بہت عزیز تھی۔ میں نے یہ نہیں چاہا تھا کہ وہ میرے جیسی لڑکی کسی ڈکھ سے دوچار ہوئی لیکن ایسا ہو گیا تھا۔ مجھے اعتراف کر لینے دیں کہ اس معاملے میں کچھ قصور دار تو میں بھی تھا لیکن کیسے۔ یہ اب آخری حصے میں ہی بتاؤں گا آپ کو۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☆☆☆

# آئینہ حیا

وہ کبھی بھی اپنی اماں کی لاڈلی نہیں رہی تھی، ہوتی بھی کیسے لڑکی جو بھی میٹرک ہوتے ہی اماں کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی، جبکہ اس نے آبا کے تجربے سے نصیحت پکڑ لی تھی کہ شادی کر کے زندگی کو سمجھوتے کی چھوہندی تو لگانی ہی ہے تو کیوں نہ پہلے اپنی سن مرضی کی صاف ستھری زندگی بسر کر لی جائے پھر چاہے جو ہوسو ہو، مگر اماں اس کی مین مرضی کی زندگی گزارنے والی منطق کے تحت خلاف تھیں۔

”اماں مجھے پڑھنے دو آگے، میٹرک کی آج کے دور میں اوقات ہی کیا ہے۔“ وہ ہنسی ہوئی۔

”چل ہٹ، پڑھ کے کیا کرے گی، شادی ہوگی تو ساری ڈگریاں راکھ بن جائیں گی اور جی بڑا ہوگا۔“ اماں کے الفاظ سے زیادہ وہ انداز پر دوگ رہ گئی۔

”تو میری ماں ہو کر ایسی امید لگائے بیٹھی ہے پھر کسی اور سے کیا گلہ کرنا۔“ صدے سے کہتی وہ وہاں سے ہٹ گئی۔

پھر نہانے کیا ہوا، کچھ دنوں بعد اماں نے اسے آگے پڑھنے کی اجازت دے دی، غالب گمان تھا کہ یہ سب آیا کی مہربانی تھی، انہوں نے ہی اماں سے منہ ماری تھی اور بالآخر انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

☆☆☆

کسی بے وفا کی مانند وقت کی پیاری سے

دو سال نکل کر جو گزرے تو واپس نہ آئے۔ اماں نے اپنا راگ بدلا نہ سُر۔ اُس سے پوچھنے یا بتانے کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر رشتہ ڈھونڈ مہم کے لیے کمر کس لی، جس نے واقعتاً اماں کو ناکوں جنے چبوائے، مہم کے لیے اماں کی سرگرمیوں سے وہ بھی واقف ہو چکی تھی، مگر لب بستہ کیے سب دیکھتی رہی، وہ جو ہوش سنبھالتے ہی سنا تھا کہ آج کل اچھے لڑکوں کا کال پڑا ہے، مگر یہ کال پڑتا کیسے ہے، اب اس کی گناہ گار آنکھوں نے مشاہدہ بھی کر لیا۔

اب حال یہ تھا کہ اماں کو پیسے دور شدہ لوسنٹر یعنی میرج بیورو کا خرچ کرنا پڑا، بھیجی سسرال والوں سے بھی بنا کر نہ رکھی تھی اور میکے میں کوئی جوڑ کا تھا نہیں کہ وہاں سے کوئی آس رکھتیں، پھر خستہ حال دیواروں اور بوسیدہ دروازے والے گھر میں خوشی سے آتا بھی کون۔ بلا آخر ایک پرانی جاننے اور رشتہ کروانے والی کی وساطت سے اماں میرج بیورو پر پہنچی تو وہاں کی چمک دمک دیکھ کر آنکھیں اور قیامت سن کر منہ چل گیا۔

”آئے ہائے، یہ بیرو (بیورو) والے ایسے قصائی بنے بیٹھے ہیں، جیسے ابھی بکرا (لڑکا) کھا کر اتار کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے، کہ بھئی یہ تو تمہارے حوالے کیا، اب جیسے چاہے اپنی لڑکی بیاہ دو اس ساتھ کوئی پوچھنے والا ہوگا نہ روکنے والا۔“

دورے سے دانیسی پر اماں کی یہ رائے تھی، اس

کان تو کھڑے ہی تھے، جھٹ ہوئی۔

”دیکھا اماں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مہر سے انتظار کرو، کیوں پریشانی ہے اپنا وقت اور صحت برباد کر رہی ہو، ہزاروں روپے کمیشن اور شادی کے وقت جہیز پر خرچ کرنے سے بہتر ہے کہ تم میری پڑھائی پر یہ پیسے خرچ کرو، دیکھ لو اماں ایک نہ ایک دن تو شادی

ہوتی جائے گی، ابھی مجھے کچھ کرنے دو اپنے اور تمہارے لیے۔“

اماں کو نرم پڑتا دیکھ کر اس نے دوبارہ اپنی عرضی پیش کی، جسے اماں نے تین دن بعد خالد سیدہ (رشتے والی) کی تازہ برین واشنگ سے مسترد کر دیا۔ جاتے جاتے خالد بھی اپنا حصہ مانگنا نہ بھولی۔





کہہ رہی تھی۔

شوہر کو بغیر بائیک کے دفتر سے آتے دیکھا تو چونکے  
بنانہ رہ سکی۔

”کیا؟“ شوہر نامدار نے اس کے تاثرات  
دیکھ کر انسا سوال کیا۔

”آپ کی موٹر۔“ اس نے دہی آواز سے  
پوچھا، مانو وہ بھی قیامت ہو گیا۔

”تو اپنی ماں کے گھر سے لائی تھی کیا، جس کی  
تھی اسے لوٹا دی۔“

”سلیم۔“ اماں تنبیہ کرتی باہر آئیں۔  
”بس اماں مجھ سے یہ نایک نہیں ہوتا اب،

تو نے بھی کن بھوکے ننگے لوگوں میں پیادہ دیا، ذرا پیسے  
خرچ کرتی تو کسی کھاتے پیتے گھر سے واپس مل ہی

جاتی مجھے بھی، وہ سنا نہیں، چچی کیا کہتی ہیں، پیسے دو  
رشتہ لو۔“

وہ اس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر بکنا جھلکا  
غسل خانے کی جانب چلا گیا۔

اور وہ بڑا سا سوالیہ نشان چہرے پہ لیے جہاں  
تھی وہیں جم سی گئی۔ گھر داری اور سلیقہ مندی تو اس

نے اماں سے سیکھ لی تھی، مگر اس بار غربت بھی صرف  
حوا کی بیٹی کا ہی نذر نہ بھری تھی۔

☆☆☆

”اے سیدہ! تیری لاٹری لگی ہے کیا۔“ نکو  
والے میاں صاحب اس کے ہر دوسرے دن لمبی لمبی

کالیں کرنے پر حیران ہوئے بنانہ رہ سکے۔  
”ارے مت پوچھ، لاٹری سے کچھ کم بھی نہیں،

یہ کام ہی ایسا ہے، یہ بیٹی کئی کھلے پیر (بیورو) والوں  
سے بنا کر رکھو تو بڑے پیش ہیں، ایک پارٹی کو راضی

کر دو اور دوسری کی عقل پر اپنی باندھ دو۔ تجھے بھی  
بتائے دے رہی ہوں لگ کے کوئی کام ڈھونڈ یا پھر

میرے ساتھ پارٹنر (پارٹنر) شپ کر لے۔ میں تجھ  
کے کو پوچھ سے نہیں باندھنے کی۔“ خالہ سیدہ، وارو کے

سوالے استعمال شدہ کارڈ کو ذرا ترچھا کر کے بطور  
نوٹھ پک استعمال کرتے ہوئے نخوت دبے نیازی

”اے بہن! پیسے تو پکڑا دو، پینس کے لیے، پتہ  
ہے نا فون کرنے کروانے کے چکر میں ہی ہزاروں  
لگ جاتے ہیں، آج کل تو سیدھی بات ہے، پیسے دو  
اور رشتہ لو والا حساب ہے۔“ اماں اس کی بات پر سر

دھتی آئیں اور مٹھی گرم کر کے اسے دردناک سے  
رخصت کیا۔ وہ دل موس کر رہ گئی۔

اماں کی سر توڑ کوششیں آخر کار رنگ لے  
آئیں، دیسیوں ڈرائنگ روم پر پڑوں، سینکڑوں

چائے پانی یہ خرچ کرنے اور بلا مبالغہ ہزاروں میرج  
بیورو کی نذر کرنے کے بعد، اس کی ڈولی رخصت

ہوئی۔

☆☆☆

دلہن کا کمرہ آرائشی پھولوں سے سجا تھا اور مٹی  
کے تیل کی خوشبو بتاتی تھی کہ دیواروں کو تازہ قلعی

کرا کے کمرے کو بیڈروم بنانے کی کمزوری کوشش کی  
گئی ہے۔ بیڈ کے دائیں جانب رکھے سنگھار میز پر

عطر کی شیشی، ہاشمی سرے کی گولڈن ڈیبا، آٹلے کے  
تیل کی بوتل، سرخ رنگ کا سنگھار اور چوڑیوں والا

اسٹینڈل کرا سے حساس دلا رہے تھے کہ یہ سب اس  
کے لیے ہے۔ آج سے پہلے سنگھار میز کی اتنی تواضع

کی کئی تھی نہ ہی اسے اس قابل مانا گیا۔  
بائیں جانب چھوٹی سی کھڑکی، میل خور رنگ

کے کپڑے جو گلابی پھول پرنٹ شدہ تھا کے پردے  
کی قید میں تھی، کہا کہ وہ کھڑکی اس کے لیے ہوا کا

جھونکا لے کر آئی۔  
خیر وہ کبھی بنی بیٹھی اپنے نیچے نویلے سرتاج

کا انتظار کرتی اماں کی نصیحتوں کو دہرائی رہی۔  
کچھ لمحے مزید ڈستی خاموشی کی نظر ہوئے،

پھر یک دم دروازے پر دستک ہوئی تو وہ ہڑبڑا اٹھی،  
چند لمحے لگے تھے اسے سنبھلنے میں۔۔۔۔۔

☆☆☆

شام کا پنجھی اپنے پر پھیلائے لگا اور گل داؤدی  
نے سہم کر لب سی لیے۔ آج خلاف معمول وقوف

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

**بساطِ دل**  
رہی ہے  
افسان آفریدی  
قیمت 400 روپے

**فصلِ فہم کا گنگو شہزادہ**  
رضیہ جمیل  
قیمت 300 روپے

**گلِ کھسار**  
فرح بخاری  
قیمت 400 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

# بے کراں

صبح کے پنکھ پیازی رنگ کے تھے..... جن پر سنہری سفوف چھڑکا جا رہا تھا۔ اجالا پھیلے کافی وقت بیت چکا تھا۔

ایسے میں ایک فنٹ ہاتھ پر چودہ سالہ لڑکی اور اسی کا ہم عمر لڑکا چلتا دکھائی دے رہے تھے..... جن کی چال میں ہی نہیں، انداز میں بھی غلت تھی۔ سفید یونیفارم پہنے، کشمیری بچوں کے اسٹائل میں سر پر اسکارف لپیٹے۔ ہاتھ میں میٹھ کی ہیلپنگ بک پکڑے وہ پورے زور و شور اور سنجیدگی سے میٹھ کے سوال ذہنی نشین کر لینے کے بڑے جتن کرنی دکھائی دے رہی تھی۔ شفاف چہرے پر پاکیزہ معصومیت تھی۔ اور گال گلابی گلابی پڑ رہے تھے..... اسے اپنے ٹیٹ سے فکر ستائے جا رہی تھی۔

اس کے برعکس لڑکا ہلکے ہلکے جوش میں مسکراتا..... زیر لب دھیرے دھیرے کوئی دھن بکھیرتا۔ ایک ہاتھ سے بار بار بال سنوار رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی اور اہم کام اس کے پاس نہیں..... آہستگی سے گنگناتے ہوئے وہ ہنسا..... پھر بول اٹھا۔

”سنو“ لڑکی رک گئی۔

”جلدی کہو“

”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو.....“ لڑکا ہچکچا کے بولا..... لڑکی ٹھٹھک گئی یوں جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس بے سبکی بات کا کیا جواب دے ”تو میں کیا کرو؟“ سر پر لیپے اسکارف سے ماتھے کے بل چھپ گئے..... لہجہ ناگواری لیے ہوئے تھا۔

دو دن پہلے کا لکھا خط محفوظ تھا..... اثر نہ لینے والی سکرابٹ کے ساتھ اس نے ہاتھ آگے کر دیا..... لڑکی اس ڈھٹائی پر بے بس سی ہوئی۔

”یہ پڑھنا تم..... پھر بتانا“ لڑکی نے خط لیا۔ ٹیٹ سے دل اٹھ چکا تھا۔ بھاڑ میں جائے..... لڑکا چپ پر بے حد خوش ہوا۔

اسکول سے واپسی پر لڑکے کو باپ نے طلب کیا۔ کچھ بولتے بولتے وہ درگا گھر کے سب ہی افراد

”میں تم سے..... محبت کرتا ہوں۔“ وہ بے محبت سے بولا تھا۔ لڑکی ہکا بکا رہ گئی۔ بلکہ ششدر بھونچکا۔

”تمہارا دماغ ٹھکانے پر ہے۔“ اگلے لمحے میں وہ غصے سے کہہ رہی تھی..... گلابی گال مارے صدمے کے قندھاری انا رہ گئے۔

”کیا ہوا..... میں نے کچھ غلط تو نہیں کیا۔ ہر کوئی محبت کرتا ہے۔ میں بھی کر نے لگا ہوں۔“ چودہ سال کا لڑکا فکر مند بنی سے ہاتھ تھام کر بولا۔ لڑکی فوراً سے بیشتر ہاتھ بچھ کر اسے دے مارا۔

”تم نہایت فضول لڑکے ہو..... میں سوچ رہی نہیں سکتی تھی کہ ابھی سے تم ایسی داہیات باتوں کے پیچھے پڑو گے۔ وہ بھی مجھے کہہ دو گے؟ مجھے..... جتنی توجہ ان باتوں پر دیتے ہو پڑھائی پر دو تو فائدہ بھی اٹھاؤ..... بڑے گندے دوست ہیں تمہارے انہوں نے ہی تمہیں سکھایا تاں یہ سب..... ورنہ میں تمہیں اچھا سمجھتی تھی۔

سرخ گالوں والی لڑکی میٹھ کے سوال بھول کر اس کو جھاڑ پار ہی تھی۔ وہ چند ماہ بڑی ہو گئی اس اور ان باتوں کو بہت برے انداز میں لیتی تھی..... زہر لگتے تھے ایسے لڑکے..... وہ بھی لگ رہا تھا۔

اور زہر لگتا لڑکا ذرا خفا ہوا..... اس میں برائی۔ وہ سمجھا..... لڑکیاں کون سا جلدی مانتی ہیں اور بہت جگہ سے سنا ہے کہ محبت اپنا آپ منوال ہے۔ یہ مان جائے گی۔ ایک منٹ مجھے کچھ کر چاہیے..... پس..... اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا

جمع تھے۔ کشمیری لڑکیوں کے سرخ گالوں جیسی لڑکی بھی۔ اس کا دل دھڑکا کہ کانپا، سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ باپ کے ہاتھ میں سفید پرچا تھا۔ چہرے تاثرات کرخت، لڑکا زمین میں دھس گیا۔ وہ جو سمجھا تھا۔ غلط سمجھا تھا۔ اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ اور اس شام سب کے سامنے..... اف، قیامت وہ سر جھکائے شرمندہ تھا۔ حد سے بڑھ کر شرمسار، سب سمجھا کر (اس کے نزدیک پتھر برسا کر) جا چکے۔



ماہنامہ کرن 122 ستمبر 2018

لے کر لڑکے کو ناگوار ہی محسوس ہوئی۔

”تو پھر اس تقریر کا مقصد؟“

”مقصد سامنے ہے اگر آپ انجان نہ بنیں تو۔“

میں سمجھ گئی ہوں کہ آپ کو غصہ کس بات پر

آ رہا ہے۔ اس لڑکی کو چیخڑ رہے تھے آپ اور ان

بھائی صاحب کی مداخلت پر غنڈہ گردی دکھا رہے

ہیں۔ اپنا نہیں تو اپنی فیملی کا خیال کر لیں۔ کیا آپ

کے گھر میں بہن نہیں ہے؟ لڑکے نے ایک پل کو

اسے گھورا۔۔۔۔۔ پھر سکون سے بازو سینے پر لپیٹ

لیے۔

”یہ لڑکی آپ کی بہن ہے۔۔۔۔۔؟“

”بہن نہیں ہے۔“ زریں نے کہنا چاہا۔

”میری بھی بہن نہیں ہے۔۔۔۔۔ پھر چیخڑ لوں؟“

زریں ہکا بکا ہوتے رہ گئی۔

”عجیب انسان ہیں آپ۔۔۔۔۔ بلکہ ڈھٹائی کی

حد ہے۔“ وہ منھیاں بچھ کر تلملائی تھی۔

”آپ نے درست اندازہ لگایا۔ میں مشکور

ہوں۔“ اسے اثر نہ لیتا دیکھ زریں کو سبکی کا احساس

ہوا۔

”لیکن میں آپ کو ایسا کرنے نہیں دوں

گی۔۔۔۔۔ یہ فیملی ادارہ ہے اور یہاں ایسی کھلے عام

بد معاشی کم از کم میں نہیں دیکھ سکتی بتا آپ جیسے لڑکوں

کا مسئلہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟ کسی ایک لڑکی نے آپ کی کسی

بھی چیز سے متاثر ہو کر آپ کو لفٹ کر دیا بھی دی تو

آپ ہر لڑکی کو ایسا سمجھنے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ تا صرف سمجھتے

ہیں بلکہ اپنا حق جتانے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ یہیں

اگر کسی لڑکی نے آپ کو سخت جواب دیتے ہوئے اپنی

حد دکھا جائے تو آپ اسے انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ اگر

بنا بھی لیتے ہیں تو اسے اپنا مسئلہ رکھیے۔۔۔۔۔ تاکہ

دوسرے کے لیے مسائل کھڑے کیجیے۔ کیا آپ دیکھ

سکتے ہیں کہ وہ لڑکی کتنی ہراساں لگ رہی ہے۔ مگر

آپ کیوں دیکھیں گے کہ آپ کی تو بہن ہی نہیں ہے

نا؟ جذبات میں آ کر وہ جانے کیا کیا بول جاتی کہ

یک لخت زبان کو بریک لگائی پڑی۔

”انف۔۔۔۔۔ شٹ اپ ناؤ۔۔۔۔۔“ انگلی اٹھا

جیسے غرایا تھا۔ دھند کے حصار میں کھڑی زریں

اب کی بار بھی اثر نہیں لیا تھا۔

”سچائی کا ش آپ سن سکیں۔۔۔۔۔ تاکہ کچھ

میں آئے۔“ وہ نخوت سے بولی تھی۔ پہلو میں

لڑکی کانچ میں تھی۔ اور مارے گھبراہٹ کے

کہنے کے لیے منہ کھولتی۔ پھر پکا جاتی۔

”سچائی پر بڑا یقین رکھتی ہیں آپ؟“

چبا کر بولا۔

”ایمان بھی رکھتی ہوں۔“ وہ بھی اسی انداز

میں بولی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ آپ مجھ پر اپنی اچھائی ظاہر

چاہتی ہیں؟“

”میں ایسا کیوں چاہوں گی؟“ وہ پل

جیران رہ گئی۔

”کیونکہ آپ میری ایمیشن پانا چاہتی ہیں۔“

”ادشٹ اپ مسٹر۔۔۔۔۔“

”صرف سچائی پر ایمان رکھتی ہیں مگر پچھلا

نہیں۔ شہریار نیازی نام ہے میرا۔۔۔۔۔ ایک ناقابل

فراموش شخصیت۔۔۔۔۔ کی نہیں ہے مجھے لڑکیوں کی

میری فیملی پر کوئی سوال اٹھائے میں برداشت نہیں

کرتا اور آپ کو بھی چیخڑوں گا۔ اب یقیناً آپ کا دل

تھپڑ مارنے کو چاہے گا؟“ وہ تائید کے لیے رک

زریں نے مضبوطی سے جواب دیا۔

”صرف چاہے گا نہیں۔۔۔۔۔ میں مار بھی

ہوں۔“

”ہوں گڈ۔۔۔۔۔ تو مارے۔ دکھائیے مارے؟“

اس نے نگاہیں گھما کر کہا جیسے پیچھے کو اشارہ کیا۔

زریں کو اپنا آپ بڑا ہونق سا لگا تھا۔

”پلیز۔ آپ لوگ آپس میں جھگڑنا

کریں۔۔۔۔۔ اسے سزا مل چکی ہے۔“ اب کی بار لڑ

مری مری آواز میں بولی تھی۔ زریں اسے دیکھنے

کے۔۔۔۔۔ کسے سزا مل چکی ہے؟“ وہ

میں پھنسی تھی۔

”اے۔۔۔۔۔ اس نے بد تمیزی کی مجھ سے۔۔۔۔۔

ہر یار نیازی آپ کا شکریہ۔۔۔۔۔“ لڑکی تشکر آمیز

جذبات سے شکر یہ جتا رہی تھی۔ اور زریں پچھلی

انگلی کے ساتھ سرخ چہرے والے لڑکے کو دیکھنے

لگی۔۔۔۔۔ اپنی طبیعت کے ہاتھوں وہ بری طرح پھنسی

مئی۔

”اب آپ شکایت درج کروا کر شکریہ کا

واقعہ دیں گی۔ یا یہ زحمت مجھے اٹھانی پڑے گی؟“

زریں کا دل چاہا زین پھنے اور اس میں سما جائے۔

زریں نے سخت زدہ چہرے کے ساتھ ہنسا چاہا۔

ثر مند کی احساس زائل کرنے کی شعوری

کوشش۔۔۔۔۔ مگر ناکام رہی۔ وہ اس وقت ترس کھانے

نے لائق ہو رہی تھی۔ پھنسی پھنسی آواز میں اس نے

ہنسا چاہا۔

”وہ۔۔۔۔۔ آہم۔۔۔۔۔ ایم سو رہی۔۔۔۔۔“ شہریار نے

ہاتھ اٹھا دیا۔

”اس کی فرصت نہیں مجھے۔۔۔۔۔“

اس کے لیے میں واضح ناراضی تھی۔ زریں

اپنی جگہ چوری بن گئی۔ بلکہ جرم اور وہ تھی بھی اس

نے اعتراف کر لیا۔ وہ بے حد شرمندہ ہوتی رہی،

شہریار بے حد خفا، زریں نظریں جھکا کر انجان بن کر

اس کے پاس گزرتی تھی۔ وہ طنز کرنے سے باز نہیں

آتا تھا۔ زریں کو ماننا پڑا کہ وہ اس لیے ناقابل

فراموش شخصیت تھا کیونکہ خود کو فراموش نہیں ہونے

دیتا تھا۔ پھر وہ تو تھی بھی اس کی معذرت کی طلب گار

اور اس سے پرے ایک حقیقت یہ بھی کہ دونوں کے

درمیان غیر شناسائی کی دیوار گرتی جا رہی تھی۔ پھر یہ

نسبی اور شرمندگی دونوں کو پاس لانے کا سبب بنی،

ہنسا غلط نہیں تھا۔

☆☆☆

آڈیو ریم ہال کی سیڑھیاں سنسان پڑی

تھیں۔ اطراف کی کھوپڑیوں میں بے تحاشا پھول

پتے تھے۔ ان سے محسوس ہونے لگی تھی خوشبو سارے

ہال چھائی سانسوں کو بو بھل کر تھی۔ گزشتہ شب

میں پھنسی تھی۔

میں پھنسی تھی۔

بارش اور سنہری دھوپ کی مہک، طمانیت، آسودگی اور

سرشاری بن کر اس کے چہرے پر پھیل رہی تھی خوشی

وہاں وقصاں تھی۔ آڈیو ریم ہال کی سیڑھیوں پر وہ

کب سے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ ہر منظر مکمل اور حسین تھا۔

”تم ایک اہم موقع ضائع کر رہی ہو۔ حالانکہ

میں نے خوب صورت سر پرانہ پٹیاں کیا ہوا تھا۔“ اپنی

آواز اور لہجے سے جو شہریار نیازی لگتا تھا۔ افسوس

سے کہہ رہا تھا۔ زریں متاثر ہوئے بغیر بے چارگی

سے مسکرائی رہی۔

”یقیناً ایسا ہوگا مگر میں ایسا نہیں چاہتی۔“ اس

نے نرمی سے جواب دیا۔ شہریار کی فہمائشی نگاہیں

اٹھیں۔

”کیا؟“

”کانچ سے باہر جا کر تم سے ملنا۔ میں ماننی

ہوں تم میری بے حد عزت کرتے ہو مگر میں جس

کلاس سے تعلق رکھتی ہو۔ وہاں کی کچھ حدود ہیں جن

کو میں خود پر لاگو کرتی ہوں۔ تمہیں میری بات کا

احترام کرنا چاہیے۔

”اور میں کرتا ہوں۔“ میں نے تمہیں فورس تو

نہیں کیا ناں! بس اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ وہ

یقین دلاتے ہوئے بولا تھا۔

”شہریار میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں اور

میری ماں، بابا کی وفات کے بعد ماموں کے گھر میں

رہ رہے ہیں۔ بابا کے بعد مجھے ماموں سے بے حد

محبت ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ہمیں کہیں دیکھ کر ان

کا اعتبار ٹوٹے۔ اور ویسے بھی تھوڑے عرصے کی ہی

بات ہے ناں۔ وہ مدہم ہی آواز میں جیسے معصوم بچے

کو سمجھاتے ہوئے گویا تھی۔ شہریار نے روشن آنکھوں

سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھ سکتا ہوں زریں۔ تم صفائی مت

دو۔“ زریں مسکرا دی۔ چند پل خاموشی کی نذر

ہوئے۔ شہریار اسے دیکھ رہا تھا۔ جس کے شفاف

چہرے پر سکون تھا۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت ہرگز

نہیں تھی مگر دیکھنے میں اچھی لگتی تھی۔ پر کشش سی



خاموشی محسوس کرتے ہوئے زریں کی آنکھیں چلیں  
ایک خیال ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا۔  
”سنو..... مجھے کچھ بتانا تھا۔“ شہریار نے اس  
کی بنجیدگی پر دھیان دیے بغیر کہا۔  
”بتاؤ۔“

”مجھے ایک فیملی نے پسند کر لیا ہے۔“ آہستگی  
سے بولی۔ شہریار چونکا۔  
”مطلب؟“ بھنویں کھڑی ہوئیں۔ پیشانی  
سمٹ گئی۔

”مطلب انہیں میں پسند آئی۔ اور انہوں نے  
رشتے کی بات کی ہے۔ مجھے لگتا ہے ای بھی مطمئن  
ہیں۔ اس نے بڑے آرام سے کاغذ کو شعلہ دکھایا۔  
شہریار کی سماعتوں پر جیسے بم گرا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا  
ہوا۔

”واٹ.....؟ کس نے..... کیسے؟ کب کی  
بات ہے اور تم مجھے اب بتا رہی ہو..... وہ بھی اتنے  
سکون سے..... تمہیں صدمہ لگا ہے ناں تب ہی اتنے  
آرام سے بتا رہی ہو.....؟ اومانی گاڈ..... چلو تھے  
یعنی سے چھٹی آواز سے آڈیو ریم ہال کی سڑھیوں پر  
براجمان ساری خاموشی دھوپ میں جکس گئی.....  
چلاتے لہجے میں بولتے ہوئے ایک دم اس نے  
زریں کی کلائی تھامی۔ زریں بری طرح بوکھلا گئی۔  
”کہاں..... کہاں چلنا ہے؟“ سیڑھیاں  
اترے ہوئے وہ گرتے گرتے پکی تھی۔ شہریار کا ہاتھ  
پکڑ کر بمشکل روکا۔

”تم ابھی گھر جا رہی ہو..... بلکہ میں بھی۔  
تمہیں اپنی امی کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ میری طرف  
کوئی مسئلہ نہیں، وہ ہاں کروں میں برداشت نہیں  
کروں گا سمجھیں؟“

”شہریار کو..... دیٹ..... ایسا نہیں ہے۔“  
مذاق پھندا بن گیا تھا۔ گھبراہٹی آواز کے ساتھ  
اس کے چہرے پر سکون رخصت ہوتا نظر آتا تھا۔  
”کیسا نہیں ہے.....؟“ وہ رک گیا۔ اس نے  
شکر کیا۔ انکی ہوئی سانس بے اختیار بحال ہوئی تھی۔

”میرے اللہ..... کیسے جلد باز ہو تم۔ میں نے  
مذاق کیا تھا۔ تم کیسے اتنی جلدی اور وہ بھی شدید رہی  
ایکٹ کرنے لگتے ہو۔ ایسا کوئی نہیں کرتا ہوگا۔“ وہ  
اپنی کلائی ملتے ہوئے خشکی سے کہہ رہی تھی۔ مقابل  
کی آنکھوں میں اس سے بڑھ کر ناراضی درآئی۔

”واٹ..... کیا تم پاگل ہو؟ مجھے بتاؤ تمہارے پاس  
ایسے بھونڈے قسم کے مذاق ہی کیوں ہوتے ہیں؟ اور  
ہاں میں ایسا ہی ہوں تمہارے معاملے میں جنونی، کچھ  
الٹا سیدھا کن کر تصدیق کرانے نہیں بیٹھ سکتا۔“  
”اچھا..... اور اگر تمہیں پتا چلے میری شادی  
ہوگئی ہے..... مان لو مگے.....؟“

”ہاں..... مان لوں گا۔“ اس نے آسانی سے  
اعتراف کر لیا۔ غیر متوقع جواب نے زریں کو بھونچکا  
کر دیا تھا۔ وہ بول نہ سکی۔

”یہ تو اچھی بات نہ ہوئی۔“ اس کا لہجہ شکوہ  
کنٹاں ہوا۔ شہریار کے چہرے پر ہلکی شرمندگی کے  
آثار نمودار ہوئے۔

”یار ایسی بھی بات نہیں..... میں واقعی کچھ جلد  
باز اور شروع سے ہی جذباتی قسم کا ہوں..... الٹا  
سیدھا مجھ سے سنا ہی نہیں جاتا۔ اور سن بھی لوں تو وہ  
غصہ، اشتعال میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین  
لیتا ہے۔ تم مجھے عجیب ترین کہہ سکتی ہوں۔ مگر میں  
اپنی اس خالی پر قابو پاؤں گا۔ تم ہونا..... سب  
ممکن ہے۔“ اس کی آرزوگی محسوس کر کے شہریار نے  
محبت پاش لہجے میں بھرپور یقین دلایا تھا۔ زریں  
کمال جھینپ گئی، وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چلتے  
لگے تھے۔

”روٹی آپا کی شادی طے پاگئی۔ ماموں  
ہمارے ایگزیم تک اس شادی کو ملتوی کرنے کا ارادہ  
رکھتے تھے مگر ان کے سسرال والوں کا اصرار بڑھ  
رہا ہے۔ تو ان کی رخصتی کے بعد میں امی سے بات  
کر لوں گی۔“ کینٹین کی جانب بڑھتے ہوئے زریں  
نے دھیمے نیچے میں اسے اپنے ارادے سے آگاہ  
کیا۔ روٹی اس کے بڑے ماموں کی بیٹی اور غیور

ان کی بہن تھی۔ شہریار سے غائبانہ تعارف تھا۔  
”..... نے مجھے ہوئے سر ہلا دیا۔“

☆☆☆  
سورج ایک شعلہ تھا۔ جس کے زیر سایہ سنہری  
انگوروں قطرہ پکھل رہا تھا۔

دھوپ کی حدت سے بو جھل ہوئیں۔ صحرایہ  
نپ دریاں کی مانند۔ ملمان کی تنگی سڑکوں پر سر پہنچی  
ہوئی تھیں۔ فُرد پہر میں ڈھلی، سورج سوانیزے  
پاؤں۔ گرمیوں کے موسم میں ملمان کے باسیوں پر  
لڑی لڑتی بھی بہت تھی۔

واش روم کا دروازہ کھول کر ”لقمان حیدر“  
لمرے میں واپس آیا تو دھوپ کی تمازت سے  
نہ ہمائے چہرے پر تازگی لوٹ رہی تھی۔ یہ اس کا بیڈ  
روم تھا اور اس نے جنت کا گوشہ معلوم ہو رہا تھا۔  
اس کی بدولت پھیلی خشکی مخصوص مہک نے ماحول  
لو پر فوس بنا ڈالا تھا۔ ایسے خواب ناک ماحول کو  
اپہنچے ہوئے دماغ کی ساری کشافیت دھل جائے۔  
وہ بھی پرسکون ہو گیا تھا۔

سست انداز میں چلتے ہوئے وہ بال بنانے کے  
لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آیا۔ قد آدم آئینے  
میں اس کی پشت کا منظر عکس کی صورت نظر آ رہا  
تھا..... جس میں بے آواز سے انداز میں دروازہ  
کھلیا گیا۔ کمرے میں روشنی نے مزید پر پھیلائے۔  
پاکٹ میں کرن الیسا وہ تھی اور آئینے میں جھللاتے  
اپنے خوبرو بھائی کے عکس کو دیکھ رہی تھی۔

دراز قد، مضبوط کانٹھ، بے حد شفاف رنگت پر  
نہری آنکھیں، براؤن سی، شہدر رنگ، جیسے شہنشاہ  
لٹھا ذرا سا پانی، چمکتی پیشانی کمان ابرو اور ناک  
پانی۔ نوکیلی معلوم نہیں تھی..... ہونٹوں کے اوپر  
پانی کی سیاہ موجھیں گویا چار چاند لگائی تھیں۔ پچھلا  
”ٹ“ اوپر والے کے برعکس بھڑاسا تھا اور نیم گلابی سا  
”ٹا“ تھا۔ وہ شیو کرتا تھا مگر کرن کے نزدیک وہ ہلکی  
”ا“ میں زیادہ پیارا لگتا تھا اور اس کا بھیر اسٹائل  
انار تھا۔ چال میں شاہانہ پن تھا۔ وہ مغرور نہیں تھا۔

یہ اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ وہ کچھ شرم تھا۔ بہنوں کا  
چہیتا، راج دلار، اس کے انداز میں شوخی تھی۔ اور  
گہری آنکھوں میں گھبراہٹ اور دیکھنے والے  
کا دل کھینچ لیتا۔ دل موہ لیتا۔

باپ کی وفات کے بعد وہ ذمہ دار ہو گیا تھا۔  
انداز میں بنجیدگی کچھ انہایت گویا ایک اضافی خوبی  
تھی۔ سب ہی اس کی شخصیت کو دل سے سراہتے  
تھے۔ اللہ نے اس کی ظاہری خوب صورتی کے ساتھ  
دل بھی بہت خوب صورت بنایا تھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر  
چاہتی تھی حد سے بڑھ کر۔ اور بے تحاشا، آئینے میں  
نظر آتے اس کے سراپے کو ساکت دیکھ کر اس کی  
بھنویں کھڑی ہوئیں۔ کرن اس کے چونکنے پر  
مسکرائی۔ دل کھول کر مسکرائی پھر کمرے میں داخل  
ہو گئی۔

”فریش ہو گئے بھائی؟“  
”خیریت؟ کہیں جانا ہے؟“  
”کنیزہ آپا آئی ہیں نیچے۔“

اودھ..... یقیناً بتا رہی ہوں گی؟“ لقمان کا لہجہ  
استغماہ تھا۔ آنکھیں پھیلی تھیں۔ کرن مسکراتا چاہتی  
تھی تو نہیں تھی مگر۔

”جی.....“ اس کا ”جی“ بھرپور معنی خیزیت کا  
اظہار کر رہا تھا۔ لقمان نے گھورا وہ تھی چلی گئی۔ ایک  
سخت دن میں کام کے بعد وہ سن دماغ کے ساتھ جانا  
تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ بڑی بہن تھیں اور پر چلی آئیں  
تو کس نے روکنا تھا؟ دوسرا وہ جس کام کے لیے آئی  
تھیں۔ طے بغیر ہرگز نہیں جانے والی تھیں۔

حسب توقع سیڑھیاں اتر کر وہ ماں کے کمرے  
میں پہنچا۔ کنیزہ آپا نے سارا لحاظ بالائے طاری رکھ کر  
تصویریں نکال کر آگے پھینکنے والے انداز میں رکھی  
تھیں۔ لقمان انداز پر بری طرح شیشا باندھنا  
باندھے کڑے تیروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”کیا کروں.....؟“ وہ جان بوجھ کر انجان  
بنا۔ امی کے ساتھ بیٹھی کرن نے آرام وہ انداز میں  
پہلو بٹا لقمان خوب واقف تھا۔

”ایک منتخب کرو۔“ انہوں نے حکم دیا۔ لی  
چپ تھیں مگر وہ سب بہن بھائی آپا سے زیادہ ڈرتے  
تھے۔ لقمان غیر آرام دہ سا ہوا تھا۔  
”ہم..... مگر آپا“

”باس.....“ ان کے اٹھے ہاتھ سے وہ دب  
گیا۔ کرن کی کھٹکتی ہنسی کمرے کا سنجیدہ ماحول توڑ  
دیتی۔ اگر وہ کھٹکتی سے لب پوری قوت سے نہ دباتی۔  
دوسرے کو نے میں بیٹی نازک سے لڑکی کچھ گھبرائی لگ  
رہی تھی۔ چہرے پر ماسک لگا رکھا تھا اور کسی آنے  
سے درازیں پڑنے کا خدشہ تھا۔ سودا انگلیاں کانوں  
پر تھیں۔

”بہت ڈھیل دے دی ہے تمہیں لقمان حیدر،  
اب میں بھی کینز حیدر ہوں۔ یہ ساری تصویریں  
رشتے والی مشکلوں سے جمع کر کے لائی ہے اور کچھ  
لڑکیاں تو بہت ہی بھائی ہیں دل کو..... جلدی سے  
پسند کر لو میں زیادتی نہیں کرنا چاہتی۔“

وہ ہنوز بے نیازی کا خول چڑھائے کہہ رہی  
تھیں۔ لقمان عجیب مشکل میں چسنا تھا۔ ستم یہ تھا کہ  
ای بھی چپ تھیں۔

”آپا آپ کیوں ہلکان کر رہی ہیں خود کو.....  
پلیز یہ دکھا دکھا کر مجھے گناہ گار مت کریں۔ مجھے ایسے  
کوئی پسند نہیں آسکتا۔“ رونی صورت بنا کر وہ بے حد  
بے چارگی سے گویا ہوا تھا۔ اسی کچھ بے چین  
ہوئیں۔ کچھ آپا پر بھی اثر پڑا تھا۔ وہ بھانپ گیا۔ آپ  
خود کو بڑھال کر رہی ہیں اور.....“

”تمہیں معلوم ہے اپنے سسرال میں مجھے  
کیسے کیسے سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟“ وہ جتنی سے  
بادر کردار نے میں کامیاب ہوئیں۔ کہ وہ لفٹ نہیں  
دینا چاہیں گی۔ لقمان کو ان کی آخری بات کو فٹ میں  
بتلا کر گئی۔

”آپا آپ کے سسرال والوں کے ساتھ کیا  
مسئلہ ہے؟ انہیں میرے انتہائی ذالی معاملے میں  
داخل نہیں دینا چاہیے۔“

”تو میرے بھائی مان کیوں نہیں جاتے.....“

ہم یہ ترس نہیں آتا تھیں، اگلوتے بھائی کے  
بہنوں کے دل کتنے ارمانوں سے بھرے  
ہیں۔ خدا کرے تم کچھ پاؤ..... درندہ مجھے اور کیا  
ہے؟“ آپا نے تصاویر پر اس میں ڈال کر آزدی  
کہا۔ لمحہ میں وہ ابدیدہ ہوئی تھیں۔ لقمان بری  
شیشایا۔

”اوہ ہو پلیز میری اچھی آپا..... ایسے  
کریں۔ اچھا چلیں اگر آپ کو میری آزادی اتنی  
کھلتی ہے تو پورے کر لیں اپنے ارمان..... اسی  
آپ جو کبھی پسند کریں گی مجھے منظور ہوگا۔ بس  
کے انٹرویو کے جوابات بالترتیب مجھے تک پہنچ جا  
چاہئیں۔ وہ ذہانت کتنی رکھتی ہے..... اسے ٹائٹل  
پسند ہے یا عقیل احمد رونی..... کھیلوں میں کس حد  
دو چپی رکھتی ہے۔ کرکٹ میں قومی ٹیم نے بھارت  
کتنے رنز سے شکست دی اور کتنی وکٹوں سے باہر  
..... ریزر راج کی خدمات؟ عمر اکمل نے انٹرنیشنل  
میں کتنی وکٹیں حاصل کیں۔ اسے ہیری پورٹر و  
لگی ہے یا ٹائٹلنگ پسند ہے..... سائیکل جیکسن یا  
”شام آفریدی نے شادی کب کی.....“

کب ہوئے..... انگلینڈ کا دورہ کب کب کر  
ہیں..... سردیوں سے لگاؤ کیا گور کرتی دھوپ گرم  
کا مزا دیتی ہے..... کتا پیچھے لگ جائے تو  
چاہیں گی یا بھاگنے کو ترجیح دیں گی..... خطرہ دیکھ  
سامنا کرنے کی یاد آگ آگ کر جائیں گی۔

”ہا ہا ہا.....“ ان کی طنزیہ باتوں پر لقمان  
ہنسی سے پورا کمرہ گونگ اٹھا تھا۔ ماسک سے  
چہرے والی آنکھوں پر رکھے کھیرے کے گول  
لرزتے ہوئے آنکھوں سے پھسل گئے۔ کینز آپا  
حد ناراضی سے اسی کو دیکھ رہی تھیں۔

”رہنے دو کینز، کوئی فائدہ نہیں.....“ اسی  
تھیں کہ یہ سب آپا کو جرح کرنے کے لیے تھا۔  
واک آؤٹ کر گئیں۔

”کھانا لگوا دیں۔“ لقمان نے پیچھے  
ان کے تعاقب میں دوڑائی۔ اسی نے اسے خا

”بھرتائیں نکالا تم نے..... کل روانہ ہونا ہے۔“  
بات پر کبھی وہ ناک چڑھا گیا۔  
”آپ نے لازمی لاہور پہنچ کر ہی دم لینا ہے  
.....“

”ظاہر ہے..... رشتے داری چھوڑی تو نہیں  
ہوتی ناں۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائیں۔ کئی دنوں کی  
شادی بھی یہ نیم رضامندی۔  
”شادی میں کتنا دن رہنا ہے؟“ یعنی وہ مان  
دیتا تھا۔

”جتنے دن تمہاری دادی چاہیں.....“ انہوں  
نے اندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا اس نے منہ  
ایا۔

”چلو اگر نہیں شرکت کر سکتے ہو تو..... میں  
بارہ نہیں کہوں گی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔  
”نہیں آپ کا حکم ہے۔ جانا تو پڑے گا۔“

”اسی نے سن کر بے اختیار سکون کا سانس لیا۔  
ہر سورج اب بھی ایک شعلہ تھا۔

☆☆☆

آسوی بیلوں سے ڈھکے اس گیٹ والے گھر  
نے بارزندی بھر پور انداز میں متحرک تھی۔ نیلے رنگوں  
س ڈوبایہ پرانی طرز کا خوب صورت گھر اپنی  
پیشانی پر ”محبت کدہ“ لکھوائے اپنے مکینوں کی محبت  
لیتے کا صاف پتا دیتا تھا۔ پہلی نظر ڈالنے پر اس  
”نچے سے مکان کو تین پورشنز میں شمار کرنے کو دل  
پاٹتا ہے..... اور بظاہر نظر آتے یہ تین پورشنز آپس  
میں اس قدر جڑے تھے کہ کوئی حصہ الگ نظر آتا تھا  
ان الگ ہو کر اچھا دکھ سکتا تھا۔ تینوں حصے ایک  
”سرے کے لیے لازم دلمزد ستون کی مانند تھے۔  
ان کی ساخت اس پرندے کی مانند تھی جو اڑتے  
وئے دونوں پر پھیلا دے۔ اور یوں ساکت  
ہوتے۔

”ہائے.....“

دکان جو بے جان اینٹوں سے بنتا ہے۔ اس  
ایکین ہی ان اینٹوں میں جان ڈال کر اسے گھر

بناتے ہیں۔ اس گھر کی جوانی کے پیچھے بھی یہی وجہ  
رہی ہوگی جو وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزار کر  
بھی عمر سیدہ نہیں لگتا تھا۔ اس علاقے کے تمام گھروں  
کی نسبت یہ گھر ہر ایک سے بڑھ کر اپنی شان میں  
اونچا لگتا تھا۔

یہ سورج کے شعلہ اہونے کا وقت تھا۔ اور پوری  
کائنات پر آڑی ترچھی، ایک دوسرے سے گلے ملتی  
شعاعیں۔ اسے سنبھالنے جارہی تھیں۔ ممکن تھا کچھ  
سے پور شام کی آمد کے آثار نمایاں ہوں..... مگر فی  
الحال شام کو راج دہانی پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں ملا تھا۔  
قبضہ جو بے حد مختصر..... لیکن دن کے لیے شکست کا  
باعث تھا۔

اندر شادی کی تیاریاں آخری مراحل میں  
تھیں..... اس لیے زور دشور سے جاری تھیں۔  
چاروں اور لائٹنگ لگانے کا کام مکمل ہوا جاتا تھا  
عمارت کے ماتھے پر دل کی غیب میں ”دیکھ“ لکھا  
یقیناً روشنیوں میں اضافے کا سبب بننے میں اہم  
کردار ادا کرنے والا تھا۔ اندر سے بھانت بھانت  
آدا زیں آ رہی تھیں۔ بکھرا پھیلاوا آسانی سے سنلتا  
دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گیٹ سے باہر کھانے کے  
معاملات سمان ماموں طے کرتے نظر آ رہے تھے۔  
اندر سعدیہ دونوں بھابیوں کے ساتھ مشغول تھیں۔  
”لیں آپا..... زریں کا ڈریس بھی آگیا۔ اسے  
چیک کر والیں بعد میں کہیں مسئلہ نہ کرے۔“ صوفے  
چاروں سامان سے اٹے ہوئے تھے..... میز پر  
چوہری باکس کھلے تھے۔ وہ ابھی مارکیٹ سے لوٹی  
تھیں اور بڑی بھابھی نے ایک ڈبا ان کی سمت  
بڑھا دیا۔

”ماشاء اللہ۔“ سعدیہ کے صبیح چہرے پر نرم  
مسکان پھیل گئی۔ کل رات کے فنکشن پر پہننے والے  
ڈریس پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے بے  
ساختہ تعریف کی۔ بڑی بھابھی، بیگم بنا کوئی جواب  
دیے لٹ پر کچھ کھوجتی رہیں۔ یہ اس گھر کی پہلی  
شادی تھی اور وہ خاصی حواس باختہ تھیں۔ ایک کام ختم

”بھئی کوئی پانی ہی پوچھ لے۔ یہ لڑکیاں لگی ہوں گی فضول کاموں میں۔ خود اٹھنا پڑ گیا۔“ عافیہ جو سعدیہ کی چھوٹی بھابی کے درجے پر فائز تھیں۔ کوئی بھرے انداز میں کہہ کر انھیں۔ سامنے سے اماں (ساس) آ رہی تھیں۔

”ہاں بھئی خواتین..... رفیعہ کی طرف پیغام بھجو دیا تھا ناں..... کیا جواب آیا۔“ کئی بار پوچھا گیا سوال ایک مرتبہ پھر دہرایا گیا۔ عافیہ نے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا۔ انہیں اپنی بہن کی آمد کی بڑی فکر تھی۔

”اماں بی کہہ بھی دیا تھا۔ اور وہ کل ابھی رہی ہیں..... اب اڑ کر آئیں کیا۔“ عافیہ نے ساس کو مطمئن کیا۔

”بھئی یہ اچھا کیا تم نے..... اب ملنا ملنا تو محدود ہو کر رہ گیا ہے..... خوشی میں تو بندہ شریک ہو۔ میں ذرا لڑکیوں کو دیکھ لوں، کچھ تیاری کر لوں۔“ وہ منہ ہی منہ میں ہنسی واپس مڑ گئی تھیں۔ تینوں کے لبوں پر ہنسی اٹھ گئی۔ وہ کس تیاری کی طرف اشارہ کر رہی تھیں..... انہیں سب معلوم تھا۔

لڑکیوں کے کمرے الگ ابتری کا شکار تھے۔ یوں جیسے مینا بازار میں بڑے زور کی آندھی آئی ہو..... بڑے ماموں سمنان احمد کے..... غیور سمنان، پردشا نے اور علیزے، بیچے تھے۔ ان کے بعد سعدیہ تھیں جن کو قدرت نے صرف ایک ہی بیٹی سے نوازہ تھا اور شوہر کی وفات کے بعد سے وہ بھائیوں کے ہاں مقیم تھی..... ان کی بیٹی زریں کمال تھی اور سب سے چھوٹے ارسلان احمد اور آئینہ اور قیوم ان کی اولاد دیں تھیں۔

ابھی سے کیوں محنت کر رہی ہو..... ساری کوشش ضائع جانی ہے..... علیزے نے شوہر میں ڈال ڈال کر چپک کرتے ہوئے چھیڑا تھا آئینہ کے اطمینان میں ذرا جو فرق آیا ہو۔

”کل کی کل دیکھا۔ میں ایک مقصد..... محنت کر رہی ہوں۔“ اس کے سکون پر دادی ماں کان کھڑے ہو گئے۔

”تمہارا کیا مقصد ہے آئینہ بیٹی.....“ ماں کے استفسار پر سب ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”چھوڑیں ناں..... اس نے پہلے ہی مندی کا ثبوت دیا۔“ زریں نے لا پر دادی سے جواب دیا۔ آئینہ تپ کر مڑی۔

”چلو سب کی سب..... وہ کیا ہے ناں کہ دادی، فیشل کے بعد چہرے پر سرخی سی آ جاتی۔ میں اس لیے ابھی سے کر رہی ہوں کہ کل تک رو بھی آجائے اور سرخی بھی جاتی رہے۔“

”نہ..... کیا بے ادب.....! خفت چھپانے.....! کیا تھا۔ اس سے پہلے کوئی گفتگو آگے.....! قیوم نے آکر ارادہ نا کام بنا دیا۔“

”زری آپ..... آپ کا موبائل بیچ کر فوٹ..... والا ہے۔ مرنے سے پہلے آخری خواہش.....! لیں کسی شہر یا صاحب کا فون ہے۔“ قیوم کے چار انداز پر زریں کے چہرے کا رنگ فق..... اور کاسٹلر ادھر، نیچے کا نیچہ رہ گیا تھا۔

”بار..... کے نام کے ساتھ ہی ایک دم کمرے میں.....! خاموشی، زریں کو دل شکن محسوس ہوئی۔ وہ چاہ.....! آگے نہ بڑھ پائی تھی۔

”نے..... نیا ہے نامری ایک دوست اس کی.....! سے فون ہوگا۔ ایڈریس سمجھنا تھا اسے.....! ارے کی چوکت پار کرتے غیور نے خاموش.....! دادی سے زریں کا جواب سنا۔ زریں نے اس.....! پر دل ہی دل میں خود کو شرمندہ ہوتے پایا۔ مگر.....! لوانا غصہ ویش لینے سے پہلے وہ یہ بات کسی پر آشکار.....! ہونے دینا چاہتی تھی۔ ماسوائے ایک کے جو.....! ناں نہیں تھا۔ غیور سمنان کے.....!

☆ ☆ ☆

پر کھول کر ساکت ہوئے پرندے کی ساخت.....! گھر بچہ نور بنا ہوا تھا.....! آئیوں بیلوں سے لپٹی منھی منھی لائیں، روشن.....! اور اس قدر روشن تھیں کہ سبز پتے سرخ ہو کر.....! ہوئے نظر آئے تھے.....! چاروں اور لکھتیں.....! کی لڑیاں رنگ برنگی نور برسا رہی تھیں.....! کے جلانے گئے اتار سناں سا باندھتے تھے۔ بے.....! شنیوں کے حصار میں گھر اشادی والا گھر رات.....! پہلے پہر بہت حسین دکھاتا تھا۔

آمدید کرتے ہوئے ”مجھ سے“ پیش کر رہی تھیں۔ آئینہ، نیا اور پردشا نے (دہن) کی باقی دوستیں اس کی کے روم میں جمع تھیں۔ زریں کی تیاریاں مکمل تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

سمنان ماموں نے اپنی بساط سے بڑھ کر شادی کا اہتمام کر دیا تھا۔ دیکھنے والوں کو آنکھوں میں سٹائش اترتی تھی۔ ملتان سے آئے دلالے مہمان کچھ سے قبل پہنچے تھے۔ دادی اماں ان ہی کے پاس ہو گئی تھیں۔

”بڑی جلدی آئی ہو رفیقہ.....! اپنی ہو کر بے گانوں جیسا برتاؤ۔“ وہ مصنوعی خشکی سے شکوہ کرتے ہوئے بولیں۔ سعدیہ کے ساتھ ساتھ لقمان حیدر کے لبوں پر بھی مسکراہٹ اٹھائی۔

آپا کا رپر آئی ہوں۔ ہوا پر سوار ہو کر نہیں۔ دوسرا لقمان کو بھی کہاں اتنی فرصت ہوتی ہے.....! چھوٹی دادی نے ہنسی دبا کر اپنا سب سے جواب دیا۔ جواباً ذکیہ دادی یوں منہ بنا گئیں گویا بد مزہا ہوئی ہوں۔

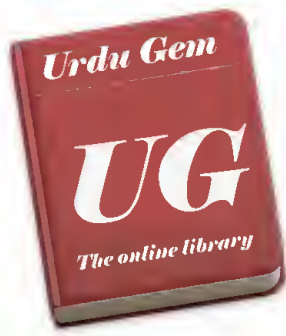
”آپا آپا بہت کرتی ہو، کوئی اتنی بھی بڑی نہیں ہوں تم سے.....!“

”حد کرتی ہیں آپ.....!“ چھوٹی دادی جھینپ گئیں۔ یہ تھا کہ وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹی لگتی تھیں..... اور بڑھاپا ان کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ لیکن ذکیہ بانو جو کچھ سال بڑی تھیں۔ ہمیشہ خود کو چھوٹا ثابت کرنے پر تکی رہتی تھیں۔ ان کی اس عادت سے سب ہی واقف تھے۔ اور ایک سچائی یہ بھی تھی کہ ایسا وہ صرف چھوٹی بہن کی محبت اور لاڈ میں کرتی تھیں۔

”حد تو تم کرتی ہو، سوسال کی نہیں ہوئی میں۔“ بڑی آئی تم ریمیاں کی ہم جوتی.....“

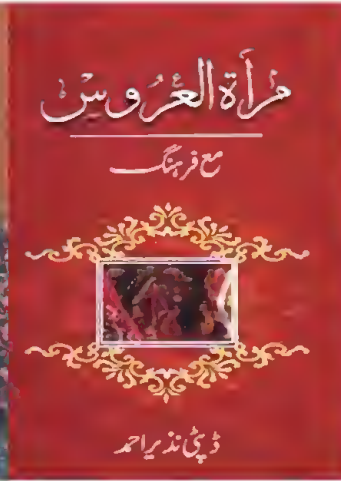
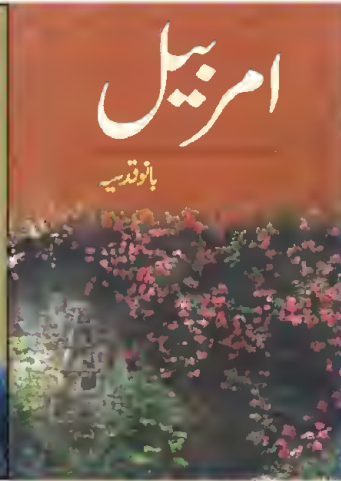
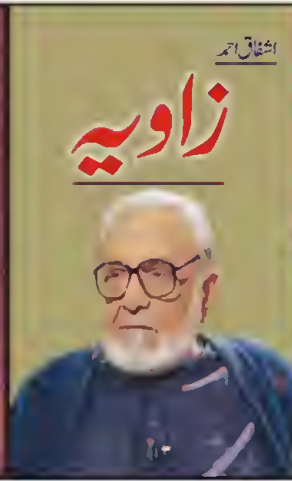
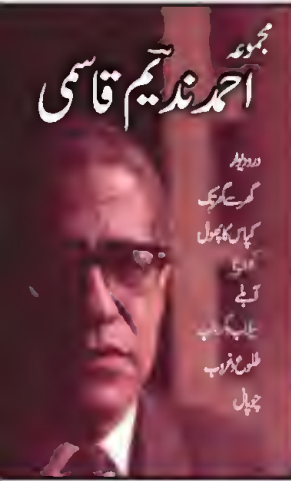
”آپا کیا فرق پڑتا ہے، ذرا سادل بڑا کر لیں تو.....“

”آئے ہائے دل بڑا ہوتا تو بیماری کی علامت ہے۔“ تمہاری نظر میری صحت پر رہے۔“



# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA





”نہیں نہیں..... محاورہ کہہ رہی ہوں۔“ بڑی داوی کی بے نیکی پر ہلکا کروضاخت دی گئی تھی۔ کئی لبوں پر دہائی دہائی چل گئی۔ یہ نوک جھوک بڑی دیر تک جاتی تھی۔

ان سے ہٹ کر دوسرے پورشن پر، جہاں نیچے کا شور آسانی سے پہنچ رہا تھا۔ زریں فون کان سے لگائے خاصی خوش نظر آتی تھی۔ اس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور اس ٹیک میں وہ پہلی نظر ڈالنے پر ہی بے حد اچھی لگ رہی تھی۔

”تم یہ زیادتی کر رہی ہو زری، اگر چاہو تو بن بلائے مہبان کی طرح شرکت کرنے میں مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوگی۔“

”بس کرو شیریں.....“ وہ ہنسی روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ ”میرے پاس تمہاری شوخیوں کے لیے وقت نہیں، اور وہ وقت بھی دور نہیں جب تم اس ٹیک کی کا حصہ ہو گے۔“ بھئی ابھی اور شادیاں بھی تو آئیں گی۔ کچھ صبر پیدا کر طبیعت میں۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں، وہ آدھ بھر کر بولا۔“ بھاگ لودور..... زریں کمال..... تمہارے راستے تو مجھ تک آتے ہیں.....“ وہ جیسے مگلتا کر بولا تھا۔ زریں ہنس کر مٹی۔ اتنے نیم اندھیرے میں بھی اس کے چہرے کی سرخی و نظروں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

”شٹ اپ..... میں فون بند کر رہی ہوں۔ پھر بات ہوگی۔“ غیور کو آتا دیکھ کر اس نے دوپٹا ٹھیک کیا اور سنبھل کر کھڑی ہو گئی.....!“

”زریں! نیا پوچھ رہی ہے یار..... نیچے جاؤ، بارات آچکی ہے۔“ سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ یقیناً اسے دھوڑتا ہوا آیا تھا۔ اس نے تیزی سے سر ہلایا تھا۔

”فون تھا..... چلو چلیں۔“

”شہر یار کا!“ اس نے پوچھا۔

”آف کورس.....“ وہ چلتے ہوئے اتنا کہہ پائی۔

”زریں گھر والے نہ مانے تو؟“ وہ جا کیا سوچ کر رک گیا۔ زریں بھی ہنسی..... رکی ”میں منالوں گی۔“ سرگوشی کی اس نے ”تمہیں اپنی محبت سے ڈر نہیں لگتا۔ اگر تمہارا راہیں کوئی اور موڑ لے سکتی؟“

”میری محبت طاقت دیتی ہے۔ اور میرے راہوں میں کوئی موڑ نہیں غیور.....! میری خوش ہے کہ محبت میرا امتحان لیتی نظر نہیں آتی۔“ سکون سے کہہ کر وہ سڑھیاں اترنے لگی۔ خوشبو کے جھوٹے دور جانے لگے۔ غیور نے لاپرواہی سے شاہ اچکائے اور قدموں کو حرکت دی۔ سارے پورشن آوازیں گونجتی رہ گئیں۔

بسا اوقات انسان پورے دھوکے سے کتنا بول جاتا ہے۔ یوں جیسے تقدیر کو آنکھوں سے پڑھ رہا ہو۔ اتنی خوش بھی رکھنے کے بجائے اگر ہم آدھے وقت میں خود کو بحرالات کے لیے پہلے تیار رکھیں تو شاید کبھی اتنی اذیتیں سہی نہ پڑیں.....! خیر..... رنگینوں سے بوجھل رات پر شور سوار تھا۔ کی جلی خوشبوؤں سے مہکتی فضا میں رات رانی کی خوشبو بزم ہو رہی تھی.....!!

دہن کو آتیج رہی جا رہا تھا۔ نانا لبا کوئی شہر کی بات کر رہی تھی، تمام لڑکیاں کھل کر ہنس رہی تھیں۔ غیور سہن کیمرہ سنبھالے فوٹو بنارہا تھا۔ ویڈیو میکر اپنے کام میں مشغول تھا وہ چھوٹے ماسٹر اور عروہ کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑا ان کے شکوے شکایات کو ہنس کر ٹال رہا تھا۔ تب ہی.....

کچھ لمحے خاص ہوتے ہیں۔ جن کے دا میں ڈھیر دس مرتبیں ہلکورے لے رہی ہوتی ہیں۔ کبھی یہ لمحے انسان تلاش کرتے ہیں۔ کبھی یہ انسانوں کو کھوج لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی لمحے تھے..... انسانوں کو کھوجنے والی قسم سے تعلق رکھنے والے۔ جب ہی تو ایک بالکل سرسری سی نظر غیر ارادی طور اوپر لڑکی۔ تو لاشعوری طور پر اسی ہی رہی۔ جیسے ہو جامد ہو کر! سن ہوئی ہو..... ایک نقطے پر جا

یا نہ لگتی ہو۔ پر سمیٹنے پر وقت لیتی ہو.....! مود اور گرین کا کبھی نیشن کے شرارہ سوٹ میں دو لڑکی اجنبی روپ میں لگ رہی تھی۔ نفاست سے بے سہری میک اپ سے چہرہ سجا تھا۔ یوں جیسے نہت کر دیا گیا ہو۔ سیٹے کے کئی چہرے کے گرد لہجیں اور سیاہ کھلے بال پشت پر ابتشار کی مانند پڑے تھے۔ آئی لائزر سے گہری کی ہوئی آنکھیں، نالوں میں پڑے سچی کلیوں کے جیسے سفید ٹاپس، اپ اسٹک سے تراشیدہ ہونٹ اور سوٹ کا ہم رنگ اپنا شانے پر بچھلائے وہ کمال لگ رہی تھی۔ لیکن زریں کمال نہیں لگ رہی تھی۔

اسے پہلی بار اس قدر سجاد کیا گیا تھا۔ اور اس لیے..... جب وہ اپنی ڈریسنگ کو لے کر منہ بسور رہی تھی۔ پینٹ شدہ ٹاک سکرگئی تھی.....!

”اتنا بھاری سوٹ..... یا زریں! ہاں کا بس پلے تو شادی سے پہلے ہی مجھے دہن بنا دیں۔ آج اس چل ہی گیا۔“ وہ جھجھکی لگ رہی تھی۔ نیا اس کے انداز پر ہنس کر بولی۔

”قیامت لگ رہی ہو۔“ پھر گھورنے کی پروانہ کرتے ہوئے قل قلی ہنسی لگی۔

لقمان حیدر کی سپاٹ نگاہوں میں جانے کیسے اشتیاق ابھرا..... وہ ناچا بچے ہوئے بھی لمحوں کے ایب میں الجھا..... بے بس ہوا تھا۔

تقدیر کے کھیلوں کو کون سمجھے..... لیکن دل یونہی اپنا تک جڑتے ہیں..... ایک نکلے میں۔ بغیر کسی پروا..... ہمیشہ دشوار راہوں پر.....! اسے بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا۔ دھندلی آنکھوں کے پار کا نظر..... زریں اسے ہاتھ کے اشارے سے بلادی تھی۔ اپنے پاس شاید آج پروہ حیران ہوا۔ اور اپنی حیرانی پر خوش..... بہت وقت گزرا تو دل کے احساسات پر بے تحاشا خوش۔

آج پروہ بڑی ہونے کے سبب نام نہ نہ سنے پر مارت کر رہی تھی۔ اور وہاں آنے پر خوشی کا اظہار، ان خوشی جو قریبی رشتے دار کے آنے پر ہوتی ہے۔

باتوں کے درمیان شور کے باعث وہ ہلکا سا جھک کر ہنستے ہوئے کچھ بتاتی تھی۔ اور لقمان کی آنکھوں میں کیسی خوش گواریت تھی۔ دونوں کی کرسیاں ساتھ تھیں ایسے میں کئی مسکراتے پوزیشن لائٹ کی زد میں آئے تھے۔ لقمان جولا ہوا آنے پر کشش کا شکار تھا۔ بے خبر تھا کہ تلاش یہاں آخر ختم ہوتی تھی۔ اچانک ہی دل کو اچھا لگنے والا معاملہ..... اور لمحوں نے لقمان حیدر کو کھوج لیا تھا.....!

وہ جو زریں کمال تھی..... اب واقعی کمال تھی۔ روشنائی کی رخصتی کے ساتھ..... اس نے زریں کا ہاتھ تمام کر پھولوں پر چلنے کے کئی مناظر دیکھ لیے تھے۔ زریں جو انجان تھی، لقمان کے جذبول سے، ارادوں سے..... تقدیر سے..... اپنی قسمت سے۔

☆☆☆

کھنکٹی ہنسی، شریر لہجہ، پانی کے جیسی شفاف مسکراہٹ، انداز میں سادگی، اور باتوں سے جھلکتی اپنائیت وہ بے ضرر ہی لڑکی اگر اس کی پسند تھی تو واقعی اس کی پسند ایسی ہوتی چاہیے تھی۔ اس کی یعنی لقمان جیسے بندے کی۔

کوئی پسند آ جانا اگر اتنی بڑی کوئی چیز نہیں تو اس گھر میں خوشی کے ٹکے کاٹنے کی بڑی وجہ یہی تھی۔

ایک چیز ہوتی ہے جو پہلے پہل مسکان کو لبوں سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ ہنسی میں طمانیت نظر آتی ہے۔ وہ چیز ”محبت“ ہے!

کنیرہ آپا کا زور نہیں چل سکا ورنہ فون میں کھس کر اس کی پیشانی پر بوسہ لیتیں۔ داوی خود بہت پرسکون نظر آتی تھیں۔

”اللہ کے بتائے خوب صورت جوڑ..... پہلے بتا دیتے لقمان.....! اپنی بچی سے وہ تو.....“ داوی کہیں تو وہ مسکرا دیتا۔ کسی کو کیا خبر..... کون کب منظور نظر ٹھہرے.....! وہ بتانہ پاتا۔

”میں آپ کو لڑکی پسند آ جانا کی خوشی میں،“ نوافل ادا کر رہی تھی۔ ”اریشہ آتے جاتے چھیڑتی۔“

وجہ گواہ لے کر ہر ایک مادے کی طرح آپ کو لواندھا

4 **پابندہ کرن**

”وَعَلَّمَ الْبَلَامَ مَنْ هُوَ زَرِينٌ! بندہ حال چار

ستمبر 2018

ہمیں کون

لہہ چلی نیا..... ستھریار کا کسی سے رابطہ نہیں

ستمبر 2018

ہے یا پھر کوئی بتانا نہیں چاہتا۔ وہ اتنا لاپرواہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین دن اپنا موبائل بند رکھے اور اپنی خیریت کی اطلاع نہ دے۔ میں کیا کروں نیا؟“

بھیلی آواز میں جواب دیتے ہوئے ہچکیوں سے روئے گی تھی۔ آج سے قبل ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ اور یہ کس قدر مشکل تھا۔ دروہلکہ اذیت ناک.....

”پلیز خاموش ہو جاؤ زریں! مجھے تو فکر لاحق ہونے لگی ہے کہیں کوئی حادثہ۔“

”ایسا مت کہو۔“ اس نے ٹرپ کر نیا کو روکا تھا۔ صرف اس نقطے کو وہ ذہن میں بھی نہیں لانا چاہتی تھی۔ دل شدت سے چاہا تھا کہ بادل اس زونو بریس اور اس کی آنکھیں، یہ بارش اسے خود پر قائم کناں محسوس ہوئی.....!

”بی بریو یارا!“ نیا اپنا سیت سے اسے تسلیاں دیتی رہی۔ یہ تسلیاں بھی اس کی ضرورت تھیں۔ دلا سے، ڈوہتا دل ابھارتے تھے۔ نیا سے بات کرنے سے لے کر اب تک کھوئی کھوئی کیفیت سے پیچھا چھڑاتے ہوئے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ شہریار کے گھر جائے گی۔ ہاں اس کے سوائے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک بار تو معلوم کرے، کیا خبر وفاقی کچہ! نہیں ہوگا تو وہ ٹھیک ہی، شاید شرارت شرارت میں اس کا ضبط آزادا رہا ہے۔ وہ اپنی محبت..... یس یہ ممکن ہے.....!! عین ممکن ہے۔

یہ ہی سوچتے ہوئے وہ ابھی خشخاش صاف بھی نہیں کر پائی تھی کہ سعدیہ اس کے مقابل آکر بیٹھ گئیں۔ بادل پھر سے سجھ ہوئے لگے تھے راج ہنسوں کے جیسے..... اور ہوا میں نمی تھی۔

”یہ زریں.....“ نظریں جھکائے جھکائے وہ دہاں سے اٹھنے لگی کہ ماں کی آواز پر رک گئی۔ دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہ چور بن گئی۔

”کچھ دنوں سے میں کچھ بتانا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی خیر..... اب وہی بات مجھے کہہ ڈینی چاہیے کہ ہر کام کی طرح اس کام کا بھی بہتر وقت اور موقع آ گیا ہے۔ ہمیں یقیناً اعتراض نہیں ہوگا میں امید کر رہی

ہوں۔“ اپنے مخصوص نرم لب دلچے میں زریں آگاہ کرتی وہ چنداے خاموش ہوئی تھیں۔ زریں اس تجہید نے اچھن کا شکار کر دیا۔ وہ جھکے سر ساتھ سے گئی.....!

”لقمان کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا گیا ہے۔“ لقمان نے اطمینان سے بتایا تو اس کا سر جھٹکے سے اٹھا۔ یہ کس کا نام لیا گیا تھا وہ فوری طور پر فیصلہ نہ پائی اور۔

”لقمان حیدر.....“ دوسرے پل وہ بری طرز شا کڈ رہ گئی تھی۔

وہ حواس باختہ ہوئی..... منجھ..... سہکت..... یا بے یقینی کی انہما کو چھو کر لنگ ہوئی تھی۔ ماذن ہوتے ذہن کے ساتھ باشکل وہ منتشر حواسوں قابو کرتے ہوئے وہ ماں کو دیکھنے میں کامیا ہوئی۔ ایک دھچکا..... دوسرا دھچکا..... پھولوں چٹاں ہوا میں گھرنے لگی تھیں۔

سعدیہ جو دکھ رہی تھیں۔ بیٹی کو غور سے ہوتی آنکھیں..... شل چہرہ..... اڑی رنگت..... جان پڑنا وجود..... سعدیہ سوچ نہیں سکتی تھیں جو ایسی فرماں بردار بیٹی اور دھچکا سہرے سنبھلنے پر.....

”ای نہیں.....“ ایک دم اٹھنے پر ہاتھ میز لگا اور خشخاش کی ٹرے انٹ گئی۔ اس قدر شدت بولے گئے ان دو لفظوں نے اب کی بار سعدیہ ششدر کر دیا تھا..... وہ لفظ کیسے تھے.....؟ یہ وہ لفظ..... جو قطعی تھی..... کسی بھی چٹک عاری تھے۔

☆☆☆

گزشتہ بارش سے موسم کی رت ہی گئی تھی سفید شکل کے بادل آج سے قبل بھی اتنے مہربان ہوئے ہوں گے۔ چھ دنوں سے متواتر پھوار پڑ رہی اور خوش گوار ہوا میں بدلتے موسم کی نوید تھی ایسے میں مارننگ گھوڑی کے تیل پر شکر پی پھولوں بیجیات اتری آئی تھی۔ جو آنکھوں کو تراوٹ تھی۔

لقمان حیدر کے گھر کا سرسبز لان گھر انکھرا سا صورت تاثر دے رہا تھا۔ سفید رنگ کی بنا بازو لائی شرت اور گرے ٹراؤزر کے آرام وہ چلیے میں نئی یادیں لٹس گرین گھاس پرواک کر رہا تھا۔ فلک لائی کناروں پر شام کی لالی تھی پھیلی ہوئی تھی۔

”السلام علیکم..... زریں بول رہی ہوں۔“

”آپ کے مخاطب کو لقمان کہتے ہیں۔“

ہماری سی آواز کے جواب میں مسکرایا تھا۔ زریں کا آہٹھا لگتا تھا۔ آواز کا مزہ بھی!

”یقیناً..... میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ بے پروا تے ہوئی بولی۔ اس کی حد درجہ سنجیدگی لقمان کو چونکا دیا تھا۔

”بولو..... میں سن رہا ہوں.....“

”آپ جانتے ہوں گے۔ میرے لیے آپ کا پزل دیا گیا ہے۔“ وہ چاہ بھی نہیں سکی کہ آپ کے مائے تم کہہ سکے۔ ایسی بے لگنی کی نفا بھی قائم نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مارننگ گھوڑی تیل کی شاخ کو لہلا جھلانے لگا۔

”جانتا ہوں۔“

”آپ کا پزل ہر لحاظ سے میری فیملی کے لیے مناسب اور بہترین ہوگا، آپ یہ بھی جانتے ہیں گے۔ مگر میرے انکار کو کسی طور اہمیت نہیں دی جانے گی۔ یہ میرے لیے ناقابل یقین اور باعث فایف ہے۔ اس بات کا احساس کسی کو نہیں ہوگا۔“

وہ یقیناً آنسو اندر دھکیلتے ہوئے بہ وقت بول رہی تھی۔ دوسری سمت سناٹا سا چھا گیا تھا۔ ایک..... پچھکنی ٹاپے۔

”تم نے انکار کر دیا.....؟“ پھر ایک بے پروا آواز ابھری تو زریں لا جواب ہی ہو گئی تھی۔ ظلم نہیں تھا کہ لقمان سمیت اس کے گھر والوں کو بیٹھ رکھا گیا ہوگا۔ اس نے خود کو نہایت بے بس پایا۔

”اصولاً تو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ میرے گمان میں تھا کہ کوئی آج کے زمانے میں بغیر کسی کو

پرکھے، سمجھے کسی نے تعلق پر کیسے آمادہ ہو سکتا ہے۔ آپ تو پھر لڑکے ہیں۔ آپ کو انہیں اپنی مرضی سے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اب بھی پلیز، پلیز اپنے گھر والوں سے کہیں وہ یہ رشتہ واپس نہ لیں۔ میں ایک اجنبی زندگی نہیں جی سکتی۔“

آنسو پلکوں کی بازوڑتے، کالوں پر سلسلہ دار بہنا شروع ہو گئے تھے۔

حیران حیران سے لقمان نے اس کی یہ جذباتی گفتگو بڑی حیرانی سے ملاحظہ کی۔ زریں کی باتیں وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ یا مقصد نہیں جان رہا تھا۔

”ارے لیکن مجھے مجبور تو نہیں کیا گیا۔ میں نے خود شریک سفر کے لیے آپ کا انتخاب کیا زریں!“

آسمان پر دھیرے دھیرے اتری شام کی بے رنگ تاریکی، لقمان کی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ وہ زریں کی غلط فہمی دور کرنے کو بولا تھا۔

”آپ نے.....“ تحیر سے آنکھیں پھیلیں لفظ اپنی موت آپ مرے تھے۔ وہ مزید کچھ بول نہیں سکی تھی۔

”ہاں میں نے..... تم میری پسند ہو زریں، میں نہیں بتا دیتا مگر حج دقت آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نہیں کہنا چاہتا ہوں زریں کہ میرے دل کو تمہاری تلاش تھی۔ کبھی کسی جگہ کوئی چیز دیکھ کر آپ لمحوں کی زد میں آکر اسے سند کر لیں تو وہ صرف لمحائی کیفیت ہوتی ہے مگر کسی چیز پر دل ٹھہر جائے تو آپ چاہ کر بھی ان لمحوں سے خود کو آزاد نہیں کر پاتے۔ میرے ساتھ بھی دوسرے دالا معاملہ سمجھو زریں۔ میں کوئی رومانوی جملے نہیں بولوں گا مگر میرے اضطراب کی ایک ایک چیز گواہ ہے کہ کوئی لڑکی میرے حواسوں پر چھائی ہے۔ لیکن تم مجھے پریشان لگتی ہوں زریں..... تم ایسی کیوں لگتی ہوں؟“

وہ جو بت بن گئی تھی۔ لمحوں کی قیدی.....

لفظوں سے پزل سی۔ قیامت تک کے لیے ساکت ہوئی لگتی تھی۔ بین دیا کر متحرک گڑا سا کت گروی گئی ہو۔ وہ اپنے جذبے آشکار کر کے تشویش کا شکار ہو رہا

تھا۔ فکر مند ہی سے پوچھ رہا تھا۔ اپنائیت سے استفسار کر رہا تھا۔ شکر فی پھول مگر قدموں میں ڈھیر ہونے لگے۔ زریں کمال اس ڈھیر کے سامنے بھر پوری چٹان ہونے لگی۔

”نہ..... نہیں میں..... ہاں ٹھیک ہوں۔“  
 ”ہاں کہ نہیں؟“ بہم سے جواب پر سوال سوار ہوا۔ وہ نظر انداز کر گئی۔ وہ جوانکار کرنے کی جسارت کرنے چلی تھی..... ایسا کرنے پائی۔ دل میں بھانپ کر چلنے لگے..... آسو جننے لگے۔

”تم نے انکار کیوں کیا زریں؟“  
 ”ہم بعد میں بات کریں گے لقمان! مجھے کچھ وقت دو پلینز۔ فی الحال کسی نئے بندھن میں بندھنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار نہیں کر پاؤں گی۔ وہ جھوٹ بول کر جانے کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی۔ ثابت ہوا کہ وہ منتشر لچائی کا شکار تھی۔ وقت کی ستم ظریفی نے اسے ناقابل فہم مشکلات میں جکڑ لیا تھا۔ وہ عجیب سے احساسات کا شکار تھی۔ فضا میں بھری ہوئی۔ مغلق سی!

”میں سمجھ سکتا ہوں زریں! تم جتنا چاہو وقت لے لو میں انتظار کی لذت چکھنے کو تیار ہوں۔ یہ میرے حصے میں آتی چاہیے۔ محبت کسی جگہ تو آزمائے پہلی آزمائش ہی سہی گھر والوں کی فکر تم مت کرو۔“  
 اس نے ہنس کر زریں کے دباؤ کو ہلکا کرنا چاہا اور جھک کر قدموں سے ایک پھول اٹھایا..... شاید انتظار کا..... آزمائش کا..... محبت کا!!!

”شوق سے..... مگر یاد رکھو! محبت غیر محرم سے ہو تو عذاب بن جاتی ہے۔“ اس کے لہجے میں طنز کی چھین اتری۔ سنجی سے کہہ کر وہ کال منقطع کر چکی تھی اور لان کی نرم گھاس پر ایک جگہ کھڑا لقمان اس کے لفظوں کے مفہوم میں کھو مارا گیا۔

ادھر زریں باپوسی کے اندھیرے میں، امید کی کرن ڈھونڈ رہی تھی۔

شہر یار سے ملنا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔ اسے حالات کی تکلیفی سے آگاہ کرنا اشد ضروری ہو گیا تھا۔

بے رنگ سی تاریکی، سیاہی میں نہا کر دھڑکی چھا گئی۔

☆☆☆

شیم گرم، دھوپ میں راکل بلیو پانچامہ اور لاٹا شرٹ پر لمبی سیاہ چادر میں لپٹی، زریں کمال ”نیازی ہاؤس“ کے بڑے سے براؤن آئنی کے سامنے کھڑی، سانسوں درست کر رہی تھی۔ ایکڑ پر پھیلا ہوا بنگلہ جس کی بیدنی دیوار پر پھولوں کی ٹیکل لکٹی تھی۔ بلاشبہ مہارت سے تراش ایک شاہکار تھا۔ کئی لمحے وہ نگاہ کشا ہوئی ہوئی چلتی رہی تھی۔

تیل کا بٹن دبانے کی صورت میں اندر چلتے سے بچے..... پھر سکوت چھا گیا۔ دوپہر کے سے بچے سمیت، پورے صاف شفاف علاقے میں دیرانیوں کی حد تک سنائے پھیلائے ہوئے تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے دوبارہ ہاتھ کھڑا کیا۔ ہاتھ فضا میں معلق رہا..... گیٹ میں حرکت ہوئی..... سامنے ایک ٹیکسی خاتون سادہ سے لباس میں کھڑی تھیں..... چہرے پر اپنائیت اور خوشی میں ایک تہکنک اور وقار۔ زریں مرغوب سی ہو گئی۔ ایک دم اعتماد سے خالی ہوئی ہوئی۔ سارے ترتیب دیے جملے بھک کر کے اڑتے تھے۔ کچھ ٹایپے بعد وہ خوب صورت سے ڈرائیور دم میں بیٹھی دیوار پر آویزاں، سمندر میں ڈوبتی کا منظر دیکھ رہی تھی۔ جو کوشش کے باوجود ڈرائیور بھی اس کے دل کی طرح..... پیچھے..... اور پیچھے چکولے کھا رہی تھی!

”کیا ایس کی بیٹا!“ نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے حوصلہ افزائی کی۔ زریں کے چہرے سفید مسکراہٹ جھلک دکھا کر معدوم ہوئی۔

”بہت شکریہ آئی! کچھ بھی نہیں۔ آپ شہر کی والدہ ہیں؟“

”بالکل۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”تم شہر سے ملنے آئی ہو؟“

”جی دراصل..... مجھے شہر یار سے کوئی کام تھا اور.....“ اتنا کہہ کر وہ لب کاٹنے لگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آنے کا مقصد کسے بیان کرے؟“

”پر سکون ہو کر بیٹھو بیٹی..... اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ میں تمہاری بھی والدہ جیسی ہوں۔ شہر یار سے تمہاری ملاقات نہیں کر داسکتی..... اس کے لیے مجھے انسوں ہے۔“ وہ واقعی انسوں ناک تاثرات سے بولی تھیں۔ زریں کا دل دھڑکنے لگا۔

”شہر یار سے ملاقات کیوں نہیں ہو سکتی آئی۔ کافی دن ہوئے اس سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ سیل فون بھی آف ہے۔ سب خیریت سے ہے ناں؟“

دل سے دوسو سے جھٹک کر وہ استقامت بیاہ نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ وہ ہنوز مطمئن بیٹھی تھیں۔

”سب ٹھیک ہے بیٹا۔ شہر یار کو اصل میں، میں نے یورپ بھجوا دیا ہے۔ ایک خاص مقصد کے لیے۔“

”ہاں..... وہاں شہر یار کی خالہ مقیم ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ شہر یار کی بات میری بھانجی سے طے پا جائے۔ اسی سلسلے میں شہر یار کے ڈیڑی اور میں نے فیصلہ کیا کہ شہر یار کچھ عرصہ وہاں رہ کر ایک دوسرے کو سمجھ جان لے اور امتحان کے بعد آؤ جنک بھی ہو جائے گی۔ اپنے غلوں میں بتاتے ہوئے انہوں نے زریں کے سر پر دھماکا ہی کر دیا تھا۔ صد سے میں گھر کر وہ پچھلی پچھلی آنکھوں سے ان کو دیکھے جارہی تھی۔ ایسا کچھ تو اس کے گمان کی آخری حدوں میں نہیں تھا۔

”آئی..... شہر یار مان گیا۔ آئی مین.....“  
 ”بھئی مانتا کیسے نہیں۔“ وہ خود بھی اس ماحول سے کچھ وقت کے لیے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور وہ زریں کے لہجے پر غور کیے بنا اس کے دل پر بجلیاں گرائے جارہی تھیں۔

وہ خاصی باتونی خاتون تھیں۔ ہنس کھارٹھنے ملنے والی اور یہ ساری خوبیاں اس وقت زریں پر بہت بھاری گزر رہی تھیں۔ اس لئے لگا کہ یہاں

آکر وہ غلطی کر چکی ہے۔

”شہر یار نے ہمیں بتایا ہی نہیں..... پسند تو وہ کسی اور کو کرتا تھا۔“ گلے میں آنکھیں کسی چیز کو حلق سے اتار کر وہ بہ وقت بول پارہی تھی..... دل زنجی ہو رہا تھا۔ آنکھیں دھواں دھواں..... وہ ایسا تو ہرگز نہیں تھا..... ایسا تو کبھی نہیں رہا تھا۔

”کرنا تھا۔“ شہر یار کی والدہ اسی انداز میں گویا ہوئیں۔ میں نے ایک دوبارہ کرنا تھا۔ مگر بیٹا اس عمر میں تو لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں..... میں نے خود اس کی پسند پوچھی اور دیکھ لو کہ اس نے اب کی بار نام ہی نہیں لیا۔ بلکہ اٹنا ناراض ہو گیا۔ آج کے بچے ہیں اپنی منوائے ہیں۔ میں نے پھر اپنی خواہش ظاہر کر دی تو خاموش ہو گیا۔ ہوتا ہی تھا۔ شاید وہ لڑکی ٹھیک نہیں تھی۔“ ان کے لہجے میں نہ تنفر تھا نہ خوشی۔ بس سادگی تھی۔

اتنے بڑے گھر کا سارا سناٹا تیزی سے زریں کے اندر اترنے لگا۔ زریں کے اندر کا شور باہر پھیلنے لگا۔ لڑکی ٹھیک نہیں تھی..... لڑکی ٹھیک نہیں تھی..... لڑکی ٹھیک نہیں تھی..... پورا بنگلہ لرزنے لگا۔ دوسرے جھکائے دبیز قالین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ جمائے بیٹھی رہی آواز سناؤں تک پہنچ رہی تھی۔

”شہر یار میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ بے حد لاڈلا..... شروع سے ہی بہت جذباتی رہا ہے بات بات پر روٹھتا، معمولی سی بات پر بری طرح ری ایکٹ کرنا اس کے مزاج کا حصہ ہے۔ اپنے پیار میں شاید مجھ سے ہی کوئی کسرہ رہی کہ جوان ہونے کے باوجود بھی وہ سدا کا جلد باز ہے۔ بات کو غلط رنگ دے کر بنا کوئی تھدیق کرائے اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا تھا۔ اب بھی ویسا ہی ہے مگر اس کی تربیت بہت اچھی ہے۔ دوسروں کو عزت دینا جانتا ہے بہت فرماں بردار ہے میرا بیٹا.....“

ٹھیکے کچھ میں بولنے ان کے چہرے پر ممتا کے سبب ہی رنگ بگھڑے ہوئے تھے۔ زریں کے اندر کھن بڑھ رہی تھی۔



پلکیں جھپک کر..... نمی دھکیلتی..... اس نے چہرہ اٹھایا۔ انہیں دیکھا..... بہت ہمت کے بعد بول سکی۔  
 ”میں چلوں آئی۔ شیری سے پھر بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ حالانکہ وہ اب مرکز بھی اس انسان کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس قدر کہنا اس نے ضروری سمجھا تھا۔ ساتھ ہی وہ کھڑی ہو گئی تھی۔  
 ”سنو..... تم کہیں وہی لڑکی تو نہیں.....“ وہ جانے کیسے خشک میں پڑیں۔

”جی نہیں..... میں وہ نہیں ہوں۔ شہر یار کی کلاس فیلو ہوں۔“ اتنا وہ جانتی تھی کہ شیری نے فی الحال گھر میں کچھ نہیں بتا رکھا تھا۔ کہہ کر وہ بغیر ان پر نظر ڈالے۔ سرعت سے باہر نکل گئی۔ بھلے ان کو ناگوار گزرے، گزرتا رہے۔ وہ کچھ دیر مزید کئی تو مرنے جانی۔ کچلے آسمان تلے، پیچھے تک وہ پسینہ پسینہ ہو کر ہانپ رہی تھی یوں جیسے میلوں صحرائیں بھاگتی رہی ہو۔

المانت سے پیشانی جل رہی تھی..... وہ دھوکا کھا چکی تھی..... کسی کے ہاتھوں بے وقوف بنی رہی تھی..... محبت، محبت کے فریب میں ڈوبی رہی تھی..... کیا وہ ایسی بے مول تھی کہ یوں ٹھکرانی جانی.....؟ کیا وہ اسی کی حق داری تھی.....؟

محبت سے بڑا فریب کوئی نہیں..... یہ حقیقت اور جھوٹ ایک ساتھ ہے..... مگر کسی کو تو دھوکا دینا کر دیتی ہے..... خوار کر دیتی ہے!

زریں کمال اندر سے خالی ہو گئی تھی۔ دنیا کی بڑی حقیقت سے بے زار ہو چکی تھی۔

”نیازی ہاؤس“ کی دہلیز پار کرتے ہوئے زریں کمال، شہر یار نیازی کی مردہ محبت کو بے گانگی کا کنن پہنائے ہمیشہ کے لیے وہیں چھوڑ آئی تھی۔ پوچھ سے آزاد خالی دل کے کواڑ شہر یار نیازی پر بند کرنا وہ بھی بھول نہیں سکتی تھی..... بھولی تھی بھی نہیں۔

اسی گہری تاریکی میں لان کے سامنے کورنڈور کے ساتھ والی سیڑھیوں پر ایک ہیولا سا بٹھا کویا دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ لان میں ہلکی ہلکی سی پھوار برس رہی تھی۔ اور اس کے سر پر شیش کی تنی چھت

اسے اس نمی سے بھاری تھی۔ وہ در رہی تھی۔  
 ”کیا تمہیں اس کے چھوڑ دینے کا اس قدر دکھ ہے زریں؟“ غیور سنان اس کے برابر بیٹھا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے رونے پر کئی دفعہ اسے تسلی دے چکا تھا۔  
 وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں رہے تھے مگر اس راز سے صرف غیور سنان واقف تھا۔ اس لیے وہ صرف اسی کے سامنے کوئی بہانہ نہیں بنا سکتی تھی۔

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟ میں نے اس سے بھلے کوئی طوفانی محبت، دھواں دھار عشق نہیں کیا۔ مگر اتنے عرصے میں جو ذلی وابستگی ہو چکی تھی۔ میں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہیں کھائیں۔ مگر ساتھ رہنے کے خواب تو دیکھے ہوں گے ناں.....؟ وہ خواب ایک دم جل جائیں تو آنکھوں میں راکھ سما جاتی ہے..... یہ آنسو بہا کر میں وہ راکھ بہا دینے کی کوشش کرتی ہوں۔“

ایک زکام زدہ سی سانس کھینچ کر وہ ہلکے سے بولی تھی..... لیوں سے ادا ہوتے کمزور الفاظ، حلق کے خشک ہو جانے کی علامت تھے۔

”یہ بار بار کے آنسو راکھ جتا بھی سکتے زریں! کیا فائدہ، سنبھالو خود کو۔“

”خاموشی سے ٹھکر کر چلے جانے کا دکھ بڑا کڑا ہوتا ہے غیور۔“ اپنی کمائیگی کا احساس دلاتا ہے۔

”ہاں۔“ کاش میں تمہیں خوشیاں دے سکتا زریں! میں مجبور ہوں۔“

”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں میرے بھائی۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے صاف لہجے میں بولی۔ پھوار ہنوز جاری تھی۔

”لقمان اچھا لڑکا ہے۔“ غیور نے اسے نئے راستے پر ڈالا۔ زریں نئی منزل دیکھ سکتی تھی۔

”وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر اچھی لڑکی ڈیزور کرتا ہے میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ اور.....“

”اور تمہاری ڈسٹربنس شاید تمہارا فیصلہ دور۔“  
 ”رہے۔ بہر حال جیسا تم چاہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا۔ اب دل ٹوٹے تو اتنی تکلیف تو ہونی ہی ہے..... تم ماننی نہیں تھیں تب.....“  
 ”غیور پلیز!“ اس کی آواز نظر میں چراتی تھی۔  
 ”ایسا ہمت کہو۔ میں خود کو سنبھال لوں گی۔ میں یہ کر سکتی ہوں۔“ خانف سے ہو کر وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ خود بھی نہیں جان پاتی۔

بادل کی گرج، بارش کی برس، ہوا سے کھڑکھڑا تے پتے، سائیں سائیں کرتیں ہوائیں، سرخی بادلوں سے ڈھکا آسمان میں پر چھایا سکوت، یہ سب مل کر جب ماحول پر ہیبت طاری کر رہے تھے۔ سعدیہ کے پورٹن میں زریں کے کمرے کی کھڑکی میں لیمپ کی مدہم زرد روشنی پورے شیشے پر پھیلی نظر آئی تھی..... اندر زریں ڈائری پر لکھ رہی تھی.....!

”انسان زندگی میں ایسی ایسی جگہوں سے مات کھا جاتا ہے ڈائری! جہاں سے ایسا کچھ ہونے کی امید کیا، گمان بھی نہیں ہوتا۔ پھر شاید اسے ہی تقدیر کہتے ہیں۔ جو تدبیروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ میں نے شہر یار سے محبت کی اور مطمئن ہو گئی۔ غلطی جانے کس کی ہے۔ میری شہر یار نیازی کی، یا کسی تیسرے کی۔ پھر بھی ہم دو ریا کے دو الگ الگ کناروں پر جا کھڑے۔ جتنا سوچتی ہوں اتنا اوجھتی ہوں کہ شہر یار نے آخر کس بات کا بدلہ لیا مجھ سے..... انتقام کی وجہ ہی بتا جاتا۔ ہوں نہ کرتا۔ لیکن.....“  
 وہ آنکھیں پوچھنے کوری۔

”لیکن اب اس سب کا کوئی فائدہ بھی نہیں..... کیا میں کبھی اس انتقام کی بنیاد جان سکوں گی۔ یا ساری زندگی پوچھنی کبھی بکھار یاد آنے پر اس بے تصور غلطی کی سزا پر میں دہانی رہوں گی۔ میں نہیں باقی، مگر اب میں اس سے پیچھا چھڑا رہی ہوں۔“  
 ”ست! تمہاری ایک صفحہ پر میرے ہاتھوں لکھا ایک بلہ بڑھ کر میں حیران ہوں کہ اسے میں نے لکھا نہ۔ لکھا کچھ یوں ہے.....“

”جو لوگ ہماری چاہت و توجہ کے منتظر ہوں..... انہیں انتظار کی اذیت میں مبتلا نہیں رکھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ فوراً ہاتھ بڑھا کر انہیں تمام لیں کہ ایسا نہ کرنے کا ہمارے پاس کوئی حق نہیں.....“  
 مجھے میری ہی تحریر نے راہ دکھادی اور میں سنبھل گئی ہوں۔ دیکھو میں خود کو سنبھال رہی ہوں۔ آگے بڑھ رہی ہوں۔ ڈائری ڈائری! میں شادی کر رہی ہوں۔ لیں آئی ایم گینگ میریڈ.....“

☆☆☆

زریں کے ہائی بھر لینے کے بعد دو ماہ بعد وہ اپوں میں بٹھائی گئی تھی..... اس سے قبل وہ دونوں ایک ساتھ مقبرہ چھاگیر آئے تھے۔  
 ”لاہور میں بہت سی جگہیں قابل دید ہیں۔ مجھے تم سے شکوہ رہے گا کہ تم مجھے سیر کرانے کی ایک دفعہ بھی آفر نہیں کی۔“

صدر دروازے کو پار کرتے ہوئے لقمان نے ہلکا سا شکوہ کیا تھا۔

زریں محسوس کر سکتی تھی کہ کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ بھی ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ وہ خوش تھا۔ اور یہ صاف دکھتا تھا۔ زریں نے اس شاندار مرد کو نظر بھر کر دیکھا۔

”آخر تو تم نے لقمان دکھانے کی بھی نہیں کی۔ میں وہاں کبھی نہیں گئی۔“ مقبرے کے وسیع احاطے میں چہل قدمی کرتے لوگوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر زریں نے جواب دیا تھا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے تھے۔

”میں تمہارے پاس ہوں..... یہ کافی نہیں۔“  
 لقمان میں تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟“

”بہی بات میں.....“ وہ تیزی سے مڑ کر برجستگی میں جواب دیتی رہی..... ہلکی..... اپنے حاضر جوابی کے مظاہرے پر خفت زدہ ہو گئی تھی۔ لقمان حیدر اس کی بات سمجھ کر بدقت ہنسی لیوں میں دبایا تھا۔ اس ضبط پر زریں اسے بنا دیکھے اس کے چہرے پر پھیلی سرخی کا پتا لگتی تھی۔

اجاط پار کر کے دونوں سنگ مرمر کے تختوں کے نیچے ابدی نیند سونے نور الدین جہانگیر کے لیے دیر تک دعا کرتے رہے۔ واپس احاطے میں آنے تک زریں نے لقمان کو مکمل طور پر سنجیدہ پایا تھا۔

”تمہیں کسی نے اس پر پوزل پر پریشاں تو نہیں کیا زریں؟“ دونوں ڈھلتے دن کی روشنی میں سفید گلابوں کی گیارہ کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ زریں کو ایک دم لقمان کی اچانک لاہور آمد کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

”نہیں لقمان..... یہ سراسر میرا ذاتی فیصلہ ہے.....“ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے انہیں سی محسوس ہوئی۔

”تمہارے رویے سے لگتا تو نہیں تھا.....“ اس نے بات کو مزاح کا رنگ دینے کے لیے مسکرا کر دکھایا۔

”رویے بدلنے کے لیے ہی ہوتے ہیں لقمان اور انسان درست وقت پر درست فیصلہ کر لے، یہ بڑی بات ہوتی ہے۔“ وہ پھول توڑنے لگی۔ دھوپ کی ہلکی ہلکی تپش سے وہ مرجھائے سے تھے۔

”ہوں..... میں کہوں کہ میری محبت نے تمہارا دل بدل دیا؟“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ گویا زریں سے کچھ اگوتا مقصود تھا۔ زریں نے پھول کی پہلی پتی نوچ لی۔

”پلیز لقمان..... ہماری گفتگو میں اس لفظ کو شامل مت کیا کرو۔“ اس نے فوراً ٹوک دیا تھا۔ یوں جیسے چائے میں ایال سا آ گیا ہو۔ پھول کی پتیاں تیزی سے بکھرنے لگیں۔

”کیوں..... تم اس لفظ کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتیں۔“ اس نے تنبیہ کی۔

”مجھے اس جذبے کی حقیقت پر ذرا بھی یقین نہیں۔“ وہ غصے کا شکار ہو، لہجے میں طعن کڑا کر نہی گئی تھی۔

”تم اس قدر تلخ کیوں ہو جاتی ہو زریں! تبادو۔“ وہ ٹھنڈے شہار لہجے میں گویا ہوا۔ ہلکی ہلکی ہوا

پودوں کو جھولا جھلانے لگی۔

”انسان متحاس اور کڑواہٹ کا مجموعہ ہے۔ ہر وقت کی متحاس بھی زہر لگنے لگتی ہے۔ تمہارا سوال بے معنی ہے۔“ اب وہ سپاٹ لگنے لگی تھی۔ لقمان حیدر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ اس لڑکی کو کھولنا بے حد کھن تھا۔

”تم انکار کرو زری..... جہاں محبت نہ ہو وہاں خوشی نہیں آتی۔“

”میں بے حد خوش ہوں.....“ وہ یوں مسکرائی جیسے کہتی ہو۔ ”یہ دیکھو“ لقمان ناچاہتے ہوئے بھی ہنس دیا۔

”بہر حال میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا..... تم نے انتظار کرنے کو کہا..... میں کر سکتا تھا۔ دو ماہ نہیں، دو سال..... تمہارا جو فیصلہ ہوتا۔ چاہے میرے مخالف..... میں تمہارے ساتھ کھڑا رہتا۔“ وہ یقین کے ساتھ بول رہا تھا۔ زریں کو وہ اچھا لگا۔ لقمان حیدر بے حد اچھا..... بال روڈ کے جہوم میں گھومتے، زریں کو نظروں سے اوجھل ہوتے فتنے پر شہریار کا گمان گڑا اب پہنچ کر قدم بڑھاتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی!۔

اور پھر زریں کو مایوس بٹھا دیا گیا۔ وہ ہر چیز سے غافل ہو گئی۔ لقمان سے بات کرنا بھی اس لیے بند ہو گیا تھا کہ اس کے بعد اس کا موبائل کہاں بڑا رہ گیا۔ اس نے خود بھی یاد رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی!

☆☆☆

زرد سورج کی ایللی کرئیں ”میٹرو شاپنگ مال“ کی گلاس وال سے منعکس ہو کر آنکھوں کو حیرہ کرتی چمک پیدا کر رہی تھیں۔ شاہ خاور کی باسی کرنوں میں میٹرو کی عمارت پوری ممکنات سے کھڑی دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہی تھی۔ اندر نیچے سے اوپر منزل تک معمول کا ریش نظر آرہا تھا۔ دن کی روشنی میں اندر چلتے برقی تھپے سپیدی پھیلائے میں کامیاب نظر آتے تھے۔ ایسے میں وہ ہاتھوں میں چند شاپنگ بیگز لیے اوپر سے چلتی ہوئی

اڑ رہی تھی۔ وہ اپنی شاپنگ مکمل کر چکی تھی ادب اپنی ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے اس کا رخ نیچے کی جانب تھا۔ شاپنگ ہمیشہ اس کا بہت وقت لیتی تھی۔ گہری سانس لے کر وہ زریں کے سامنے برقی سیڑھیاں میں جو بھتی ہوئی نیچے کو جاتی تھیں۔ وہ قدم بڑھا کر آخری سیڑھی پر کھڑی ہو گئی اور نیچے نیچے کا انتظار کرنے لگی۔ ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دیکھ سکتی تھی کہ میٹرو میں گہما گہما بڑھ رہی ہے۔

پہلی سیڑھی پر پہنچ کر وہ اتر کر دو قدم ہی مزید ہلکی کر آواز پر لفظ بھر گئی۔

”ہائے نیا۔“ کسی مانوس آواز پر وہ چونک کر مڑی۔ آواز کے تعاقب میں نظر دوڑانے پر وہ اپنے مخاطب پر پہلی نظر ڈالتے ہی اسے اپنی نظروں کا فریب گئی۔ وہ فریب دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آتا گیا۔

”کیسی ہو نیا.....؟“ وہ جیسا سا مسکرا کر بولا۔

نیا کسی خواب سے جاگ گئی۔ ”شہر..... یار تم..... مانی کا ڈ..... یہ تم ہو؟“ وہ بے یقینی سے اسی قدر کہہ سکی۔ شہریار نیازی ہنوز مسکرا رہا تھا۔ اگلے دو منٹ بعد وہ میٹرو میں ”سوفٹ ڈرنک کارنز“ کے اندر آئے سامنے بیٹھے تھے۔ اور بے یقین نیا اسی حیرت کا اظہار کر رہی تھی!۔ ”تمہارا اچانک غائب ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی شہریار..... میرے گمان میں کہیں نہیں تھا کہ ہمارا اب بھی ٹکراؤ بھی ہوگا۔ تم اس سارے عرصے میں کہاں تھے؟“ وہ اس تصادم پر حیرت و باہمی تجسس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ سننے پر انکشاف کر رہا تھا۔

”اسی زمین پر تھا نیا۔“ وہ ٹالنے کی غرض سے بولا۔ ”اسے چھوڑو۔ تم کہو، آج کل کیا کر رہی ہو۔ شاپنگ ہو رہی تھی؟“ گفتگو کا رخ بدلنے پر وہ اس ٹھنڈی سانس بھر سکی۔ یہ شہریار نیازی بہت اچھی مالگ رہا تھا۔

”میں فارغ ہوں آج کل..... اور ہاں زریار کی غرض سے آئی تھی۔ زریں کی شادی کے

لیے گفت بھی خریدنا تھا..... اس امید پر خریدا ہے کہ اسے پسند آئے گا۔“ ناؤنگی میں زریں کا ذکر کرتے آخر میں وہ کچھ جتنی نظروں سے دیکھ کر چپ ہو گئی تھی۔ شہریار کے چہرے پر استہراسیہ مسکراہٹ پھیلی۔ ”وہ شادی کر رہی ہے.....؟“

”تمہیں اس خبر سے خوش ہونا چاہیے۔ کہ وہ اپنی زندگی میں چھٹی باتیں جھلا دینے کی ہمت رکھتی ہے، تم نے بہت غلط کیا اس کے ساتھ۔“ اس کے طنز پر وہ ناگواری کا احساس بمشکل دبا کر بولی تھی۔ شہریار نیازی کی بھونٹیں تن گئیں۔

”ہم سمجھتے تھے تم دونوں شادی کرو گے ایک دوسرے سے، مگر مجھے اس دھوکے کی امید نہیں تھی۔“ اب کے اس کے لہجے میں غم و غصہ تھا۔

”نیا دھوکا میں نے دیا نہیں..... دکھایا ہے زریں ایک جھوٹی اور مکالماتی ہے۔“

”شٹ اپ شہریار..... میں فضول کہوں نہیں سنوں گی۔ زبان پر کنٹرول رکھو۔“ ضبط کو کہہ کر وہ سرخ ہوتے ہوئے سختی سے بولی تھی۔ شہریار کہنیوں کے بل میز پر آگے کو جھکا۔

”تمہیں سننا ہوگا نیا! تم وہی بات جانتی ہو جو تمہیں زریں کے آنسوؤں نے سنائی ہوئی بلکہ نہیں وہ کیوں رونے لگی۔ شاید افسوس یا غصے سے۔ اصل دھوکا تو میں نے دکھایا، زریں نکاح شدہ ہو کر مجھ سے محبت کا کھیل کھیلتی رہی۔ کس لیے؟ صرف دولت، پیسوں کے لیے، یونی میں دکھانے کے لیے شہریار نیازی صرف اسے چاہتا ہے۔ کیا اسے میرے جذبات کی پروا نہیں تھی۔ کیوں کرنی رہی وہ ایسا۔ اب بتاؤ مجھے؟“

جذبات میں بولتے شہریار نیازی نے اس کی سامعیتوں میں پکھلا سیسہ انڈیل دیا..... وہ جھونچکی سی رہ گئی تھی۔

”یہ..... یہ جھوٹ ہے..... الزام ہے شہری!“ وہ حقیقتاً سنائے میں رہ گئی تھی۔ شہریار کی آنکھوں میں ایسی نفرت، سمجھ سے بالاتر تھی۔ ”یہ حقیقت ہے

نیا..... تمہیں شاید دیکھ کر لگتا ہے تم بھی انجان ہو اس بات سے۔“ وہ نظریں جھکا کر نرمی سے گویا ہوا۔

”نہیں نہیں شہر یار!“ وہ پکرا سی گئی۔ ”میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ کئی بار اس کے گھر بھی جا چکی ہوں۔ تم اس کے کردار پر انکی اٹھا کر گناہ مت گردو۔ وہ ایسی ہرگز نہیں ہے۔ تمہارے داغ میں یہ خناس کس نے بھرا۔ اودھ اللہ! شیری اس کا کوئی نکاح نہیں ہوا۔ اس کا جہاں رشتہ ہوا وہ ملتان کے رہنے والے ہیں اور نکاح بارات والے دن ہی ہوگا۔ زریں مایوں میں بھی ہے اور کل بھندی ہے۔ باخدا اس نے بہت کوشش کی تم سے رابطہ کرنے۔ تمہارے گھر تک گئی۔ تمہاری ماں سے ملی۔ میں اس کے دکھ کی گواہ ہوں..... تمہیں ایسا کہہ کر اس کی تو بہن نہیں کرنی چاہیے۔ تم سے مایوس ہو کر ہی اس نے اس رشتے کے لیے ہائی بھری..... اور تم..... اف اللہ!“

نیا نے چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ شہر یار! جھن بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ کیسی ہوجیدہ کہانی سنارہی ہو نیا..... مجھے یہ باتیں ایسے شخص سے پتا چلی ہیں جس پر اعتبار نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں بھی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ زریں نے اپنی من پسند کہانی سنائی ہے تمہیں۔“

”فارگاڈ سیک شہر یار! غلطی نہیں تمہیں ہوئی ہے، مجھے بتاؤ کس نے یہ غلط بیانی کی تم سے۔ نام بتاؤ اس شخص کا۔“

”میں بتاتا ہوں نیا! شاید پھر تمہاری آنکھوں سے پردہ ہٹ جائے۔“ وہ لمبے بھر کو چپ ہوا۔ ”مجھے یہ سب غیور نے بتایا۔ غیور سمن نے..... کہو کیا کہتی ہو؟“ ”میرٹو مال اپنے تین منزلہ قد سمیت نایاب کے سر پر جا کر اٹھا۔ اس کے بلے میں وب کر وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔“

☆☆☆

یونیورسٹی سرگرمی بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہ وہاں الوداعی پارٹی اٹینڈ کرنے جمع ہوئے تھے.....

یہ یونی کلاسٹ ڈے تھا اور وہ دونوں لیاقت ہال راجداری میں کھڑے کوک لی رہے تھے..... اس دن صبح سے ہی ٹھنڈی لڑکی کی لڑکی کی کہانی زبان زو عام تھی۔ وہ لڑکی یونی کے ہی کے کسی لڑکے سے چاہت میں مبتلا رہی تھی اور اب اپنی محبت پر کسی ایسے کبیر شخص کو فوجیت دے کر اس سے شادی کر رہی تھی۔ ایک عرصہ اس لڑکے کی محبت کا دم بھرنی وہ لڑکی اب اس کی بات بھی نہیں سن رہی تھی۔ غیور سمن نے سارا قصہ دہراتے ہوئے کہا تھا۔

”کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں ایسی..... جو محبت نہیں جسٹ ٹائم پاس چاہتی ہیں۔ زہر لگتی ہیں مجھے ایسی لڑکیاں جو خود سے بھی مخلص نہ ہوں.....“ اپنے سیاہ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ناگواری سے بولا تھا..... شہر یار متفق ہوا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو.....“ ”نبی بات لڑکا ہو یا لڑکی مجھے سخت ناگوار گزرتی ہے۔ جو جذبات سے یوں کھیلے ہیں جیسے دلچسپ گیم سے کھیل رہے ہوں۔ کسی پزل باکس سے..... میں زریں کو بھی..... تیز تیز بولتے زبان سے نکلے غیر ارادی جملے پر اس نے زبان فوراً واٹھوں میں دبائی۔ ”زریں کا کیا ذکر.....“ وہ بڑی طرح چونکا۔

”نہیں کچھ نہیں..... سوری۔“ غیور کے نظریں چرانے پر شہر یار کے کسی جذبے کو ہوا لی تھی۔

”تم کیا چہا رہے ہو؟“ ”چھوڑ دیا رانیو بی زبان سے پھسلا۔“ ”غیور مجھے بتاؤ۔ تم ایسے کیوں ری ایکٹ کر رہے ہو؟“ وہ سنجیدگی سے کچھ ڈپٹ کر بولا تھا۔ غیور کے چہرے پر بے چارگی ابھرائی۔

”کیونکہ زریں بھی ایسی ہے..... وہ آل ریڈی نکاح شدہ ہے۔“ ”واٹ؟“ شہر یار کے گرد سے دیواریں سرگ گئیں..... کوک ہاتھ سے چھوٹ کر کرچوں میں بٹ گئی تھی۔

”ایم سوری شیری! میں تمہیں بتانے کی کبھی نہیں کرتا مگر شاید یہی بہتر ہے۔“ زریں کا نکاح بارے دور کے کزن لقمان سے بہت پہلے کا ہو چکا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ سیر نہیں، بس تمہارا مذاق اڑانا پسند کرتی ہے۔ تم دولت مند ہو پینڈم ہو، سب بڑھ کر اس کے ساتھ کے خواہاں ہو، تو وہ اس ملک کو برا نہیں سمجھتی..... اور۔“

”شٹ اپ غیور! اپنا بے ہودہ مذاق مجھ پر مت آزماؤ، تمہارا سر بھاڑ دوں گا۔“ وہ غصے سے ہلایا۔ دیواریں خاموش تھیں۔ آواز گونجتی رہ گئی۔ ”دور کے چہرے پر گہرے تاسف کے سائے تھے۔“ ”اوکے۔ تو بتاؤ وہ تمہارے ساتھ کہیں آتی ہائی کیوں نہیں۔ کبھی تمہارے گھر بھی نہیں گئی کبھی۔“ ”یوں تمہارا ذکر گھر میں نہیں کرتی، تمہیں گھر کا ایڈریس سچ سے نہیں معلوم، تمہیں شادی میں انوائٹ نہیں کیا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ تم سے گریز کرتی ہے۔ اس گریز کی وجہ اس کا نکاح ہے جو اسے دل ہی دل میں ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ویٹ!“

صدے میں شہر یار کو ڈال کر وہ ہاتھ میں پکڑے ”ایساں پر انکی چلا رہا تھا۔ شہر یار کا چہرہ شکل تھا۔“ ”یہ دیکھو..... دیکھو دونوں کی قدر خوش ہیں۔“ ”نکاح کی تصاویر، نکاح کے بعد کی گیس۔“ ”موبائل شہر یار کے سامنے تھا۔ شرارہ سوٹ میں دلہن بنی ہیں۔ اور ساتھ میں بیجا وہ (کرب سے چہرہ بکڑا) دونوں مسکرا رہے تھے اور بھی کئی پوز فلیش اس کی زد میں آئے ہوں گے۔ دونوں کی ٹھہراہٹ سے موبائل کی اسکرین روشن تھی اور شہر یار دنیا تار یک ہو گئی تھی۔ غم وغصہ، شدید صدمہ، زور مار دھچکا، زمین پر زلزلہ، جیسی جی ملی کیفیٹوں کا شکار تھا شہر یار نیازی!

”تم نے پوچھا کیوں نہیں کہ وہ کیوں رہا ہے تمہیں۔ آخر کس ہمدردی سے؟“ بت بتی نیا نے خود کو حرکت دے کر زندہ ہونے کا احساس لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی سنگین انکشاف کا

شکار ہو رہی تھی۔

”اس نے کہا اسے لقمان بہت عزیز ہے..... وہ نہیں چاہتا، اس کی امانت میں کوئی خیانت ہو..... مجھے اس کی زندگی سے نکل جانا چاہیے۔“ شہر یار شکست خوردہ سا بول رہا تھا۔ ستا ہوا چہرہ چچھتاوے کا غماز تھا۔ نیا کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔

”تمہیں زریں سے باز پرس کرنی چاہیے تھی۔“ ”اسی نے مجھے روکا۔ وہ زریں کا تمنا نہیں بنانے دینا چاہتا تھا اور..... اور میں اس کے پاس گیا بھی، وہ واقعی لقمان نامی شخص سے خوب گفتگو بھی کیا۔ بس میں بری طرح سے ٹوٹا تھا اور بری طرح بدول ہوا، مجھے میری جلد بازی نے بہت تکلیف پہنچائی نیا۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں۔“ نیا اس کے چہرے پر نرم ازیت دیکھ سکتی تھی، لیکن اس کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کسی کے بھی بس میں کچھ نہیں ہوتا اس نے تھک کر سوچا۔

”پلیز کیا۔ مجھے زریں سے ملوادو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پلیز میلپ می۔ وہ مان جائے گی۔“ وہ منت سے بولا۔

”یہ ممکن نہیں، شہر یار کی رخصتی قریب ہے اور اب قیامت تک ایسا نہیں ہو سکے گا کہ تم اسے پاسکو۔ اس کی نئی زندگی میں بٹل مت پیدا کرو شیری! تمہارا کوئی بھی حد سے برا قدم اسے عین وقت پر سب کی نظروں میں گرانے کا سبب بن سکتا ہے۔ سو جو چل رہا ہے چلے دو۔ اسے آگے بڑھنے دو۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اٹھنے کے پر توڑ رہی تھی۔

”پلیز کیا نہیں۔ تمہیں زریں کی قسم..... بس ایک بار مجھے اس سے بات کرنے دو۔ پھر خواہ مجھے ٹھکرائی دے..... اس کی عزت کا مجھے خیال ہے۔“ ”بھیر لکھو شہر یار! اس سے بڑھ کر میں کچھ نہیں کر پاؤں گی۔ ایم ریٹی سوری۔“ شہر یار نے نیا کو قطعیت سے کہتے سنا اور بے بس نظروں سے اسے دیکھ گیا..... وہ جو ایک جذباتی شخص تھا۔ اور جذبات بھی..... اگر سچ دھارے پر نہیں تو عین خوبی..... اور اگر غلط رخ چلیں تو ایک خطرناک

خامی کا روپ لے لیتے ہیں۔ اعتبار کے کچے شخص کی مثال اس برندے کے جیسی ہے۔ جیسے عمر بھرنے سا یہ وارا شجار کی ٹھنڈک میسر آتی ہے..... نہ زمین کا سکون..... مقدر ٹھہرتا ہے تو بس بل چلی زمین پر بنوں کا ٹھکانہ..... اور ویر و راز تک ویرانہ.....!!!!

”اچھا کرن ہوگی۔“ زریں نے دھیرے سے کہا۔

”اچھا جیسے میں جانتی نہیں، کرن کی آڑ میں کون ہوگا۔“ وہ دہی بی بی سے بولیں۔ زریں جھینپ سی گئی۔

وہ دم سا وہ ٹوٹا پھوٹا پڑھ رہی تھی۔ ہاتھ لرز رہے تھے۔ نیلی روشنی اس کا چہرہ سن کر رہی تھی۔ انگلیوں میں نمکین ہانسیوں نے جمع ہوتا شروع کر دیا تھا۔ موبائل چھوٹ گیا تھا۔ جب اس نے سنا.....  
ایلیا..... وہی نمبر وہ بارہ جگہ گرا رہا تھا۔ وہ چلا کر کہنا ہاٹی تھی۔ بکو اس بند کرو۔ مجھ سے دور ہو جاؤ، اس نے اتنا نہ ہوسکا فون اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔  
۱۔ - دندنہ دیوار پر مار کر چور چور کروے..... اب تمام حیدر چمکنے لگا تھا..... اس کلبے جان جسم ڈھیر ۱۱ نے پر بھی آمادہ نہیں تھا۔

غیور اس سے اس کے کمرے میں ہوتا ہے۔ وہ اندر داخل ہوگئی۔ ٹھک سے ٹی دی آف کر دیا۔ قیوم کمرے سے باہر جاؤ۔

”ٹھٹھک ہو زری.....“ قیوم چپکے سے باہر نکل گیا۔ خاموشی کو غیور کی آواز نے لرزادیا تھا۔

”تمہیں تشویش ہو رہی ہے میرے ٹھیک ہونے پر؟“ وہ زخمی سا مسکرائی۔ الفاظ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”کیسی باتیں کر رہی ہوں؟“ وہ آگے آیا۔

زیریں بھی آگے گئی۔



دہشتیوں سے پیش لپک رہی تھی۔

”میرے پاس وجہ نہیں۔“

”کوئی کام بے وجہ نہیں کیا جاتا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ اچانک کرختی سے بولا تھا۔ ”میں نے کیا ہے سب کچھ۔ بتاؤ کیا کرو گی تم۔ یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔“ وہ آواز نیچے رکھتے ہوئے غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ زریں کے صبر کا گراف آہستہ سے گھٹنے لگا۔

”مجھ پر انگلی بند میں اٹھانا۔۔۔۔۔ پہلے تمہارا چہرہ تو پہچان لوں میں۔۔۔۔۔ کس منفی جذبے نے تمہیں ایسا کرنے پر اکسایا۔ غیور ایسا تھکے کس مہربانی سے دیا تم نے۔۔۔۔۔ اس کی آواز پھٹ گئی۔ وہ متاثر ہوئے بغیر گھورنے پر اکتفا کر رہا تھا۔۔۔۔۔!

”ٹھیک سے زری! چہن سے۔ تم نے میری محبت چھینی تھی۔ میں تمہاری محبت کیسے چپ چاپ پھولتے دیکھ سکتا تھا۔ جو تم نے کیا تھا یاں زری اس کے مقابلے میں تو یہ نہایت تہی سی کوشش ہے۔ جو ایک جھگڑے میں کامیاب ہوگی۔“ اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے اس کا چہرہ ہزار زادیوں سے بگڑ رہا تھا۔ زریں کو تکلیف ہوئی۔۔۔۔۔ بہت ہوئی۔ وہ ایسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ذرا نہیں لگ رہا تھا۔

”کون سی محبت۔۔۔۔۔ کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ صرف غیور کو جاننا چاہ رہی تھی۔ اس لڑکے کو جسے بڑے چاؤ سے بھائی مانتی تھی۔۔۔۔۔ بانی باتیں بھاڑ میں جاتیں۔۔۔۔۔ وہ اس نفرت کا سبب تو جانے۔۔۔۔۔ دکھ شہریار نیازی کا نہیں تھا۔ فطری نہیں تھا۔ وہ اپنا مقام کھو چکا تھا۔

”واؤ۔۔۔۔۔ انسان کی سب سے بری عادت یہی ہے زری کہ وہ کچھ کر کے ابے بھلا کر آگے بڑھ جاتا ہے جیسے پاکیزہ پانیوں سے خود کو دھوا یا ہو۔ اب کچھ اس کی طرف پلٹ کر نہیں آئے گا۔ مگر مخالف نہیں بھولتا زری۔۔۔۔۔ کبھی بھی نہیں بھولتا۔۔۔۔۔ تمہیں دکھ ہے؟ لیکن کرو مجھے بھی بہت ہے۔۔۔۔۔ جو محبت تم کرتی ہو ناں، وہی میں نے کی تھی۔۔۔۔۔ دس سال یا

اتنے ہی عرصے کی ویش پہلے۔۔۔۔۔ میں نے تم سے بدتمیزی نہیں کی تھی۔ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔ پورے

میں میرا تماشا بنادیا۔۔۔۔۔ اس شام میری عزت کتنی مجروح ہوئی تھی۔ تمہیں اس کا اندازہ بھی ہو سکتا۔ جو عمر اس وقت میری تھی۔ اس عمر میں کوئی معمولی سی بات بھی کتنی انسٹلٹ لٹل کر دیتی ہے کاش تمہیں علم ہوتا۔ اس شام تمہاری واہ واہ ہوئی اور مجھے کتنی لعنت ملا مت کی گئی۔ مجھے وہ لہجہ ابھی تک نہیں بھولتے۔۔۔۔۔ تو میں نے بھی تم سے تمہاری محبت چھین لی۔۔۔۔۔ تمہیں شہریار کے کھونے کا اس قدر دکھ ہے۔ میرا دکھ تم سے بڑا تھا زریں کہ اس شام کے بعد بھی بار بار مجھے اس واقعے کی یاد دلا کر چھیڑا جاتا رہا تھا۔ کیوں زریں کیا میں اسی سزا کا حق دار تھا۔ ہاں تو تمہارے ساتھ بھی ٹھیک ہوا ہے۔“ وہ لہجے میں پھنکاریں سا کر اسے بچپن کی کوئی بھولی بھری یاد دلا رہا تھا۔ لیکن کمرے میں جیسے صور اسرافیل پھونک دیا گیا تھا۔ زریں ساکت تھی۔۔۔۔۔ قیامت تھی۔۔۔۔۔ گنگ بھی۔۔۔۔۔ کیا اتنی سی وجہ۔۔۔۔۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ارد گرد دھوئیں کے گبولے اٹھ رہے تھے۔

”غیور۔۔۔۔۔ یہ بات۔۔۔۔۔ کیا اتنی سی؟“

”شہریار کی بات بھی اتنی سی ہے۔۔۔۔۔“

”بھاڑ میں گیا شہریار۔۔۔۔۔“ وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔ پوری شدت سے۔۔۔۔۔ گلے میں دراڑیں پڑیں۔ میں آگ میں جھونک چکی ہوں شہریار نیازی اور اس کے جھولی محبت کو۔۔۔۔۔ میں اپنے بھائی کی بات کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ اس غیور کی بات کر رہی ہوں جسے میں نے کھو دیا۔ دل میں اتنی حقارت رکھنے کے باوجود تم مجھے کیسے برداشت کرتے ہو۔ تم مجھ نہ کہنے کے کہ زریں تم محبت کا دکھ گلے لگا لو۔ تم نے مجھے پیچھے دار کیا۔۔۔۔۔ میرا تماشا دیکھتے رہے۔۔۔۔۔ اس کوئی آسان ٹوٹ پڑے تھے۔ اس میں اتنی ہمت رہی کہ ٹانگوں پر کھڑی رہ سکے۔

”وہ تماشا تم نے بھی دیکھا۔۔۔۔۔“ وہ غصے

نہا رہا تھا۔

”وہ تمہاری محبت نہیں تھی غیور۔۔۔۔۔“ زریں نے اس کا گریبان پکڑ کر جھکا۔۔۔۔۔ اگلے پل وہ پھاٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”میں نے تمہاری بھلائی کے لیے ایسا کیا تھا۔ نہیں اس سب سے دور رکھنے کے لیے کہ تمہاری اچ کے دھارے غلط سمت بہہ رہے تھے۔ تمہاری ابران چکروں میں پڑنے کی نہیں تھی۔ تم۔۔۔۔۔“ غم کی شدت سے وہ کھکھار رہی تھی۔ وہ کسی ایسی ہی جوڑی سے ایک رات پہلے تک رونے میں مشغول رہی تھی۔ غیور اسے دیکھنے سے اجتناب کر رہا تھا۔ کمرے میں اسرار سا پھیلا ہوا تھا۔ بھید بھری اماں ٹوٹے یقین کا دکھ روئی، سارے میں گونج رہی تھیں۔

”زریں۔۔۔۔۔ یہ ہو چکا ہے اور۔۔۔۔۔“

”اور یہ نہیں ہونا چاہیے تھا غیور! مجھے علم نہیں ہوتا چاہیے تھا۔ انسان کے اندر بہت کڑواہٹ ہے، جسے وہ خود اپنی محبت سے محاس میں بدلتا ہے۔ انڈوں کو چوٹ پہنچانے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ جب یہ حقیقت آشکار ہوگی تب بھی رشتے نہیں ٹوٹیں گے۔ خولی رشتوں کا عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ کیا ہم اس کے بعد بھی انہیں منہ دکھانے کے قابل رہ جائیں گے؟ کیا پھر ان پر اپنا حق جتنا یا نہیں گے؟ تمہارے دل کی کک ختم ہوئی، چہن نکل گئی۔ کسی اور دل میں تو پچائس اٹک گئی ناں۔۔۔۔۔ بتاؤ کیا وہ اسے نکلنے کے لیے منے سرے سے انتقام کے لیے یار ہو۔۔۔۔۔؟“

وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے پلکیں جھپک رہی تھی۔ جن کی باڑ پر جلن بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں تمہارا شکرا ادا کرتی ہوں غیور! تم نے ایک کام بہت اچھا کیا۔ مجھے شہریار نیازی جیسے بے ہمار شخص سے الگ کر دیا۔ ایسے کانوں کے کچے دل زندگی کو بھی سہل نہیں رہنے دیتے۔ میں تمہاری

شکر گزار ہوں، کہ اس کام کا وسیلہ تم بن گئے۔۔۔۔۔ تم نے کہا تھا ناں لقمان حیدر! اچھا لڑکا ہے۔۔۔۔۔ آج میں کہتی ہوں کہ وہ ایک بہترین شخص ہے۔ میری ماں کا حسن انتخاب ہے۔“

وہ زخمی سا ہنس کر آنکھوں کنارے رگڑ رہی تھی۔ شاید اندر خشک مہندی چلی گئی تھی۔

”مجھے آج کے لیے برداشت کر لو غیور۔۔۔۔۔ تمہارے بہت احسان ہیں مجھ پر۔۔۔۔۔ میں یاد رکھوں گی کہ میرا کوئی بھائی نہیں۔۔۔۔۔ اللہ نے ازل سے مجھے اس رشتے سے محروم رکھ چھوڑا ہے۔ تم ایک اچھے بھائی نہیں، ورنہ میرا بھائی کبھی بہن پروا نہ کرتا۔ کیا اپنی بہن کے عین دل پر وار کرو گے؟ نہیں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ وہ ”بہن“ ہوگی میں بہن نہیں!“

غیور نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔ جو سبز آنکھیں سر پر بھاتی بھاتی ہوئی دایہ جاری تھی۔ وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ زریں سچ کہہ رہی تھی۔ ایک جھولی سی کک نکلنے کے لیے اس نے دوسرے دل میں اپنے لیے دراڑ ڈال دی۔ اس شام کی طرح آج بھی زریں نے اس کے غلط فعل پر اسے طمانچہ جڑو دیا تھا۔ وہ باہر نکلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ریادداری میں تیزی سے گزر کر اپنے کمرے میں جاتی زریں سوچ رہی تھی۔

فصووار۔۔۔۔۔ غیور!

سزاوار۔۔۔۔۔ زریں!

بے قصور۔۔۔۔۔ شہریار!

کمرے کا دروازہ بند کرتے وہ ہانپ رہی تھی۔ موبائل ہنوز زمین پر گرنا سابقہ حالت میں پڑا تھا۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی ”بے قصور شہریار۔۔۔۔۔ مظلوم ہونہ!“ اس نے موبائل کا بیک کور کھولا۔ ”لقمان حیدر۔۔۔۔۔ محبتوں سے گندھا شخص۔۔۔۔۔ قابل اعتبار۔۔۔۔۔ مجھتوں کا امین اور شہریار نیازی۔“ فون کی بیٹری نکالی، سم چیکٹ سے آزادی اور آنکھوں کے سامنے کی۔ ”مجھے حق نہیں کہ تمہیں لقمان بے وفایت دوں، تم یہ بند میرے دل کے کواڑ لقمان کی دستک پر

# تبدیلی پروی



بن جاتی ہے۔“

”یہ محبت مجازی خدا سے ہو تو ثواب بھی بن جاتی ہے۔“

جنگلوں نے زریں کے جواب پر تالی بجا دی تھی۔ وہ جاں نثار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زریں شرمیلیں سکراہٹ سے کھلنے لگی۔

”تمہاری آنکھوں میں جتنو اچھے لگتے ہیں ان کی تعداد بڑھتی گئی تو تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا گاڑی حرکت میں آئی۔

”چھوڑ جاؤ گے.....؟“ خود یہیں رہ جاتی گے۔“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔ لقمان کی ہنسی کی پھوار نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ وہ پرسکون تھی اور بے حد تھی۔ فاصلے پر کھڑا غیور سدا چورنگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اپنی کو اذیت دینے والے اصل میں اپنی بیانی کے دشمن ہوتے ہیں۔ پھر جس سے عمر بھر وہ کسی اور کو دیکھ سکتے ہیں۔ نہ بھی خود کو.....!!

اور آک کے پودے جیسے لوگ کانٹوں سے عاری، نرم و ملائم، لیکن آک کا زہر یا دودھ انسانوں کی رگوں میں نفرت کا زہر بن کر دوڑتا ہے۔ یہ زہر کسی بھی قسم کا ہو۔ پھلے ذرا سی وجہ کا..... آپ کو اندھا کر سکتا ہے اور ساری کہانی اسی ایک بات کی تھی۔ وقت رخ سے رخ زہر بے اثر کر سکتا ہے۔

سوائے ایک زہر کے..... اور وہ ہے انسان کے اندر کا زہر، جسے اس کے علاوہ کوئی ختم نہیں کر سکتا..... انسان کے اپنے ظرف سے اگر یہ اندر نہ ٹھہر سکے۔ زندگی میں بے تسکونیاں ٹھہر ہی نہیں سکتیں.....“

☆

کھلنے کے خطر ہیں۔ تمہارے لیے کوئی روزن بھی باقی۔ کھلا نہیں رہ گیا۔“ دوا لقیوں میں دلی سم سلو میون میں اڑتی ہوئی ڈسٹ بن کے اندر جاگری تھی۔ ویسے ہی جیسے بھی شہر یا ر نیازی نے چھینکی ہوگی..... جیسے زریں کمال نے پھینک دی۔ ہر بوجھ سے وہ آج آزاد ہوئی تھی۔ کھڑکی میں جا کر چاند اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے پڑھ رہا تھا۔ اس کی حالت یوں جیسے۔

کتابوں میں ہی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی۔ اور جیسے.....

دل کے بند کواڑ کے پیچھے ساکت تھی۔

☆☆☆

رخصتی کے شور میں..... گیندے کے پھولوں کی خوشبو سارا ماحول معطر کر رہی تھی۔ سیاہ رات نے روشنیاں اوڑھ کر چاندنی پھیلا رکھی تھی ننھے ننھے جنگو ہوا کے تھ پر سوار بخور قصان تھے..... بہنوں کا شہزادہ لقمان حیدر..... محفل کی پری زریں لقمان حیدر.....! کوئی غیور کو لایا تھا۔

”بہن کو نیک و عاؤں کے حصار میں سفر پر روانہ کر دو.....“ سعدیہ اور ماما ماموں بڑے مان سے کہہ رہے تھے۔ زریں نے آنسو تیری آنکھوں سے اس سے نظریں ملائیں۔ غیور کا رخ بستہ ہاتھ زریں کے کھر درے عروسی لباس والے کندھے پر ٹھہر گیا۔ آچل سنھاتی دہ گاڑی میں بیٹھی۔ غیور ہٹ گیا۔ مہکاریں اڑا تا وجود اسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔

”رور ہی ہو؟“ معصومیت سے پوچھا گیا۔ ”خوشی ہے۔“ اس کی پھنسی پھنسی آواز بھینکی ہوئی تھی۔

”اسے اپنی محبت سمجھوں؟“ وہی چھٹی تافترہ اور ایسی معصومیت زریں نے بلا میں لے لی چاہیں۔

”سمجھ لو۔“

”کسی نے کہا تھا محبت غیر محرم سے ہو تو عذاب

شادی کی پہلی رات ہی وہ جان گئی تھی کہ کچھ ایسا ہے جو نارمل نہیں ہے لیکن شرم و حیا نے اس کی زبان پہ تالا لگا دیا تھا اور یہ تالا بے باکی و بے شرمی کی چابی سے ہی کھل سکتا تھا۔ وہ اپنے اندر اٹھتے دوسوں کے سر چلن چل کر تھک چکی تھی لیکن سوالوں کے ساتھ دوسرے تھے کہ ناگ بن کر اسے ڈرتے ہی جا رہے تھے وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ خاموشی کے اس قفل کی چابی اسے نہ ملے تو یہ زہر اس کے رگ و پے میں پھیل کر اس کے سارے وجود کو نپلا کر دے گا۔ اسے خیال آیا کہ ہمارے ہاں عورت یہ چابیاں دل کی تجوری میں رکھ کر اوپر سے اک اور تالا لگا دیتی ہے اور وہ تالا ہوتا ہے مصلحت اور سمجھوتے کا تالا اس تالے کی بھی اک چابی کبھی ہوتی ہوگی لیکن زیادہ تر عورتیں یہ چابی جان بوجھ کر کہیں رکھ کے بھول جاتی ہیں۔

ورنہ تو کشیدہ چیز کے لیے ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھو تو مل جاتی ہے مگر کوئی عورت اس چابی کے لیے نہیں پڑھتی۔ زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے..... مصلحت اور سمجھوتہ ہی تو عورت کا زوراء ہوتا ہے۔

☆☆☆

وہ یعنی کہ جاناں فرید خان..... قربان علی کی تیسری بیوی تھی۔ قربان علی چار جوان بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا پہلی شادی ماں بہنوں کی مرضی سے ہوئی اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے مہینے ہی سے بچے کی امید کیوں نہیں ہوئی؟ کی تکرار شروع ہو گئی تھی اور یہ تکرار ساس اور نندوں کی جانب سے بھی جن کے سارے ارمانوں کا مرکز قربان علی تھا۔ تیسرے مہینے بھی جب ڈرتے ڈرتے شرمندہ سی بھابھی نے ناامیدی کی خبر دے لفظوں میں سنا دی تو شہر کی سب سے بڑی گاٹا کالوجسٹ کے چکر شروع ہو گئے۔ پہلی بار ڈاکٹر صاحب نے اس شرمیلی سی کم عمر لڑکی سے جب یہ پوچھا کہ شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟ تب نظریں جھکا کر کنول نے بتایا کہ دو مہینے تو وہ چنکلیں۔

یہ پہلا کیس ہے بی بی کی شادی کو ابھی دو مہینے ہوئے اور سرسرا والوں کو تکلیف ہونے لگی ہے۔ کی۔ وہ خود گلای کے انداز میں بولیں۔

انہوں نے اسے لینے کا اشارہ کیا اور اس کے چپک اپ کے بعد حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

”تم تو شادی شدہ نہیں ہو؟“ وہ مشکوک ہی اسے دیکھ رہی تھیں۔ کنول گھبرا کر رونے لگی۔ ”مجھے بتاؤ سب سچ سچ، دیکھو تم میری بیٹی جیسی ہو اور ڈاکٹر سے کچھ نہیں چھپاتے کیونکہ ان سے کچھ چھپانا یا غلط بیانی اپنا نقصان کراتی ہے۔“ ڈاکٹر صبا کو اس پر رحم آ رہا تھا اسے لیے سمجھا رہی تھیں ورنہ ان کا ایک ایک منٹ بکنا تھا اور اس وقت بھی خواتین کی ایک بڑی تعداد انتظار گاہ میں اپنی باری کی منتظر بیٹھی تھیں۔

”اماں کہتی ہیں اچھی بیویاں اپنے شوہروں کی عزت کا خیال اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر رکھتی ہیں۔“ وہ ڈرتے ڈرتے مصحوبیت سے کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر صبا نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”بیٹی! بلاؤ اپنی ساس کو کہ میں ان کو سمجھاؤں، جانے کیوں یہ مائیں بیٹوں کی باری میں کم عقل اور نا سمجھ بن جاتی ہیں۔“ وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھی، خوف زدہ انداز میں جلدی سے بولی۔

”خدا کے لیے ڈاکٹر نی صاحبہ! ان کو نہ بتائیں میں آپ کی منت کرتی ہوں۔“ وہ گڑ گڑانے لگی مگر قربان علی کی ماں اسی اثنا میں اندر آ چکی تھی۔

ڈاکٹر نے ساری رپورٹس اسے تھمائیں وہ ساکت سی کھڑی خوف زدہ نظروں سے اپنی ساس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

”بی بی یہ آپ کی بہو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو کل ٹیسٹ کے لیے بھیج دیں۔“ ڈاکٹر کا سخی انداز ساس کو تپا گیا۔

”مگر..... مگر..... وہ تو بیٹی شیر جوان ہے۔ اونچا لمبا مرد ہے میرا بیٹا! اسے کوئی بیماری نہیں۔ بکواس کرتی ہے یہ..... بد بخت ہے۔“ ڈاکٹر کے سامنے ہی

ساس نے کنول کے زرد کلائے ہوئے چہرے پہ غصہ سے بھر پور ایک نظر ڈالی اور ہاتھ سے پکڑ کر پون گھسیٹے ہوئے باہر لے گئی جیسے وہ انسان نہ ہو آئے کی پوری ہو۔ ڈاکٹر افسوس بھری نظروں سے اسے گھسیٹتے ہوئے دیکھ رہی تھیں، مگر پہنچتے ہی اس نا انشیز عورت نے ایسا گھسان کارن ڈالا کہ ماں بیٹیوں کی جنہیں سارا محلہ سنتا رہا۔ قربان علی یوں ملا متی انداز میں اسے گھورے جا رہا تھا جیسے سارے قصور اسی کے ہوں۔

”اماں میں اپنے رب کی قسم کھاتی ہوں میں نے کچھ نہیں کہا، ڈاکٹر نی خود ہی سمجھ گئی تھی۔“ وہ منمنائی مگر قنار خانے میں توئی کی آواز کون سنتا؟

”ارے کم بخت! اگر غیرت مند ہوتی تو شوہر پہ یوں تہمت لگانے سے پہلے زہر کھا کے مرجاتی۔ غیرت والیاں تو خود کشی کر لیتی ہیں۔ تم تو چلو بھر پانی میں ڈبے سے بھی ڈرتی ہو۔“ ساس کی اس بات پہ اس نے باری باری سب نندوں اور پھر شوہر کو دیکھا مگر سب تانیہی نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اچانک ایک فیصلہ کر کے صحن سے بھاگتی ہوئی گودام میں گھس گئی اور جب باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں گندم میں رکھی زہریلی گولیاں تھیں۔

محلے میں اک عورت نے شوہر کی دوسری شادی سے دل برداشتہ ہو کر ایسی ہی گولیوں سے خود کشی کی تھی۔ تب کنول گلی میں کھیلے ہوئے میت والے۔ گھر میں گھس گئی تھی۔ آج بھی اسے یاد تھیں ان باجی عذرا کی وہ بچٹی بچٹی آنکھیں، سفید کفن میں بیٹلا چہرہ۔ اس نے گولیاں ہاتھ میں پکڑ کر سب کو دکھائیں۔

”میں..... میں..... یہ ساری کھا کر خود کو ختم کر لوں؟ تب تو میری بے گناہی کا یقین کر لو گے نا آپ لوگ؟“ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ آواز بھی لرز رہی تھی اور آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے رداں تھا۔ وہ بزدل سی موت سے ڈرنے والی لڑکی ایک ایک گولیوں دیکھ رہی تھی جیسے بزبان خاموشی کہہ رہی ہو خدا کے لیے مجھے روک لو لیکن کسی نے نہ روکا۔

ایک بل کو اسے پانی سے گولیاں نکلتے دیکھ کر قربان نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ماں کی غضب ناک نے اس کے قدموں میں زنجیر پھنسا دی۔

☆☆☆

کنول کا جنازہ اٹھتے ہی ماں بہنوں نے قربان کی دوسری شادی کے لیے کھسر پھسر شروع کر دی تھی۔ دوسری بیوی بھی تیسرے مہینے ڈاکٹر صبا کے روبرو تھی۔

”جی دو مہینے ہو گئے ہیں شادی کو۔“ ڈاکٹر نی نے اسے گھورا۔

”ایسی ہی ایک لڑکی کچھ مہینے پہلے بھی آئی تھی میرے پاس..... کیا ہو گیا ہے اس معاشرے کو اللہ تعالیٰ یہ توکل ہے نہ ایمان کامل ہے۔ بس تیسرے مہینے ہی ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی اسے چپک کرنے لگیں۔ ساس کی خراش شکل دیکھتے ہی وہ پیچان گئیں اور ساری کہانی بھی سمجھ گئیں، ڈاکٹر نے ساس سے پوچھا۔

”پہلی والی کا کیا ہوا؟“

گہرا طنز تھا ڈاکٹر نی کے سبب میں۔ انہیں لگا زیادہ سے زیادہ اس غریب کو طلاق ہی دے دی ہوگی موت کا تو اندیشہ ہی نہیں تھا۔ کیونکہ بہت صحت مند اور کم عمر تھی وہ۔

”جی ڈاکٹر نی صاحبہ! اسی دن خود کشی کر لی تھی اس کلبوہی ڈاکٹر نے، اپنی آخرت بھی خراب کر لی اس نے۔“

”مگر کیوں؟“ ڈاکٹر نی کی آنکھوں کے سامنے اس معصوم کا گڑ گڑاتا ہوا چہرہ آ گیا۔

”ارے پیچھتاوا تھا کہ آپ کے سامنے شوہر پہ کیوں جھوٹا الزام لگایا۔ ملامت کے مارے خود کشی ہی کر لی تھی۔“ ڈاکٹر نے افسوس بھرے انداز میں سامنے بیٹھی ایک اور کنول کی طرف دیکھا جس کا نام تو میمونہ تھا مگر مصحوبیت بالکل وہی تھی جس کے قتل میں خود انہوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا۔

ڈاکٹر نی نے ایک لمحہ کچھ سوچا اور جھوٹ بول کر

# تبت ٹالکم پاؤڈر



اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک



سلیکٹ



لکڑی

تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام ہلکے مہکائے

چھپائے یہ بیماری سی لڑکی اچھی زندگی کی تلاش کا حاصل سمجھ رہی تھی قربان علی کو۔  
وہ اس کے آس میں سکر بیڑی کی جاب کرتی تھی قربان علی نے ماں بہنوں کی شادی کی غمراہ سے تنگ آ کر ایک دن جاننا فرید کا نام لے لیا۔  
جاناں..... قربان علی کی دولت اور شان دیکھ کر بخوشی اس شادی کے لیے مان گئی تھی۔

حالانکہ ایاز احمد اس کی خالہ کا خوبرو بیٹا بہت چاڑ سے اپنی اماں سمیت اسے پاٹنے آیا تھا لیکن جانناں بہت پریکٹیکل مائینڈ کی لڑکی تھی۔ اسے چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ترس ترس کر باقی کی زندگی گزارنے سے ڈر لگتا تھا۔

ایاز احمد بہت بااوس تھا اپنی غربت پہ افسردہ بھی تھا مگر جانناں مطمئن تھی اپنے فیصلے پہ لیکن شادی کی رات کے انکشافات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اب اسے تاریخ دہرائی پہنہ ہتھار ڈالنے ہیں بلکہ اس نے اسی رات کچھ فیصلے کر لیے تھے اور ان فیصلوں میں ایک نئی تاریخ رقم کرنے کا فیصلہ بھی تھا۔ دوسرے مہینے سے اولاد کی خواہش کی تاریخ دہرائی جانے لگی تھی۔

قربان علی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑی ڈھٹائی سے اسے گانا کالو جسٹ کے پاس لے جانے والا اماں کا فیصلہ سن رہا تھا۔  
وہ ساکت سی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”گھر میں تو بالکل ٹھیک ہوں، علاج کی ضرورت تو آپ کو ہے اور یہ بات اگر آپ کی ماں بہنیں نہیں جانتیں تو آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں نا؟“ اس نے جلتا یا تو..... اس بات پہ قربان علی کا بہت زور کا پھیر اس کے گال پہ نشان چھوڑ گیا تھا اور جانناں ایک ہاتھ سے گال ملتے ہوئے اسے کمرے سے باہر جانا دیکھ رہی تھی۔

”مجھے طلاق چاہیے۔“ وہ کمرے میں دایس آیا تو جانناں فیصلہ کر چکی تھی۔ ایاز احمد کی مختصر نگاہوں کا

ایک معصوم جان بچانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ جان بچانا ہی تو ان کا نصب العین تھا چاہے جس طریقے سے پورا ہوتا۔ انہوں نے ٹیسٹ دراز میں رکھ کر کہا۔

”سب ٹھیک ہے، بس دعا کریں جب بھی رب کو منظور ہوگا دامن خوشی سے بھر جائے گا۔“  
میمونہ نے شکر گز اور نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔  
وہ بھی ان چند مہینوں میں کنٹرول کی موت کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی اور ڈاکٹر کا ہنا کچھ پوچھے سب کچھ جاننے کا خوف۔ اسے ڈرا بھی رہا تھا اس نے یہاں آنے سے پہلے جیکے سے اسٹور میں جا کر گندم میں رکھی جانے والی گولیاں بھی فلیش میں بہا دیں تھیں لیکن وہ جس جان کے بچ جانے پہ ڈاکٹر کی شکر گز رہی۔ اس جان کو اب بھی بہت کچھ سہنا تھا موت سے بھی زیادہ اذیت ناک۔ ایک بچے کے نہ ہونے کو لے کر گھر میں وہ حالات بنا دیے گئے کہ رات بھر شوہر کی بیماری سانپ بن کر ڈتی اور دن بھر اس کی سزا میں زہریلی باتوں کا زہر اس کی رگوں میں اتارا جاتا رہتا۔ سخت جان تو تھی مگر دو روز ہرل کے اسے بھی مار گئے۔ اس نے گندم والی گولیاں نہیں کھائیں مگر کفن میں لپٹا چہرہ پھر بھی نیلا تھا۔ درد کا زہر قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں اترتا رہا اور اسے تھوڑا تھوڑا کر کے روز مارتا رہا تھا۔ عورتیں میت پہ چہ گوئیوں میں مصروف تھیں۔

”ہائے..... دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی بے چاری کی۔ اولاد کے لیے ترس رہی تھی، بچے نہ ہوں تو کون سا شوہر یا سسرال عزت دیتا ہے عورت کو؟“  
دوسری نے ہاتھ مل کر کہا۔  
”عزت کے لیے ہی تو ترس ترس کر مری ہے۔“

☆☆☆

اور اب آئی تھی قربان علی کے گھر جانناں فرید! زندگی سے بھرپور یہ لڑکی بہت سے خواب آنکھوں میں سجائے قربان علی کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کی ہزاروں خواہشات دل میں



تصور اسے اس فیصلے پر جسے رہنے کا حوصلہ دے رہا تھا عیش و عشرت نہ سہی لیکن ایک نازل ازدواجی زندگی تو وہ اسے دے سکتا تھا۔ رات بھر کی سوچ کے بعد صبح کی پہلی کرن جیسا فیصلہ لگا تھا اسے۔ اس طرح اس کے سارے خوابوں کو بھی تعبیریں مل جاتیں کیونکہ قربان علی سے طلاق کی صورت میں اسے بہت کچھ ملنے کی امید تھی۔ قربان علی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”جاناں بیگم ہوشیار نہ کرو جاکیں تو لہ سونا دس لاکھ روپیہ اور کئی جریب زرعی زمین لکھوائی ہے حق مہر میں تمہارے باپ نے۔ میں تمہیں طلاق دوں گا؟ تاکہ تم جا کر نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کر دو۔ کیوں پاگل ہوں میں؟“ وہ ششدری اسے دیکھ گئی اس کی حالت اس وقت جال میں پھنسی پھلی جیسی ہو رہی تھی بالآخر اسے ہار مان کر ڈاکٹرنی کے پاس جانا ہی پڑا۔ ڈاکٹر صبا نے اسے ساس کے ساتھ دیکھ کر افسوس بھرے انداز میں ایک آہ بھری اور ساس کو کمرے سے نکال دیا۔

”بیٹی! مجھے ضرورت نہیں کہ تمہارا معائنہ کروں کیونکہ میں جانتی ہوں تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور تم سے پہلی والیوں کے ساتھ کیا ہوا ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“ وہ اطمینان بھرے انداز میں مسکرانے لگی۔

”نہیں ڈاکٹر صاحبہ! اب کی بار تاریخ و ہرانی نہیں جائے گی بلکہ ان شاء اللہ تعالیٰ نئی تاریخ رقم ہوگی۔ میں جاناں ہوں، کنول بی بی یا میمونہ کل نہیں۔“

اس کی مضبوط آواز میں کیا گیا مصمم ارادہ اور اس کی چمکتی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خود کو بچالے گی۔ ڈاکٹر صبا نے مسکرا کر کہا۔

”شباباش بیٹی! عورت صرف ظلم سہنے کے لیے دنیا میں نہیں آئی، ہم چپ چاپ ظلم سہہ کر، ظالم کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں، اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمیں اپنی سوچ بدل کر ہی اپنی زندگیاں بچانی ہوں گی۔ انسانوں کے اس معاشرے سے جنگل کے قوانین کا

خاتمہ کرنا ہوگا۔ میری ضرورت جب بھی پڑے مایوس نہیں کروں گی۔ بس زندگی کے لیے سانس تک مقابلہ کرنا، ہار مان لینے والوں کا اس دنیا بہت برا کرتی ہے۔ ہار نہ ماننا بھی کچھ جیت تو ہم ہار جانے کے خوف کو ہار کر حاصل ہیں۔“ وہ ان کا شکریہ ادا کر کے ہنسی مسکرائی باہر آئی۔ گھر پہنچ کر ساس نے بیٹے کو خوش خبری سنائی۔

”ڈاکٹر نے پہلی بار امید دلائی ہے کہ اسے اچھی خبر ملے گی۔“ جاناں نے دیکھا قربان علی کی بات کے رد عمل میں نظرس چرائے اپنے واٹوں سے کاٹ رہا تھا۔ وہ مسکرا کر اندر چلی گئی ابھی شادی کو پانچواں مہینہ لگا تھا کہ ساس دے لفظوں میں اندر کا حال پوچھا تو جاناں شرباتے ہوئے جو بتایا وہ ساس نندوں کو سرشار اور قربان علی کو بے قرار۔ تنہائی میں اس کے کچڑ کر بے دردی سے ہنپتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”یہ کیا ڈرا رہے کر رہی ہو؟“ ”کچھ نہیں۔“ وہ درد سے کراہتے ہوئے رہی تھی۔ ”ڈاکٹر نے طاقت کی گولیاں دی تھیں کی وجہ سے طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔ اس چھوڑ دیے تھے مگر جاناں کو درد اب بھی ہو رہا دوسری صبح کی ابتدا ہی ایسی تھی کہ قربان علی ٹھنکا۔

وہ داش روم میں الٹیاں کر رہی تھی اور آواز باہر تک آ رہی تھی۔ وہ کچھ دن سے کھانا نہیں کر رہی تھی۔ دو چار دن گزرے تو ساس ڈاکٹر صبا کے کلینک لگے۔

ڈاکٹر نے پریکٹسی ٹیسٹ اسے کھانا اور اس کی ساس کو اندر بلایا اور مبارک ہا۔ ”بہت مبارک ہو بی بی! تمہارا ارمان ماننے پورا کرنے کی امید پیدا کر دی ہے۔“

ابا، جاناں کے والدین کو بھی بلالیا آخر اتنی بڑی خوشخبری تھی کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ قربان علی کا منہ میٹھا کر کے جو خبر اسے سنائی گئی تھی۔ ٹیسٹ کی رپورٹ سانسے میز پر پڑی تھی۔ وہ اسے آسمان کی بلندی سے پاتال کی پستی تک لے گئی تھی۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جاناں ناخوشانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ آگ بگولا ہو گیا۔

”یہ جھوٹ ہے۔۔۔ بدچلن عورت کس سے منہ کالا کر کے آئی ہو؟ جلدی سے بتاؤ۔“ وہ حسبِ مادت اس کے بال ٹٹھی میں پکڑ کر کھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”کس کا گناہ تمہاری لکھ میں میرے نام سے ہل رہا ہے؟“

کمرے میں موجود سب ہی لوگ نہ سمجھنے والی کیفیت میں یہ سب دیکھ رہے تھے۔ آخر جاناں کا باپ اٹھا اور تکلیف سے تڑپتی بیٹی کے بال چھڑانے لگا۔

”کیا قصور ہے میری بیٹی کا؟“ وہ غریب ضرور تھے مگر بے غیرت نہیں تھے کہ چپ چاپ دیکھتے رہتے۔

”یہ بدکردار ہے اماں! اس کے پیٹ میں میزا ہے نہیں کسی اور کا گناہ ہے۔“ اماں سے پہلے ہی وہ ہل پڑی۔

”ثبوت کیا ہے تمہارے پاس قربان علی؟“ وہ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔

”فاحشہ ثبوت مانگی ہو مجھ سے؟“ وہ منہ سے ہماگ نکالتے ہوئے، غصے سے بھرا ہوا دوڑتا ہوا اندر گیا اور ایک پل میں ایک فائل ہاتھ میں لیے واپس آ گیا۔

”یہ لو، یہ دیکھ لو ثبوت۔“ اس نے فائل سامنے رکھی۔

”میں بھی باپ نہیں بن سکتا، ڈاکٹر نے مجھے

جواب دیا ہوا ہے۔“ ایک پہاڑ تھا جو کمرے میں موجود لوگوں کے سر پہ گرا۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔

بڑی بہن نے شادی شدہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فائل اٹھا کر پڑھ لی۔ جاناں سر جھکائے کھڑی تھی، اس کے باپ نے بھی سر جھکایا ہوا تھا۔ جاناں نے چپکے سے سب کی نظر بچا کر ڈاکٹر صبا کو مسد کال دی۔

”غلیظ عورت۔۔۔۔۔ بدچلن فاحشہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔۔۔۔۔ طلاق۔۔۔۔۔ طلاق۔۔۔۔۔“ قربان علی چیخا۔ جاناں کے والدین نے سر پکڑ لیے۔

”ہائے قربان علی! یہ کیا کر دیا۔“ ”ساری دولت دے دی اس بدچلن کو۔۔۔۔۔“

”لغت بھیجتا ہوں اس پہ بھی اور اس دولت پہ بھی۔“ وہ دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

”تیرے جیسی گندی عورت کو اس گھر سے نکالنے کے لیے میں دولت جائداد سب کی قربانی دیتا ہوں۔“ اسی اثنا میں قربان علی کے موبائل پر بنگ آئی مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ کال ریسیو کرتا۔ بڑی کا شوہر بھی کمرے میں موجود تھا۔

اس نے میز پر رکھا فون اٹھایا۔

”جی ڈاکٹر صبا فرمائیے؟“ ”کیا؟“ دوسری طرف کی بات سن کے اس کے ہاتھوں سے فون گر گیا۔ وہ بت بنے سب چہروں کو باری باری دیکھ کر جو بولا، اس نے کمرے میں موجود سب ہی لوگوں کو بوکھلادیا۔

”ڈاکٹر صبا کا فون تھا وہ کہہ رہی تھیں کہ جاناں زونہ عزیز گل کی ٹیسٹ فائل جاناں قربان علی کے ساتھ بدل گئی ہے۔ یہ غلطی لیبارٹری والے کی ہے پلیز آپ آ کر اپنی فائل لے جائیں۔“ انھوں نے کہا ہے کہ جاناں قربان علی کی پریکٹسی رپورٹ ٹیکو ہے۔“

جاناں اس نار چریل سے واپس گھر جاتے ہوئے ڈاکٹر صبا کو شکریہ کا بیج کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆☆

# آئینہ سرائے

حرامصور لڑکی نہیں اک ستارہ تھی جو ٹوٹ کر  
دہانچ ہاؤس میں آگرا تھا۔ حرامصور ماہ جبین پھوپھو کی  
بچی تھی۔ وہ پھوپھو جن کو اس گھر کے بچے صرف نام  
اور تصویروں کی حد تک جانتے تھے۔ جن سے ناراض  
ہو کر دادا نے بھی نہ ملنے کی قسم کھا کر بانی سب کو بھی  
اسی قسم کا پابند کر دیا تھا۔ پہلے دادا اس قسم کا بو جھ لے کر  
مٹی تلے جاسوئے اور اب دو دن پہلے پھوپھو سب  
رشتوں کو اس قسم سے آزاد کر گئی تھیں۔

حرامصور نے جب دہانچ ہاؤس میں قدم رکھا  
تو ایک بار تو سب کو ہی چونکا دیا تھا۔ پھر چاہے وہ تک  
چڑھی علیحدہ ہی یا خود پرست عبدالباسط۔ بانی تو سب  
کسی کھاتے میں ہی نہیں آتے تھے۔ اصل میں کم و  
بیش سب کی سوچ اس کے آنے سے پہلے تک یہی تھی  
تھی کہ جس کی ماں کا ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا،  
پسماندہ علاقے کی وہ لڑکی جس نے رشتے کے نام پر  
صرف ماں ہی ماں دیکھی تھی اور اب وہ بھی نہیں  
رہی، ناباپ نا پھائی۔ کیسی دبو ہوگی۔ ڈری سبھی اوھر  
اوھر آنسو بہائی، چھپاتی پھرے گی۔ جھوٹے اور  
کھوکھلے ہی سبھی۔ دلا سے بھی دینے پڑیں گے۔ لیکن  
اس نے ان سب کے اندازے غلط ثابت ہو گئے  
تھے۔ وہ اندازے بھی جو انہوں نے لگائے ہی  
نہیں تھے۔

بڑے پاپا کی گاڑی سے نکلنے والی لڑکی مردانہ  
ٹراؤڈر شرٹ میں دوپٹے سے بے نیاز خشک آنکھوں

گزرتے دنوں میں سب کی ناپسندیدگی جاننے  
لیے ایسے ریاضی کے کسی فارمولے کی ضرورت  
نہیں پڑی تھی۔ علیحدہ کامتکیر لہجہ، عبدالباسط کی نظروں  
میں تحقیر، رابی اور فریال کا عجیب نظروں سے اسے  
لانا۔ اسے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونے دیتا تھا۔  
بین کارویہ متوازن تھا۔ لیے دیے سے انداز والی  
ہن اس کے ساتھ اچھی نہیں تھی تو بری بھی نہیں تھی۔  
پیری لا ابالی بے پردا شرارتی سازندہ دل لڑکا تھا۔  
اسے اس کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ باقی رہا  
ایمان تو شاید اسے ہی اس کے آنے سے سب سے

زیادہ فرق پڑا تھا۔ گندی رکبت اور عام سے نقوش  
والے ذیشان حیدر کو اس گلابی شمش نے بنا ڈور اپنی  
طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی نظر کی محبت وہ بھی لا  
حاصل۔ وہ جانتا تھا لا حاصل ہے اس کی چاہت اور  
اس کے باوجود اسے خود برا اختیار نہیں تھا۔  
وہ اپنی ماں کی حرا کے لیے ناپسندیدگی جانتا تھا  
اور وہ خود بھی کبھی ان کا اتنا پسندیدہ نہیں رہا تھا کہ اس  
کی خوشی کی خاطر ہی ماما حرا کو قبول کر لیتیں۔ شہندی  
مٹی سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ ضد سے بات منوانا، اپنی  
بات پراڑنا۔ اسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ جب ہی تو وہ



کے ساتھ پر اعتمادی اندر آ رہی تھی۔ کمر کے آدھ  
آتے بال بے ترتیبی سے پونی میں قید تھے۔ آنکھوں  
پر بڑے بڑے شیشوں والی عینک چڑھائے وہ  
سب کو کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس  
کے ٹکین کتنے ہی ماڈرن کیوں نہیں تھے۔ لڑکیاں  
طرح کا فیشن کرتیں، دوپٹے چاہے کندھے پر یا  
طرف پڑے رہتے، بیصیں چاہے اسی چست ہو  
کہ بدن کے نشیب و فراز مایے جاسکتے۔ پھر بھی  
پھر بھی اس گھر میں ایسے لباس کا تصور بھی کوئی نہیں  
سکتا تھا۔ وہ اس گھر کے لیے ناقابل قبول تھی۔ پھر  
چاہے کچھ بھی تھی اور اس بات کا اندازہ اسے پہلے  
دن ہو گیا تھا۔ بڑے ماموں کے پیچھے لاؤنج  
نکلے ہوئے اس نے سنا تھا۔

”میں حیران ہوں جبین نے اس لڑکی کی  
تربیت کی ہے۔ لباس تو دیکھو ذرا۔ بانی آنے  
وقت پتا نہیں اس لڑکی کے کیا کیا کرتوت دکھا  
گا۔“

یہ چھوٹی مامی کی آواز تھی۔ کسی کی بھی ہوتی  
فرق پڑتا تھا۔ اندر سے آنے والی تائیدی آواز  
سے اس نے جان لیا تھا۔ انہوں نے تو اتنا بھی  
نہیں کیا تھا کہ ابھی دو دن پہلے اس نے ماں  
ہے۔ اس کا دل کچھ اور مضبوط ہوا تھا۔ ذہنی طور  
آنے والے ہر برے حالات کے لیے پہلے سے  
تھی۔ بہر حال دکھ پھر بھی اسے ہوا تھا۔

ہمیشہ زینب کے عتاب کا نشانہ بن رہا۔ عبدالباسط اس سے چھوٹا اور بے جا ضدی تھا۔ بچپن میں اسے وہی کھلونا چاہیے ہوتا تھا جو ذیشان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ذیشان چپ چاپ اسے کھلونا دے دیتا۔ کوئی لڑائی جھگڑا، رونا دایلا کچھ نہیں۔ زینب چاہتی تھیں وہ اپنی چیزیں اسے نہ لینے دیا کرے۔ شروع میں وہ اسے اکیلے میں سمجھاتی تھیں لیکن وہ اپنی فطرت کا کیا کرتا۔ ایک تو واجبی سی شکل و صورت اور اس پر مزاج بھی ایسا ٹھنڈا۔ زینب کو ذیشان کی صلہ پسند فطرت اس کی باسط سے ہار گئی تھی۔

باسط اکھڑ مزاج اور شہنشاہ فطرت تھا۔ اللہ نے شکل بھی شہزادوں کی عطا کی تھی اور مزاج بھی۔ اس کے سامنے ذیشان کی شخصیت ویسی جانی جاتی تھی۔ یہی بات زینب کو برداشت نہیں ہوتی تھی۔ پتا نہیں کیوں ان کے اندر جھگڑائی کے بیٹے کے ساتھ اپنے بیٹے کا موازنہ چلتا رہتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ذیشان کو پیٹنے سے بھی گریز نہ کرتی تھیں۔ جب علیہ ان کی گود میں آئی تو جیسے ان کا اندر ٹھنڈا ہوا تھا۔ وہ لڑکی ہو کر باسط سے بھڑ جاتی تھی۔ ہاں وہی تو اس کی نگر کی تھی۔ زینب کی ساری توجہ علیہ نے لے لی تھی۔ مزاج کی تندگی اور ماں کی شہ نے اسے حد سے زیادہ خود مہیا دیا تھا۔ ذیشان کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ بیٹا ہو کر بھی وہ ماں کی نظر میں کچھ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بعد میں آنے والی فریال بھی ان کی توجہ علیہ سے ہٹانے میں ناکام رہی۔ وقت گزر گیا وہ بڑے ہو گئے لیکن مقابلے کی فضا ختم نہیں ہوئی۔ مضامین کے انتخاب سے لے کر ملنے والے گریڈ تک۔ وہ کہیں بھی ماں کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ ہاں ایک بات ایسی تھی جس پر زینب نے پہلی بار اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ باسط نے پڑھائی پوری کرنے کے بعد نوکری کو ترجیح دی تھی جب کہ وہ گھر کے مشترکہ کاروبار کی طرف چلا آیا تھا۔ اس سب کے بعد دل میں اک موہوم سی امید رہی تھی کہ شاید..... پہلی بار وہ اپنی کوئی خوشی حاصل کر لے۔ وہ خوشی جو ایک دم سے زندگی بن گئی تھی۔

☆☆☆

”حرام نام کی بلا لگتا ہے مرنے کے بعد میں سکون نہیں لینے دے گی“ علیہ کی آواز دور کے پیچھے سے ابھری تھی۔ چوری چھپے باتیں سننے تو اسے عادت تھی اور ناشوق۔ اپنا نام سن کر ازخود کے قدم دبلیز پر رک گئے تھے۔

”کیا ہوا؟“ سین نے پوچھا۔

”ہونا کیا ہے، دادو نے عذاب ڈال دیا میرے گلے۔ ساری پرائیویسی ختم ہو کر رہ گئی۔ اول تو اس کا اعکاف ہی ختم نہیں ہوتا۔ سارا کمرے کی جان نہیں چھوڑتی۔ اب اگر کمرے نکلی ہی تھی تو میں نے سرمد کو اس کا پتہ پکال کر میڈم بغیر ناک کیے کمرے میں آدھمکی۔ جس سے یہ گھر آئی ہے میری سرمد سے بات ہی نہیں رہی۔ تنج یہ پڑھا دیتی رہی ہوں۔ اس کا اتنا موڈ بنا تھا۔“ علیہ کا موڈ نے حد خراب ہوا تھا۔

سین کے کچھ کہنے سے پہلے وہ کمرے داخل ہو گئی۔ علیہ نے جتنی سی ایک نظر سین پر ڈالی یوں جیسے کہہ رہی ہو ”میں نے سچ کہا تھا۔“

ای کی تصویروں کا البم اپنے بیک میں رکھ کر ایک دوستانہ مسکراہٹ ان دونوں کی طرف اچھا کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ اس نے کچھ نہیں سنا۔ باہر نکل کر ایک گہری سانس بھر کر اندر کی ٹھنڈی ہوا کا لطف خود کو تار کرتے وہ دوبارہ نانو کے کمرے میں گئی۔ آخر اپنے محسنوں کی خاطر اتنا تو وہ برداشت ہی سکتی تھی۔ اسے تو یوں بھی کسی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اکیس برس پہلے ناراضی کی چھاؤں تلے رہنے ہونے والی بیٹی کو ساری عمر جنہوں نے گھر کی دہلیز میں چڑھنے دیا۔ اس کی بیٹی کو گھر کا تحفظ دینے والوں کی گویا بال بال مقررہ صحت تھی۔ یہ ترض اس نے خود اپنے کندھوں پر ڈالا تھا۔ زندگی نے اسے انتخاب سہولت دی تھی۔ اس گھر میں آنا اس کی اپنی مرضی کی مجبوری نہیں۔

یہ اسی شام کی بات ہے جب وہ علیہ کے ارے میں بیٹھی آنے والے سخت سے سخت حالات کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی تب ایک دم باہر شور بلند ہوا۔ علیہ کے ساتھ وہ بھی تیزی سے باہر بھاگی۔ نانو اوندھے منہ فرش پر پڑی تھیں۔ ان کے کرنے کی آواز سن کر آنے والے بڑے ماموں اور بی بی لکڑی کر انہیں اٹھا رہے تھے۔ نانو کی سال سے مانج کی مریضہ تھیں۔ کھانے پینے سے لے کر زندگی کی تمام تر ضروریات کے لیے وہ دوسروں کی محتاج تھیں۔ کئی بار ان کے لیے کل وقتی ملازمہ رکھی گئی لیکن کوئی بھی ایک ڈیڑھ ماہ سے زیادہ نہیں نکلتی تھی۔ یہی وہ خود چھوڑ جاتی تو بھی ماموں کو اس پر اعتراض ہوتا۔ بھی نانو خود ہی کسی بھانے نکال باہر کرتیں۔ انہیں ستر لٹا کر ماموں ان سب کی طرف متوجہ ہوئے جو شور مچا رہے تھے۔

”ہزار بار کہا ہے اماں کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی رہا کرے۔ لیکن میری منتا کون ہے۔ اب جب تک نئی ملازمہ نہیں آجانی سب باری باری اماں کے پاس بیٹھا کریں۔ رات کو میں خود ان کے پاس سو جاؤں گا۔ میں اماں کو اکیلا نہ دیکھوں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ غصے میں تھے۔

ان کی بات پر اکثر جینیوں پریشانیوں کے حال بچے تھے۔ کئی آنکھوں میں ناگواری کی لہریں اٹھنے لگی تھیں لیکن پروا کسے تھی۔ تب ہی دو قدم بڑھا کر وہ ماموں کے پاس ہوئی تھی۔ ”اگر مناسب سمجھیں تو مجھے نانو کے پاس شفٹ کر دیں، میں پوری کوشش کروں گی کہ ان کا خیال رکھ سکوں۔“

اس کی بات اتنی غیر متوقع تھی کہ ایک بار تو سب ہی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ ماموں کے رکی اور کھوکھلے اعتراض رد کرتے اس رات وہ نانو کے کمرے میں بچ بیک منتقل ہو گئی تھی۔

اس کے آنے کے بعد یہ پہلی رات تھی جب علیہ سمیت اس گھر کی باقی عورتوں نے بھی اس سے فیصلے کو سراہا تھا۔ اس کی موجودگی پر اطمینان کا سانس

لیا تھا۔ ورنہ ایک مفلوج بوڑھی عورت سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اور اگر دلچسپی ہوتی تو کیا نوکرانی کا ہی آسرا ڈھونڈا جاتا۔ اس کمرے میں وقت گزارنا ایک قیامت تھی اور یہ قیامت حرامصنوع نے خود پہ روک لی تھی۔ سب کا شکر گزار ہونا تو بنتا تھا نا۔

☆☆☆

جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی بس کمرے تک محدود تھی۔ سین اور علیہ جب خود کھانا کھاتیں تو اس کے لیے بھی لے آتیں۔ اس نے کچن میں کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ آج پہلی بار کچن میں نانو کے لیے فریش جوس لینے آئی تھی۔ بڑی مای کو کنگ ریج کے سامنے کھڑی جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھیں۔ اسے نظر انداز کرتیں وہ مصروف سی آلیٹ پلٹنے لگیں۔ ”نانو کے لیے جوس لینا ہے“ ان کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے کے بعد وہ ڈھیٹ ہو کر خود ہی بول پڑی تھی۔

”ناشتا بنا رہی ہوں۔ ابھی نہیں بنا سکتی۔ کچھ دیر بعد آجانا۔“ بہت ناگواری سے جواب آیا تھا۔ ”ابھی ہر ایک کا الگ الگ ناشتا بنے گا۔ پھر اس میں سے بھی کپڑے نکلیں گے۔ کسی کو یہ نہیں کھانا تو کسی کو وہ نہیں کھانا۔ سب کام چورج ہوئے ہیں۔ بجال۔“ کوئی لڑکی کچن میں چھانک لے۔ دس دس بجے تک ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ نوکرانی کے ہاتھ سے کھانا یہ نہیں کھا سکتے۔ بڑی بہو ہونے کے سارے عذاب میری جان کو ہیں۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ اندر کی کھلون نکال رہی تھیں۔

”سارا کام آپ اکیلے کرتی ہیں؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ ٹرے میں گرم چائے کے بھاپ اڑاتے کپ رکھتیں مای کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکا تھا۔ انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا جہاں بے پناہ حیرت تھی۔

”میں..... ہاں ظاہری بات ہے اپنے بچوں کے لیے سب کرنا پڑتا ہے۔“ اب وہ بولیں تو لہجہ ٹھنڈا دھیمہ تھا۔ کوئی تو تھا جس نے مانا کہ وہ اتنا کام کرنی

ہیں۔ ٹریے اٹھا کر وہ باہر نکل گئیں۔ حرا ابھی بھی ادھر ہی کھڑی تھی۔

”ماما! ناشتا ملے گا یا یوں ہی چلا جاؤں؟“  
شیری اپنی دھن میں کہتا اندر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔

”سوری مجھے لگا ماما ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا کھانا ہے میں بنا دیتی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر نرمی سے آخر کی۔

شیری کا تو منہ ہی کھل گیا تھا۔ ایک تو صبح صبح کچن میں ماما کے علاوہ گھر کی کوئی اور لڑکی، پھر مخاطب کرنے کا طریقہ۔ ٹھیک ہے وہ چھوٹا تھا لیکن اتنا بھی نہیں۔ طرز و مخاطب اپنی جگہ۔ اس کی ناشتے کی پیش کش۔ کمال ہی ہو گیا تھا۔ آج دن کدھر سے چڑھا تھا، اسے سوچنا پڑا۔

”اگر کھانے کے قابل ہو تو ایک پراٹھا کم گھی والا اور ایک ہاف فرائی اٹھو۔“ سر ہلا کر وہ جلدی جلدی پراٹھا بنانے لگی اور جب تک مامی واپس آئیں وہ ناصر ف ناشتا بنا چکی تھی بلکہ میز پر رکھ بھی چکی تھی۔  
”باسط کی شرٹ پر چائے کر گئی تھی۔ دوسری استری کر کے دے کر آئی ہوں۔“ دونوں کی خاموشی کے باوجود انہوں نے وضاحت دی تھی۔

”ماما اتنے مزے کا پراٹھا ہے۔ میرے جانے کے بعد آپ بھی بنوا کر کھائیے گا۔ ٹائم ہوتا تو ایک اور بنوا کر کھاتا۔ سچ بہت مزے کا ہے۔“ اس کا کھانے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ ”شکر یہ پھوپھو۔ آپ مجھے ایسی اچھی بہن دے گئیں۔“ جاتے جاتے وہ شرارت سے بولا۔ حرا مسکرائی تھی، بالکل، مدہم سا روت بھی مسکرا دیں۔

”اگر آپ کو برانہ لگے تو میں آپ کی مدد کر دیا کروں؟“ بڑی آس کے ساتھ اس نے پوچھا تھا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ انکار کرتیں۔ وہ خود اس ذمہ داری کے بوجھ سے تھکتے لگی تھیں۔ باسط، شیری اور سین اور رابی ان کے بچے تھے۔ اپنے بچوں کے

انہوں نے خوب غرے بھی اٹھائے تھے۔ رفتہ رفتہ کے باقی بچوں کی ذمہ داری بھی از خود ان پر آ رہی تھی جو نا چاہتے ہوئے بھی انہیں اٹھانی پڑ رہی تھی اور رات کا کھانا نہیں تیار کرنا ہوتا تھا جب کہ درگھر میں صرف وہی بچے ہوتے تھے جو بڑھ چکے تھے یعنی دو پہر کو کم ہوتا تھا جو ان کی دیورانی دیکھتی تھیں۔ کام کی اس غیر منصفانہ تقسیم پر ان دیکھتا تھا۔ اب عمر کے ساتھ ساتھ ہمت جواب دہ تھی۔ نہ نام نہ نیکی، اوپر سے سب کے غرے۔ اس نے پوچھا تو گویا ادھا بوجھ کندھوں سے سرک تھا۔ دل ہی دل میں وہ اس کی معترف ہوئی تھی ایک یہ لڑکی تھی اور ان کے گھر کی بھی تو لڑکیاں تھیں۔ خود ان کی اپنی بیٹی ان کے بس میں نہیں تھی کیا کہنا۔ انہیں اپنا وجود بہت ہلکا چھٹکا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”ہم عورتیں بہت عجیب ہوتی ہیں۔ سارے زندگی مرضی کی زندگی کے لیے تڑپتی، ترستی رہتی اور پھر اپنی بیٹیوں کو قربانی کے پاٹ پڑھانے جاتی ہیں، وہ بی بیٹیاں جو کل کی عورتیں ہیں۔“ نیم ٹیل سے وہ نانو کے سر میں مساج کر رہی تھی جب ماضی کے اوراق کھولنے لگیں۔

”یہ مت سمجھنا میں ماں ہوں اس لیے تعریف کر رہی ہوں، جبین واقعی ہیرا تھی۔ ہر کام میں طاقتور تھی۔ سلائی، کڑھائی، گھر کے کام کاج، کھانا پکانا یہی اس کے شوق تھے۔ سارا سارا دن چولہے پر ہاتھ دھکے لگاتے ہوئے کبھی کوئی شکایت نہیں، شکوہ نہیں، کوئی لڑائی جھگڑا نہیں۔۔۔۔۔ سب کہتے تھے بڑے اونچے نصیب ہوں گے میری جبین کے“ کہتے کہتے وہ رک گئیں۔ چند لمحے دے باؤں گزرے تھے جھریوں زدہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے آواز صاف کی۔

”ہم عورتیں ہی اپنی بیٹیوں کو کمزور بناتی ہیں طلاق لفظ سے ہم یوں ڈراتی ہیں جیسے حرام کام کی لڑکی حق پر ہوتے ہوئے بھی چپ رہ کر رو کر

تکرت کرتی ہے، سہہ جاتی ہے کہ کہیں طلاق نا ہو۔ آخر کڑوری پتھوں میں بھی کسی کو طلاق نہیں ملے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ بھلا لوگوں کا تو کام ہی کہنا ہے۔ کچھ بھی کہیں گے۔ غلطی تو اپنی تھی جس کی اس نے کائی۔ اس کا نکاح کر بیٹھے تھے۔ دو سال لگے لگے ابھی لی پھر جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو وہاں فیصلہ ہی بہتر ہے۔ مگر وہ نہیں مانی۔ میرے دل میں آج بھی۔“ سالوں پہلے کا وہ منظر آج بھی اس میں یوں تازہ تھا کہ انہیں لگا ابھی وہ ان دنوں میں بیٹھی ہے۔ بے اختیار انہوں نے اس سے پوچھا۔

”کبھی تھی انی اگر دوسری جگہ شادی کر کے آتی میں خوشیوں کی، عزت اور سکون کی گارنٹی دے دیتی تو ٹھیک ورنہ جو میرے مقدر میں ہے وہ ادھر ہی مل جائے گا۔ مجھے میرا مقدر جینے دیں۔ تب اس نے باپ نے قسم کھائی تھی کہ اگر یہ طلاق نا ہوئی تو میں کو مرتے دم کسی سے ملنے نہیں دے گا۔“

ایک اداسی حرا کے دل پہ چھانے لگی تھی۔ اس نے ایک ہی توراشتہ دیکھا تھا ”ماں“۔ وہ چلی گئی تو نانو۔ ماں کی بھی ماں۔ ماں کے سکھ دکھ سے آشنا، ان کی خواہشوں کی امین۔ اس کا دل روئے کو چاہ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دانستہ کسی سے بھی امی کے سے گریز کرتی تھی۔

”اللہ کا بندہ مرتے مر گیا لیکن مجھے اپنی قسم کا پا لے لیا۔ جانے کس حال میں رہی ہوگی اس مردود کے ساتھ۔ اچھا ہوا مر گیا، میری بچی نے اس کے لئے پرتو سکون کا سانس لیا ہوگا۔“

اس کے مساج کرتے ہاتھ لچھ بھر کر کے تھے۔ ایا انہیں لگتا ہے کہ منصور احمد مر گیا ہے؟ ہاں مر ہی ہے وہ شخص۔ اسے مرنا ہی رہنے دینا چاہیے۔ ان بوجھ کر اس نے ان کی غلط فہمی دور نہیں کی۔ اس نے اس کے بعد پہل بار تھا جب کسی نے امی ابو ہمارے میں بات کی تھی۔ دل بری طرح اداس ہوا۔ آسوا اندر اتار دے وہ بلا وجہ باہر نکل کھڑی ہوئی۔

لاؤنچ سے گزرتے ہوئے اس نے صوفے پر رابی کو بیٹھ دیکھا تو بلا ارادہ اس کے پاس رک گئی۔ اس کے سامنے میز پر بیالوجی کی کتاب کھلی پڑی تھی جس میں بی ڈائیگرام بنانے کے چکر میں رابی ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ حرا اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نرمی سے اس کے ہاتھ سے پنسل پکڑ کر نوٹ بک اپنی طرف کھسکاتے وہ نے سرے سے ڈائیگرام بنانے لگی۔

”یہ لو۔ من بھی گئی۔“ مسکراتے ہوئے اس نے پنسل اور نوٹ بک اس کی طرف بڑھا دی۔ ڈائیگرام دیکھ کر رابی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ساخت ہی ٹھیک نہیں بنا پا رہی تھی اور حرا نے چند منٹوں میں بہترین ڈائیگرام بنا دی تھی۔ ”امیزنگ“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔

”یو ٹو لائل آئی جی۔“  
”میں تو ایسی کبھی نہیں بنا سکتی۔“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”کیوں نہیں۔ ضرور بنا سکتی ہو۔ میں سکھا دوں گی۔“  
”نہیں رہنے دیں۔“ صفیہ پر انگلی پھیرتے وہ پھسکی ہی ہنسی لگی۔  
”کیوں سیکھنا نہیں چاہو گی؟“  
”چاہتی تو ہوں پر۔۔۔۔۔“ تذبذب کے عالم میں اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔  
”لیکن کیا؟“

”آپ یہ لڑکوں جیسے کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟“  
”کیوں برے لگتے ہیں؟“ جواب اس نے بھی سوال پوچھا۔

”نہیں۔ برے تو نہیں لگتے لیکن۔۔۔۔۔ گھر میں کوئی ایسے کپڑے پہنتا نہیں تو عجیب لگتے ہیں۔“ انک انک کر اس نے بات پوری کی تھی۔ ”باسط بھائی تو بہت غصہ کر رہے تھے۔ کہتے۔۔۔۔۔“ جھجک کر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔  
”کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے اتنے نارمل انداز میں پوچھا تھا جیسے کسی اور کے بارے میں بات



ہو رہی ہو۔

”وہ کہہ رہے تھے۔ آپ سے دور ہی رہیں اور یہ بھی کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“ بہت شرمندگی سے اس نے بات پوری کی تھی۔

”کوئی بات نہیں گڑیا۔ جب ضرورت ہو چکے سے مجھے دے دینا اور اگر موقع ملے تو چیکے سے سیکھ چکی ہیں۔“ گہری سانس بھرتی وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت اسے تنہائی کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کا گولا ساطق میں اٹک گیا تھا۔

اس نے شروع سے ایسے ہی کپڑے پہنے تھے۔ جب وہ یہاں آئی تب بھی اس کے پاس ایسے ہی کپڑے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے یہ کپڑے ان کپڑوں سے تو کئی گنا بہتر تھے جو اس کھڑکی لڑکیاں پہنتی تھیں۔ لیکن یہ تو اس کی اپنی سوچ تھی۔

☆☆☆

”کتنی گھٹیا نگلی تم۔ تمہیں تو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ جن لوگوں نے تمہیں پناہ دی، اپنے گھر کی چار دیواری دی تم ان کے ہی گھر میں نقب لگا رہی ہو۔ اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا گرا ہوا سلوک تم کیسے کر سکتی ہو؟“ وہ نہا کر تویے سے بال خشک کرتی ہاتھ روم سے باہر نکلی تھی جب بے چینی سے منہ لٹکی علیہ اس پر برس پڑی۔

”کیا..... کیا ہے میں نے؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔

”یہ تو اب سب کو پتا چلے گا حرا بی۔ تمہارا یہ معصومیت کا ڈرامہ زیادہ دیر نہیں چلے والا۔ تم نے میرا دل اجاڑا ہے، میں تمہیں اجاڑ دوں گی۔ تمہیں بے گھر کر دوں گی۔“

”پہلی بات اجڑے ہوئے کو اور کیسے اجاڑیں گی آپ؟ دوسری بات میرے بے گھر ہونے میں ابھی آپ کو کوئی شک ہے؟ اب بتائیں میں نے کیا کیا ہے؟“ بڑے ٹھہرے لہجے میں اس نے جواب دیا تھا۔

”بہت جلد پتا چل جائے گا تمہیں بھی اور سب کو بھی۔ چھوڑ دوں گی نہیں تمہیں۔“

وہ عین حرا کے سامنے کھڑی تھی۔ کالر شرٹ پکڑ کر ایک جھکاوے کردہ باہر نکل گئی۔ چوڑے شیشوں والی عینک کارپنٹ پر جاگری اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے بھی علیہ کے رویے پر حیران تھیں۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ نانو نے پوچھا تھا۔

”مجھے کیا پتا۔“ اس نے جھک کر اپنی اٹھائی۔ اب اسے اس ”بہت جلد“ کا انتظار تھا۔

علیہ کہہ کر گئی تھی۔ اور یہ بہت جلد دو دن بعد آئی وہ نانو سے گئے دونوں کے قصے سننے کے ساتھ انہیں رہی تھی جب چھوٹے ماموں کمرے میں آئے تھے

”علیہ کے سسرال سے فون آیا تھا رات“ کی آواز میں کچھ تھا جو غیر معمولی تھا۔ وہ ناچاہتے متوجہ ہوئی تھی۔

”وہ کہہ رہے تھے سسرال علیہ سے شادی راضی نہیں۔“ ایک باپ اپنی بیٹی کے رشتہ ٹوٹنے کی

کس دل سے سنار ہا ہوگا، اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

”لیکن کیوں بیٹا؟“ چند ماہ پہلے شہر کے تین میرج ہال میں ہوئی منگنی کی تقریب ان آنکھوں میں گھوم گئی تھی۔ دونوں گھروں نے

کھول کر پیسہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ ماموں نے ایک نظر آنکھیں نیچے کیے تا

وہاں حرا کی طرف دیکھا تھا۔

”وہ کہتے ہیں سسرال کہتا ہے..... وہ علیہ نہیں حرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ انہوں

آہستگی سے اس کی سماعتوں پر بم بھونڈا تھا۔

”حرا سے؟“ نانو بھی حیران رہ گئی تھیں۔

”کوہ کیسے جانتا ہے؟“

”یہ تو اب حرا کو ہی پتا ہوگا۔“ اللہ کی پناہ الزام دیتا سرو شکستہ لہجہ تھا۔ وہ سن رہی تھی۔ اس سے پوچھ کر بتادیں کب تک شادی رخصت جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”حرا“ نانو کی آواز جیسے کسی کھائی سے آئی

کتنا دکھ تھا اس ایک لفظ میں۔ وہ ایک دم نیند

ہاں تھی۔

”علیہ اسکا پ پر اپنے منگیتر سے بات کر رہی تھی جب میں اچانک ان کے کمرے میں چلی گئی

میں۔“ اپنے کردار کی دکالت کتنا مشکل کام تھا اسے آج

پتا تھا۔ اس کی بات پر ماموں کمرٹ کھا کر لپٹے تھے۔

”میرے پاس کوئی فون، کوئی رابطے کا ذریعہ

نہیں، نانو یہ بات جانتی ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں ان

کا ماتھ ان کے پاس گزاری رہی ہوں۔“

حیران کن بات وہ نہیں تھی۔ بات تو یہ تھی کہ وہ

ہانتے ہی نہیں تھے کہ علیہ کا سسرال کے ساتھ کوئی

رابطہ بھی ہے۔ وہ بھی صرف فون کا نہیں بلکہ دیڈیو

وال پر اور یہ رابطہ یہاں تک تھا وہ خود نہیں جانتے

تھے۔ میل ملاقات یا کہیں تک۔ ان سے سوچا ہی

نہیں گیا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھے لیکن زمانہ شناس تھے۔

اگر کے حالات دیکھتے ہوئے انہوں نے بچوں کو

بے سہولتیں دے رکھی تھیں لیکن ایک حد تک۔ آج

بہن پتا چلا تھا کہ ان کی متین کردہ حد تو کوئی حد تھی ہی

نہیں اور کوئی حد تھی بھی انہیں وہ یہ جانتے نہیں تھے۔

”میں کسی ایسے شخص کو اپنی زندگی میں شامل

نہیں کرنا چاہتی جس نے محض ایک جھلک دیکھ کر

پنے سے منسوب لڑکی کے جذبات کی پروا نہ کرتے

ہے میرے کردار پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ باقی

اب مختار ہیں مجھے میرے ناکردہ جرم کی کوئی بھی سزا

نہیں لیں، ان شاء اللہ ثابت قدم پائیں گے۔“

ماموں بنا کچھ کے نکل گئے تھے اور آج پہلی بار وہ

والی موجودگی کی پروا نہ کیے بغیر روئی تھی۔ ”مجھ سے تم

نہیں لیں میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے ماموں سے

ابا بے حق کہا ہے۔ میرا یقین کریں نانو۔“

”کچھ نہیں ہوتا میری بچی۔ صبر رکھ بس صبر۔“

انہوں نے ایک ہاتھ سے اسے مزید قریب کرتے سلی

ا تھی۔ ایک عرصے سے وہ اسی کمرے تک محدود

میں لیکن انہوں نے دنیا دکھ رکھی تھی۔ گھر کے بڑوں

نے لے کر بچوں تک سب کے رنگ ڈھنگ بچپانی

ہیں۔ علیہ کیا تھی اور کیسے تھی اس بات سے قطع نظر

وہ جانتی تھیں حرا جھوٹ نہیں بول رہی۔

حرا کے لیے یہ رات اس گھر میں گزری ہر رات

پر بھاری تھی۔ آنکھوں میں نیند تو کیا نیند جیسا بھی کچھ

نہیں تھا۔ رہ رہ کر ماموں کا شکستہ الزام دیتا لہجہ یاد رہا

تھا۔ وہ اتنی بے اعتبار ٹھہری تھی ان کی نظر میں۔ ایک

چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں

ہونے دے گی۔ اپنا دفاع کرنا اس کا پہلا حق تھا اور

ماں کے بڑھائے اسباق میں سے ایک سبق یہ بھی تھا

کہ اپنا حق کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا۔

اگلی صبح ساری رات جاگنے کے باوجود وہ

گزرے کئی دنوں کی طرح وقت پر پکٹن میں موجود

تھی۔ سب سے پہلے نانو کا جوس پتایا۔ اس کے بعد

باری باری سب کا ناشتا بنانے لگی۔ مامی کی آج

طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے جیسے ہی ماموں اور

باسط کا ناشتا بنا وہ آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں

چلی گئیں۔ اس نے جلدی جلدی چکن کا پھیلاؤ اسیٹا

اور برتن دھوئے لگی۔

”نانی ماں ایک کپ چائے بنا دیں، سسر بہت

دور کر رہا ہے۔“ کتنی دوا لکھنویوں سے ملتی چکن کی میز

پر آ کر بیٹھے والی علیہ تھی۔ اس نے سر اٹھا کر

دیکھنے کی زحمت کیے بغیر ہی آرڈر جاری کیا تھا۔

حرا نے گردن پیچھے موڑ کر اسے دیکھا اور پھر

سے برتن دھونے لگی۔ کوئی جواب نہ دیا اس نے سر

اٹھا کر اسے دیکھا۔ سیاہ ٹراؤزر پر چمیلی چیک والی

شرٹ پہنے تنہی سے برتن دھوتی وہ دہی جس کی

وہ شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ناک پر جتنے کا

فریم کانوں کے پیچھے سے بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے

جیسے خون میں ابال اٹھا تھا۔

”اوہ..... تو غیرت نام کی کوئی چیز حرامشور میں

نہیں پائی جاتی۔ کیسے تم.....“

”ایک منٹ۔“ اگلی اٹھا کر اس کی بات کاٹتے

وہ ایک دم پیچھے مڑی تھی۔ اس نے تل کھول کر ہاتھ

دھوئے اور چٹن ٹاول سے خشک کرتی اس کی طرف آ

گئی۔ تب تک پیر پختی علیہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

اپنی انا کی جیت کے لیے، تسکین کے لیے ہم دوسروں کو اس وقت تنہا چھوڑ دیتے ہیں جب انہیں کسی سامع، کسی غم گسار کی صورت ہماری ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ہو جو کندھے پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنی یقین دہانی کر دے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سو اپنی انا جلتے چولے میں جھونک کر اس نے علیہ کے لیے چائے کا پانی چڑھا دیا۔

چائے بنا کر بے تحجک وہ اس کے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے شاید رورہی تھی۔ چائے اس نے سائڈ پیبل پر رکھ دی تھی۔ ”لوگ کہتے ہیں کردار پر بات آجائے تو وہاں ہر بات ختم کر دینی چاہیے۔ میں کہتی ہوں کردار پر بات آجائے تو کھل کر بات کرنی چاہیے۔“ مجھے کوئی غرض نہیں تمہارے اقوال زریں سے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”بالکل۔ ہونی بھی نہیں چاہیے لیکن میں ایک غلط فہمی کی وجہ سے زندگی بھر کے پچھتاوے نالینا چاہتی ہوں نا دینا۔ ماموں نے میرے کردار پر بات کی تھی۔ میں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش بھی کی تھی جو جانے کا میاب بھی ہوئی کہ نہیں لیکن میں آپ سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اس لیے کہ آپ خود سچ جھوٹ جانتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں میرا آپ کے منگیتر سے کوئی رابطہ یا رشتہ نہیں تھا اور جو آپ دونوں کے درمیان ہوا وہ بھی آپ ہی جانتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں جھانپتے وہ اس کے فریب ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ نظر چرا کر علیہ نے بے ساختہ اذیت سے آنکھیں موند لی تھیں۔

”آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ وہ شخص جس نے آپ کے فون پر ایک لڑکی کی محض ایک جھلک دیکھ کر آپ کی فیملی کو پرہیز کے بغیر آپ سے رشتہ توڑ کر اس سے رشتہ باندھنے کا سوچا، وہ آپ کے قابل ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ نے آپ کے لیے اس سے بہت بہتر کچھ رکھا ہوگا۔“ وہ رکی۔ اس کی نظریں ابھی بھی اسی پر تھیں۔ ”فرض کریں اگر آپ کی شادی کے بعد

میرا اس سے سامنا ہوتا اور وہ ایسا کچھ کہتا۔ کریں میں نہ ہوتی کوئی اور ہوتی۔ فرض کریں۔“ ”مجھے کچھ فرض نہیں کرنا۔ خدا کے واسطے جائے یہاں سے۔“ گالوں پر بہتے سیال کے ساتھ اس سچ میں اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

”مقام شکر ہے علیہ بی بی! اللہ نے ایسے کے ہاتھوں آپ کی زندگی محفوظ رکھی۔ چند فیملی کے نام سے منسوب ہیں جھاڑ جھنکار کی طرح دل سر زمین سے اکھاڑ پھینٹیں۔ میری مائیں تو سجدہ ادا کریں۔ یقین کر لیں کہ وہ شخص آپ کے قابل ہے۔ اپنا دل اور ذہن صاف کریں اور جب رونا آئے میری باتیں ذہن میں رہا رہیں گی۔“ اس نے کندھا تھپتھا کر وہ باہر چلی گئی تھی۔ اسے پتا غلط نہیں کہہ رہی۔

چار ماہ پہلے ان کی منگنی گھر والوں کی مرضی ہوئی تھی اور جب سین، سرمد کی خواہش لے کر کے پاس آئی تو اس نے منگنی کو جواز بنا کر دل میں ہڑکی کھول لی تھی۔ دن رات فون پر باتیں پھر دو کال۔ ہاں ملنے کی ہمت وہ بھی نہیں کر سکتی تھی حالانکہ وہ کتنی بار کہہ چکا تھا۔ ناراض بھی ہوا تھا لیکن جانتی تھی وہ یہ ہمت بھی نہیں کر سکے گی اس لیے حامی نہیں بھری اور جب اس سے بات کے دوران کی جھلک دیکھی تو مذاق مذاق میں اس کا نمبر مان لگا۔ پھر یہ مذاق اکثر ہی ہونے لگا۔ اتنا کہ وہ ہو گئی۔ ”اس کے پاس کوئی فون نہیں اور میری کے ساتھ ایسی کوئی دوستی نہیں کہ اپنے فون پر کرواتی پھر دوں۔“ کھولتے خون کے ساتھ اس بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا تھا۔

”ہوں۔ لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ سے لہجے میں کہہ کر اس نے مزید بات کیے فون دیا اور پھر اسی شام اس کے گھر سے فون آگیا۔ ”علیہ آزاد خیال لڑکی ہے اور سرمد لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا، اسے حرا پسند رشتہ داری کرنی ہے تو حرا کا رشتہ دے

مینشن سے اس نے خود یہ الفاظ سنے تھے۔ حرا کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ صورت تو اس کا اپنا تھا لیکن مسان بھی تو اسی کا ہوا تھا۔ نقصان اپنے ہاتھوں بھی ہوا۔ تکلیف تو ہوتی ہی ہے ناں۔ اور وہ بھی ابھی اسی لائف کے فیز میں تھی۔ حرا ٹھیک کہہ گئی تھی۔ اسے تو ارادہ کرنا چاہیے تھا۔ شادی کے بعد اگر یہ سب ہوتا وہ ایسی ممکن ہی نہیں تھی۔ ابھی تو چار ماہ اور چند ہڈیوں کا ہی نقصان ہوا تھا۔ اس نے ذاتی ہی دوگانہ حل ادا کر کے اللہ سے اپنے منہ پر روپی کی معافی مانگی تھی اور شکر ادا کیا تھا کہ وقت پر جان چھوٹ گئی۔

روتے روتے وہ تھک گئی تھی۔ نفل ادا کرنے کے بعد وہ اتنا پرسکون ہوئی کہ بنا کھانا کھائے سرشام ہی پر کر سکی۔ اگلی صبح بڑی ٹھیک ٹھیک طالع ہوئی تھی۔ لیٹ ٹائٹ کا لڑکی وجہ سے وہ دن پڑھ سے تک دلی رہتی تھی اور اب جب کہ ساری تھکاوٹ اور دل کے کثافت دور ہو چکی تھی تو آٹھ بجے جلدی مکمل گئی تھی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر وہ چکن میں چلی گئی تھی۔ ہاں تانی اور حرانا شے کی تیاری کر رہی تھیں۔ شہادت کی انگلی موڑ کر میز پر مارتے اس نے انڈوں کو متوجہ کیا۔ چہرے پر زردی لیکن ڈیڑھ سکون تھی تھا۔ حرا سے نظریں تو وہ دونوں مسکرا دیں۔ یہ دوستی لی ابتدا تھی۔

”ایک کپ چائے ملے گی؟“ میز بجاتے اس نے پوچھا تھا۔ ”ٹھیک سات منٹ بعد کھانے کی میز لگے گی۔“

”بہن بی بی لے گی“ حرا نے جواب دیا۔ ”کوئی آرہا ہے کیا؟“ جس سے آگے ہو کر اس نے پوچھا تھا۔ تانی بے ساختہ ہنس دیں۔ ”ہاں۔“

”حرا تم مجھے آپ جناب مت کہا کر ادب اتنی تی بڑی نہیں ہوں تم سے۔“ ”اچھا نہیں کہتی۔ ابھی تم یہ برتن اٹھا کر میز پر لگاؤ۔“ تیزی سے ہاتھ چلاتے اس نے جواب دیا۔ حرا نے ہاتھ روک کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

کندھے اچکا کر وہ چیزیں میز پر رکھنے لگی تھی۔ وہ غش کھا کر گرنے کو تھیں۔ گھر کی باقی لڑکیاں کوئی کام کر دیتیں تو انہیں حیرت کبھی نہ ہوتی لیکن علیہ..... وہ بھی حرا کے کہنے پر۔ وہ حرا جس کی وجہ سے ابھی دوون پہلے اس کی منگنی ختم ہوئی تھی۔

”ابھی..... یہ کیا ماجرا ہے۔“ وہ ذاتی حیران ہوئی تھیں۔ حرا ان تو علیہ بھی ہوئی تھی جب گھر کے مختلف کونوں سے، بیڑھیوں سے ایک ایک کر کے ساری لڑکیاں، لڑکے ناشتے کی میز پر آ بیٹھے تھے۔ سب کی ناشتہ کھانے توڑے فرق سے تقریباً وہ تھی۔ سو اس نے باری باری سب کو قائل کر لیا تھا کہ وہ ایک وقت میں اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کر لیا کریں۔ باسط، ذیشان اور چھوٹے ماموں ان سب میں شامل نہیں تھے۔

”یہ کب ہوا اور کیسے۔“ وہ چکن میں حرا کے پیچھے کھڑی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ ”حرا! تمہارا نام ہیرا ہونا چاہیے تھا۔“ نم آنکھوں سے وہ اس کے گلے لگ گئی۔

”یہ کب ہوا اور کیسے۔“ عقب سے ابھرتی ذیشان کی آواز پر وہ دونوں الگ ہوئیں اور ذیشان کی بات پر ہنسی چلی گئیں۔

یقیناً یہ پہلی بار تھا جب حرا منصور اس گھر میں کھلکھلائی تھی اور ذیشان حیدر اس خوب صورت ہنسی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا تھا۔ آنے والی کئی راتیں اس نے اس ہنسی کے تعاقب میں گزار لی تھیں۔

☆☆☆

”حرا..... بیٹا ذرا میرے کندھے تو بٹا دو، ہر وقت لیٹے رہنے کی وجہ سے درد ہونے لگتا ہے۔“ وہ دیوار گیر الماری درست کرتے ہوئے رکی۔ ”بس ایک منٹ نا تو۔“ سارا پھیلا دالگوں میں سمیٹ کر وہ ان کے پاس تھی۔

”آپ سارا دن یہیں رہ رہ کر بور نہیں ہوتیں؟“ نرمی سے ان کے کندھے میچتے ہوئے وہ ان سے پوچھ رہی تھی۔

”بہت دل گھبراتا تھا شروع شروع میں۔ ہمارا مشنر کہ گھریلو نظام تھا۔ شادی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ ہر وقت آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اللہ بخشنے بہت مہمان نواز تھیں میری ساس۔ پھر اتنا بڑا خاندان۔ بہت رونق ہوتی تھی ہمارے گھر میں۔ بیمار ہوئی تو جیتے جیتی قبرجی لی میں نے۔“ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ خاموش ہوئی تھیں۔

”تو پھر آپ باہر کیوں نہیں۔“ اس نے سوال خود ہی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اگر وہ خود کہیں آنے جانے کے قابل ہوتیں تو اس ایک کمرے تک کیوں محدود رہتیں۔ یہاں رہتے اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کے رہنے والوں کے پاس اور تو کچھ ہو سکتا ہے لیکن ایک دوسرے کو دینے کے لیے وقت نہیں۔ یوں بھی ایک بوزی عورت جس کی دنیا ایک کمرے اور گئے دنوں کی یادوں پر مشتمل تھی، اس سے نفی تسل کو کیا غرض ہو سکتی تھی اور اس نسل کے لیے کمانے کی مشین بنے والدین کے پاس ان کے لیے وقت نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ جبریشن گیپ کا مطلب اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔

وہ عجیب سی سوچوں کا شکار ہوئی تھی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یوں نکالا کہ اس شام جب ماموں نانوں سے ملنے کمرے میں آئے تو نانوں سوری تھیں، اس نے ماموں سے کہہ کر ان کے لیے ڈیکل چیئر منگوا لی تھی۔ ماموں نے حیرانی سے اس لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ ان کی ماں بھی اور دس سالوں سے بستر پر تھی جانے انہیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ روز رات ان کے پاس کچھ وقت گزار کر گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔ آج احساس ہوا تھا کہ انہوں نے کسی سزا دیے رکھی تھی اپنی ماں کو۔ جب وہ مکی اولاد ہو کر ماں کے حقوق بھول بیٹھے تھے تو بیوی بچے کیسے ان کی ماں کی پروا کرتے۔ پروا کے لبادے میں چھپی بے پروائی جیسے لمحوں میں ہوا ہوئی تھی۔ ہوتا ہے نا بعض اوقات ایک چیز روزمرہ میں شامل ہو کر اپنا احساس کھو دیتی ہے اور پھر کسی ایک

لفظ، ایک اشارے سے پوری طرح جی اٹھتی یہی ان کے ساتھ ہوا تھا۔ اگلی سہ پہر وہ خود ان کے لیے ڈیکل چیئر لے کر آئے تھے۔

نانو ایک لمبے عرصے کے بعد اس قید تھیں۔ انہیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ آزادی بھی مرہون منت تھی۔ بڑے عام سے منظر جواب دہ سے نکل ہی چکے تھے، ایک بار پھر لوٹ آئے خوشی سے ان کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ دیر سہی پر ان کے بیٹے کو ان کا خیال تو آیا۔

ہموار سڑک پر ان کی ڈیکل چیئر دھکیلے ہوئے خود بہت دور تک گئے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خود آج اس ہوا میں عرصے بعد سانس لے رہے تھے۔ سورج اپنے آخری بڑاؤ کی طرف رواں دواں تھا۔ پارک میں فٹ بال کھیلنے بچے جیسے ان کا ہاتھ تھے۔ کچھ چھوٹے بچے غباروں کے ساتھ خوش رہے تھے اور کچھ بچے ایک دوسرے کے پیچھے بھا رہے تھے۔ یہی تو اصل زندگی تھی۔ یہی تو فطرت خوشیاں تھیں۔ پھر وہ کیا تھا جس سے انہوں نے اپنا اور زندگیاں بھری تھیں۔ شاید ہوں اور لالچ۔ ان اندر سے ہی جواب آیا تھا۔ ایک بھر پور شام اپنی ماں کے ساتھ گزار کر وہ ہشاش بشاش گھر لوٹے تھے۔

”نانو باہر جا کر مجھے بھول گئیں نا۔“ نانو کو دکر حرا نے معنوی دکھ سے کہا تھا۔

”پتا ہے بچہ جب ونا دیکھتا ہے تو سب بھول جاتا ہے۔ میں تو اپنی زندگی گزار چکی ہوں اب تو رونق میں زندگی کا، زندہ ہونے کا احساس ہے۔ کچھ نہیں بھول سکتی میں۔“ محبت سے اپنا دایاں ہاتھ انہوں نے حرا کے سر پر رکھا۔ وہ ہنس پڑی۔

”تھینک یو حرا بیٹا!“ جاتے جاتے تم آج کے ساتھ ماموں اسے شکریہ کہنا نہیں بھولے تھے اس رات ایک عرصے بعد اس گھر کے دو افراد کی نیند سوئے تھے۔

☆☆☆

”تھوڑا سادائیں طرف کرو۔“ خوب

لوں سے مزین ایک فطری منظر کی پینٹنگ اٹھائے ہوئے پرچہ ہال سے دیوار پر سیدھا لگانے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ نیچے کھڑی حرا اسے ہدایات دے رہی تھی۔ ہر بار فریم بھی دایں طرف زیادہ ہو جاتا تو گی بائیں طرف۔

”بس آخری باریسٹ کر رہا ہوں، ہو گیا تو ہو گیا۔ نہ میں نیچے اتر جاؤں گا۔ آپ خود کریں گی۔“ وہ ہاتھ بوجھ کر چڑا رہا تھا۔

”میں تو پہلے بھی خود ہی کرنے لگی تھی۔ تمہاری دیر دانا نا ہارٹ ہو رہی تھی۔“ سیاہ چوڑے شیشے والی ملب ناک پر جمائے، میرون چیک والی شرٹ کی آئینیں کہنوں تک ٹوٹنے لگی تھیں وہ بھی برابری کی بنیاد پر آئے تیار ہی تھی۔

”ٹھیک ہے پھر اب خود ہی کریں، مجھ سے یہ بات رائٹ پریڈ نہیں ہوتی۔“ منہ بنا کر وہ میز سے اپنے اترنے لگا تھا جب میز سفید باربل سے پھسل کر اوجا کر اور وہ چھلانگ لگا کر کنبے کی کوشش میں اس سے آنکھ لپٹا۔ عین اسی لمحے باسٹ اندر داخل ہوا۔ حرا بری کو کندھے سے تھامے کھڑی تھی۔ یہ منظر باسٹ کی برداشت کی حد سے بہت پرے تھا۔ بجلی کی تیزی نے آگے بڑھ کر اس نے ان دونوں کو الگ کیا تھا۔

”بھائی!.....“ شیریں نے وضاحت کے لیے بھولا تھا۔

”سٹ اپ۔ جسٹ سٹ اپ۔“ دفع ہو جاؤ ہاں سے۔“ شیریں حیران پریشان کھڑا تھا۔ اسے اپنی کھڑا دیکھ کر وہ ایک بار پھر دھاڑا تھا۔ ”سنا نہیں تم؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ شیریں منہ نیچے کیے مار کرے میں چلا گیا تھا۔

اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے باسٹ چلا

تمہاری غلط فہمی ہے۔ اب تم ایک گھر میں ہو۔ گھر کا مطلب پتا ہے؟ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ یہاں رہنا ہے تو کم از کم عزت کے معنی سیکھ لو۔“

”اس عزت دار گھر کی لڑکیوں کے بدن سے چپکے لباس دیکھ کر اور آپ سے بات کر کے مردوں کی ذہنت کا اندازہ تو میں بھی لگا سکتی ہوں، فی الحال میں ایسے کسی موڈ میں نہیں کہ یہ سب سیکھتی پھروں اس لیے اپنے سیکھنے پر فکس کریں تو بہتر ہوگا۔“ اس کے اطمینان سے کہنے پر اس کے تن بدن میں آگ سی بھر گئی تھی۔

”لڑکی ہولڑی بن کر رہو، ورنہ اچھے سے دیکھ لوں گا تمہیں۔“ اس نے انگلی اٹھا کر دارن کیا۔

”ہاں ضرور پر یہ بھی یاد رکھیے گا آپ کی بھی دو بہنیں لڑکیاں ہیں، انہیں کوئی نہیں بھی دیکھ نہ لے۔“ ”نہیں.....“ لوں پر آئی گالی اس نے بڑی مشکل سے روکی تھی۔ پہلو کے بل گرے میز کو ایک زور دار ٹھوکر مار کر وہ باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

اب ہر صبح ناشتا بنانے کے لیے سینین اور علیشہ بھی آ جاتی تھیں۔ سو سب مل کر ناشتا بناتی تھیں جو ظاہر ہے جلدی بن جاتا تھا۔ حرا ناٹو کو لے کر ہر صبح پارک میں جانے کا سوچتی لیکن ٹائمنگ ہی سیٹ نہیں ہو رہی تھی۔ آج بھی وہ سب ناشتے کی میز پر تھے جب باسٹ میزریاں اترتا ہوا نظر آیا۔ غیر محسوس طریقے سے حرا چن میں چل گئی تھی۔

”ارے کیا بات ہے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا، سب لوگ ایک دقت میں میز پر اور ساری کام چور لڑکیاں بھی موجود ہیں۔“ اسے آج اسلام آباد کام کے سلسلے میں جانا تھا اور اس کی آخری معلومات کے مطابق اس کی ماں اس وقت یکن میں ہی پائی جاتی تھی سو وہ ان سے ملنے دہیں چلا آیا تھا۔

”بھائی۔“ رابی چلائی تھی۔

”اچھا سو رہی۔“ شیریں کی پلیٹ سے آلیٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اس نے منہ میں ڈالا۔

”اب تو یہ خواب مہینہ پرانا ہو چلا اور آپ آج دیکھ رہے ہیں“ سبین نے کہا۔  
 ”مجھے تو کسی نے جھوٹے منہ نہیں پوچھنا تھا۔ اب داپس آ جاؤں تو میں بھی سب کے ساتھ ہی ناشتا کیا کروں گا۔“ اس کا موڈ خوش گوار ہوا تھا۔  
 اندر کھڑی حرائے تب ہی سوچ لیا تھا کہ اب وہ کم از کم ناشتے کے وقت کچن میں نہیں آئے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی باسط کی موجودگی کے ساتھ اس کی غیر موجودگی کا سرا جوڑے اس لیے باسط کے آنے کے پہلے ہی اگلی صبح ہی وہ نانو کے ساتھ پارک آگئی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ پارک میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ اتنے دن بعد اس نے تازہ ہوا میں سانس لیا تھا۔ زندگی ایسے تردد تازہ لگ رہی تھی جیسے جھگی گھاس میں اگے ڈیرے کے سفید اور گلابی ننھے پھول۔ صبح کی نرم ہوانے ذہن و دل پہ طاری ساری کشمکش کو اڑا دیا تھا۔ نانو پارک میں کھیلنے بچوں کو طرف دیکھ رہی تھیں۔ کچھ ہی فاصلے پر جا ٹنگ ٹریک تھا۔ ”کتنے دن ہو گئے ایک سرساز کیے بغیر۔ وہ بے اختیار ہی وادام اپ کرنے لگی۔  
 ”نانو میں ذرا ایک راؤنڈ لے کر آئی۔“ نانو نے بے توجہی سے سنا اور دیکھے بنا ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دی تو وہ جا ٹنگ ٹریک کی طرف بھاگی۔  
 چار سو میٹر کے ٹریک پر دو راؤنڈ لگانے کے بعد ہی وہ بندھال ہونے لگی تھی۔ ٹریک کے عین بیچوں بیچ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکے ہوئے وہ سانس درست کرنے لگی۔  
 سیاہ لائننگ والی شرٹ کی آستین اس نے ہمیشہ کی طرح کھینوں سے ذرا آگے تک تک فولڈ کر رکھی تھیں۔ گلابی چہرے سرخ ہو کر دیک رہا تھا۔ گہرے سیاہ سلکی بالوں کی ٹنٹیں چہرے کے اطراف میں چپکی تھیں۔ گہرے سانس لیتے سیدھے کھڑے ہو کر اس نے ناک پر دھرا چشمہ درست کیا اور دائیں ہاتھ سے پسینہ پونچھ کر ہاتھ جھکا۔ تب ہی اس کے عقب سے

کسی نے کندھے پر سے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ بے ساختہ اس کی گردن پیچھے گھوم گئی۔ نرم سی نظروں سے نکلتا ڈیٹان اس کے کھڑا تھا۔ ”لی یس پانی جھوٹا نہیں ہے۔“ نظر پڑے پانی کی کٹج جا بچی وہ جھینپ گئی۔ بڑا دلکش سا تھلی کی رنگین اڑان بھر گیا تھا۔  
 ٹریک سے ہٹ کر وہ اوس میں بیٹھی گھاس بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ اسے سچ میں اس وقت پانی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کی بوتل منہ لگائے وہ سامنے جھولتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ڈیٹان کی وقت نظر چر کر اسے دیکھ لیتا۔ اچانک کچھ جھک کر اس نے حرا کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ الجھ کر خود میں سمٹ سی گئی تھی۔ اس کی شرٹ کے کالر پر گھاس کا ٹڈا تھا۔ ڈیٹان نے پکڑ کر گھاس پر دوڑ پھینک دیا تھا۔  
 ”آپ شرما رہی تھیں؟“ وہ دہچکی سے اس کے چہرے کے رنگ دیکھ رہا تھا۔  
 ”آپ کا میرا شرمانے کا کوئی تعلق ہی نہیں شرما کر کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔  
 ”کیا مطلب؟ شرمانے کا تعلق کون سا ہے؟“ وہ اس سے بھی زیادہ حیران ہوا تھا۔  
 ”شرمانے کا تعلق کسی ایک سے ہوتا ہے، ایک جو اپنا ہوتا ہے باقی تو سب سے پھپر کا تعلق ہے۔“  
 اس کی بات سمجھ کر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔  
 ”مجھے لگا آپ ڈر جائیں گی۔“  
 ”نہیں۔ میں نہیں ڈرتی ان بے ضرر مخلوق سے۔“ اسے بے اختیار ہی یاد آ گیا جب گھر میں کون چھپکا، چوہا یا کاکر دوچ آ جاتا تو ماما سپرے لینے اور کمرے میں چلی جاتیں اور ان کے آنے تک جھاڑو، داہیر یا جو بھی اس وقت میسر ہوتا، اس کے کام تمام کر چکی ہوتی۔  
 آنکھوں کی نمی نے حال دھندلایا تو شکر کے ساتھ اس کی بوتل تھا کہ وہ نانو کی طرف

گئی۔ ڈیٹان کے ہاتھوں نے نرمی سے بوتل کے دبانے کو چھوا جسے کچھ دیر پہلے ہونٹوں سے لگائے وہ پانی پی رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آنکھوں میں بہت سے خواب تھے جن کے پورے ہونے کا خود اسے بھی یقین نہیں تھا۔

☆☆☆

اسے آئے ہوئے چار ماہ ہو گئے تھے اور گھر میں آنے والی خوش کن تبدیلیاں بھی ماموں کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ وہ لڑکیاں جو کمروں میں بیٹھ کر کھانا کھاتی تھیں اور ذرا سی دیر پر داویلا چاڑھتی تھیں اب صبح سویرے ناشتا بنانے میں مدد کے لیے کچن میں موجود ہوتی تھیں۔ آئے دن جن میں کمریوں جوتوں اور فیشن پرچ کلامیاں ہوتی تھیں۔ اب انھیں نیچے جانے کن باتوں پر توجہ لگا رہی ہوتی تھیں۔ لاؤنج آباد ہونے لگا تھا۔ اماں جو سارا دن اکیلے رہتی تھیں اب وہ بھی ان کے درمیان موجود ہوتی تھیں۔ بچوں کا ان کے ساتھ رویہ بھی بہتر نظر آتا تھا۔ علیحدہ جو کسی کو کچھ سمجھتی نہیں تھی وہ بھی حرا کا دم بھرتی تھی۔ (ماہ جبین بھی تو ایسی ہی تھی۔ جاوہر کی شخصیت والی۔ یہ سحر اسے اپنی ماں سے ہی ملا ہوگا) گھر کی عورتیں بھی اب تو جانے کن مسکوں پر تبصرے کرتے پانی جانی تھیں اور تو اور لڑکے بھی اب کم از کم ساتھ بیٹھے نظر آتے تھے۔ چاہے ابھی ان میں کزنز دالی بے تکلفی نہیں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ایک نیکی ہی سب اب بھی ذوریں سلجھا جاتی ہے۔ حرا وہ بارکرت نیکی تھی انھیں بھی اس کے لباس پر اعتراض تھا۔ ہاں تھا۔ اب نہیں تھا۔ لاؤنج میں سب کے درمیان بیٹھی وہ کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“ ماموں کے کہنے پر وہ اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ ”کوئی پریشانی ہے تو بیٹا ابو۔ اتنی اداس کیوں ہو۔“

”وہ۔ ماموں میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ کچھ چیزیں لینی ہیں۔“ قدرے سوچ کر اس نے جواب دیا۔

”ہاں بیٹا ضرور چلی جانا۔ بتا دیتا کب جانا ہے باسط یا ڈیٹان تمہیں لے جائے گا۔“ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”میں تو آفس سے کسی صورت چھٹی نہیں کر سکتا۔ ڈیٹان سے کہیں وہ لے جائے گا، یوں بھی آپ ہیں تو اس کی جگہ کام دیکھنے کے لیے۔“ موبائل کی روشن اسکرین پر انگلیاں پھیرتے باسط نے قدرے تحقیر آمیز لہجے میں جواب دیا تھا جسے ماموں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

”چلو میں ڈیٹان کو بھیج دیتا ہوں۔ کب جانا ہے؟“ یہ ظاہر عالم بنے ڈیٹان کے دل کی دھڑکن رکھی تھی۔

”کل..... کل چلی جاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ڈیٹان تم کل آفس سے آف لے لو۔ حرا کو گھر لے جانا۔“

”جی ٹھیک۔“ اس نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ ساتھ ہی ساتھ شکر بھی ادا کیا کہ اس وقت ممانے کچھ نہیں سنا ورنہ کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کسی نا کے بہانے اسے روک ہی لیتیں۔

☆☆☆

چھوٹے سے گھر کی مختصر دیوار انکور کی نیل نے ڈھک رکھی تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے تالا کھول کر حرا اندر داخل ہوئی تو وہ بھی اس کے پیچھے ہی اندر آیا تھا۔ ہوا کے جھونکے نے یکدم گلے لگ کر جیسے خوش آمدید کہا تھا۔ چھوٹے سے صحن کا آدھے سے زیادہ حصہ تو نیل نے ڈھک رکھا تھا۔ گرد کی تہ نے ہر چیز کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک قطار میں بڑے سنگوں پر بے وقت خزاں اتری تھی۔ ایک طرف نمایاں لکڑے سے بائیک ڈھکی ہوئی تھی۔

”آپ ایک منٹ بیٹھیں پر رکھیں۔“ اسے کمرے کے دروازے میں روک کر وہ باہر بھاگی۔ داپس پر اس کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جو وہ یقیناً جھاڑو پونجھ کے لیے لائی تھی۔ پھر اس سے کہنے لگی۔ ”مجھے یاد نہیں رہا ورنہ کھانے کا انتظام کر کے



آتی۔ اگر تکلیف نہ ہو تو کارنر شباب سے اٹھے اور کچھ چیزیں لادیں تاکہ میں کھانا بنا سکوں۔“  
”لاؤ بیٹا ہوں بلکہ اگر آپ کہیں تو ریڈی میڈ کھانے کا بھی آپشن موجود ہے۔“

”بالکل بھی نہیں۔ آپ پہلی بار ہمارے گھر آئے ہیں اور میں آپ کو بازار کا کھانا کھانا کھلا دوں۔ بھی بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں اپنے گھر کا مان تھا۔ اس کا یہ انداز ذیشان کو بہت بھلا لگا تھا۔

”ٹھیک۔ بتا دیں پھر کیا کیا منگوانا ہے۔“  
اسے فہرست بنا کر وہ دوبارہ کمرے میں آگئی۔ سارے کمرے کو چھانڈنے کے بعد وہ ڈرینگ مرر کی طرف آگئی۔ وہ اس کے آنے سے پہلے پہلے کمرے کی حالت درست کر لینا چاہتی تھی۔ اس لیے ٹوٹی کھڑکی کے آگے پردہ لگا کر وہ مرر کو ٹھیک کر کھڑکی کے آگے کرنے لگی۔ کھینچتے ہوئے ڈرینگ مرر کا ایک کونا فرش پر پڑے چھوٹے سے کھڑے میں پھنس گیا۔ اس نے کچھ زور لگا کر ڈرینگ کو اوپر کھینچا۔ تب ہی کھڑکی کا پردہ اس کے منہ پر آن گرا۔ اس کی گرفت واصل ہوئی۔ عین اسی وقت دروازے میں ذیشان نمودار ہوا اور حرا کی نظر بھٹک کر اس کی طرف چلی گئی۔ جانے کیسے اس کے ہاتھ سے ڈرینگ کا کونا چھوٹا اور ایک چٹخ کے ساتھ وہ نیچے بیٹھ گئی۔ ذیشان تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ پاؤں کو ہاتھ سے دبوچے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ چشمے کے نیچے اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔ چہرے پر بڑے تکلیف دہ تاثرات تھے۔ ذیشان نے پاس بیٹھ کر نرمی سے اس کا پاؤں اپنی طرف کھینچا جسے اس نے فوراً سمیٹ لیا۔

”ادھر دکھائیں مجھے۔“ اب کی بار اس نے سختی سے کہتے دوبارہ پاؤں اپنے سامنے کیا۔ دایاں انگوٹھا پوری طرح نیلا پڑ چکا تھا۔ ایک طرف سے ناخن بھی آدھے سے زیادہ اٹھ چکا تھا۔

سے کہہ دینا تھا۔“ اسے سچ میں غصہ آ رہا تھا۔ اس کی سسکیاں اسے حد سے زیادہ تکلیف دے رہی تھیں۔  
”انہیں اب ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“

”نہیں۔ ہلدی باندھتے ہیں۔“ رندھی ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا۔ کھڑی وہ اب بھی نہیں ہوتی تھی، ہوا ہی نہیں جا رہا تھا۔ چوٹ اگرچہ انگوٹھے پر لگی تھی لیکن اس وقت تکلیف پورے پاؤں میں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پاس ہی گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ پاؤں چھونے سے وہ اس کا گر بڑھ گیا تھا اس لیے اب چھو نہیں رہا تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ جیسے سمجھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اسے سہارا دیتے ہوئے وہ بیڈ کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھی اس کے باوجود وہ وقت ٹھہرنے کی دعا بھی نہیں کر سکا۔ اس کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو وہ دعا کرتا یہ وقت بار بار آئے۔

بہت تکلیف سے وہ بیڈ تک پہنچی تھی۔ ”سائنڈ ٹیبل کی وراز میں فرسٹ ایڈ باکس ہے۔ ذرا پکڑا دیں مجھے۔“ پاؤں پر ابھی بھی اس کی گرفت مضبوط تھی۔ نشان دہی کی گئی وراز میں سے باکس نکال کر وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔ وہ اس کی ٹی کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہ کافی حد تک خود پر قابو پا چکی تھی۔ ”ایک گلاس پانی پلیز۔۔۔۔۔“

وہ اس کے پاس سے اٹھ کر پانی لینے چلا گیا۔ اس کے واپس آنے تک وہ کسی چیز سے ناخن اکھاڑ کر الگ کر چکی تھی۔ چہرے پر اذیت، جھنجھٹ اور آنکھوں سے بہتا پانی اسے لگا وہ اسے جانتا ہی نہیں۔ ”یہ کیا کیا آپ نے؟“ اسے شاک لگا تھا۔

”ان کا تعلق ہمیشہ رہنے والا نہیں تھا اور جب تک رہتا تکلیف ہی دیتا۔ سو اپنے لیے تکلیف کا دورانہ مختصر کیا ہے۔“ انگوٹھے اور پاس پڑے ناخن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاؤں پر پٹی لپیٹتے وہ کہہ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے اب گھر چلا جائے“ گہری سانس بھر کر اس نے خود کو نازل کرتے ہوئے کہا

تھا۔ کیا تھی یہ لڑکی۔ نا قابل یقین۔  
”ٹھیک کہا۔ کھانا تو اب میں بنا نہیں سکوں گی۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔

”انتابھی ضبط کرنے کی کیا ضرورت ہے حرا؟ میں جانتا ہوں آپ تکلیف میں ہیں پھر ہلکی کا ٹکلف کیوں؟“ اسے حرا کی ہنسی سے دکھ پہنچا تھا۔  
”آپ نے سنا نہیں مرہم ہر گھر میں ہونہ ہو، نمک ہر گھر میں ہوتا ہے۔“

”میرے پاس آپ کے لیے مرہم ہی ہوگا، نہیں تو اتنا یقین کر لیں میں نمک پانی کرنے والوں میں سے نہیں۔ اگر بوجھ اتنا بڑھ جائے کہ اپنا آپ دب جانے کا، کھو جانے کا خدشہ ہو تو بانٹ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ بعض اوقات جو بات ہمارے لیے بوجھ بنی ہوئی ہے سننے والا اسے آپ کے لیے ہوا سے ہلکا کر دیتا ہے۔ نہ تھکا میں خود کو پلیز۔“ اس کا دھیمبا لہجہ، اس کے لفظ ایسے آج تھے جو جلاتے نہیں تھے لیکن پگھلا دینے کی صلاحیت رکھتے تھے اور کون جانے حرا منصور نے پگھلا شروع کر دیا ہو۔

☆☆☆

علیہ کا رشتہ دیکھنے کچھ لوگ آرہے تھے۔ گھر میں اچھی خاصی رونق ہو رہی تھی۔ رشتہ باموں کے کسی دوست کے بیٹے کا تھا اور بہت امید تھی کہ رشتہ ہو جائے گا۔ اسی لیے بہت اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ناٹو بھی ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے ساتھ تھیں۔ پاؤں میں تکلیف کی وجہ سے وہ کمرے میں ہی تھی۔ درد اتنا بھی نہیں تھا لیکن مامی نے خود ہی اسے آرام کا کہہ کر باہر آنے سے منع کر دیا تھا سو ابھی وہ اکیلی ناٹو کے کمرے میں بیٹھی بے زار ہو رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسے نیند آنے لگی تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کی ہی تھی جب کمرے میں کسی کی موجودگی محسوس کر کے وہ اٹھ بیٹھی۔ ذیشان وروازے میں کھڑا تھا اور اس کی نظریں حرا کے چہرے پر تھیں۔

”آپ سو رہی تھیں، میں بس جانے ہی لگا تھا۔“ حرا کو لگا جیسے وہ وضاحت دے رہا تھا۔

”سو نہیں رہی تھی۔ ہاں بس ابھی آنکھ لگی تھی۔“ معصومیت سے اس نے جیسے غلطی کا اقرار کیا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے آنکھوں میں بجی نیند کا خسار گلابی ڈوروں کی صورت تیر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ترتیب ہی میں دکھائی دیتی تھی۔ چاہے رات کے بارہ کا وقت ہوتا یا صبح کے پانچ کا۔ یہ پہلی بار تھا جب ذیشان نے اسے بھری بھری حالت میں دیکھا تھا۔ پوٹی سے نکل کر بال بے ترتیبی سے چہرے کے گرد گرے ہوئے تھے۔ شرٹ پر بے شمار سلومیں نظر آرہی تھیں۔ وہ بے ساختہ ہنسا۔

”خیریت۔ اس نے باباں ابرو اٹھا کر پوچھا۔  
”دبی تو پوچھنے آیا ہو۔ ٹھیک ہیں آپ۔“  
”جی ٹھیک ہوں اللہ کا شکر۔“  
”دیئے جس بہادری سے آپ نے ناخن کو کھینچا تھا اس ظلم کی مجھے آپ سے توقع نہیں تھی“ جانے شکوہ تھا کیا کیا۔

”بہادری بھی کہہ رہے ہیں اور ظلم بھی پہلے سوچ لیں آپ کو لگتا کیا ہے اور تو بے تو آپ کو رکھنی ہی نہیں چاہیے، تو قاتل ٹوٹیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ناں۔“

وہ پھر ہنسا۔ ”میں تو سب بھول گیا ہوں۔ اب نئے سبق پڑھ رہا ہوں۔“ آہستہ سے کہتے وہ واپس مڑ گیا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتے عبدالبارط نے ایک نظر ٹھٹک کر ذیشان کو اور ایک نظر اس کے پیچھے بستر پر نیم دراز حرا کو دیکھا اور بنا کچھ کہے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کے دد کا وقت تھا۔ اندھیرے نے ہر خوش رنگ منظر کو سیاہی کا ایک وہابا بنا ڈالا تھا۔ وہاں ہاؤس کے باسی خواب دگر گوش کے مزے لوٹ رہے تھے لیکن کوئی تھا جو رات کے اس پہر گھٹ گھٹ کر رونے پر مجبور تھا۔ گھٹے سینے سے لگائے کروٹ پر لیٹی حرا نے آواز رو رو رہی تھی۔ شام میں لاؤنج میں ہونے والی گفتگو اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی

علیشہ کا رشتہ بچا ہوا تھا اور گھر کے بڑے بیٹے  
ہونے کے ناطے مامی کو باسط کی شادی کا بھی خیال آ  
گیا۔ باسط کے لیے انہوں نے حرا کی بات کی تھی۔  
باسط جو دوست کے ساتھ ڈنر پر جانے کے لیے نکل  
رہا تھا ان کی بات سن کر لاؤنج میں ہی چلا آیا تھا۔ حرا  
کچن سے چائے بنا کر لا رہی تھی جب اس نے باسط  
کی آواز سنی۔ آواز بھی یا صورت اسرافیل۔ وہ اپنی جگہ پر  
بیٹھ کر ہنس رہی تھی۔

تکوئی آسمان تھا جو سر پر گرا تھا۔ کیسے بے بنیاد  
الزام لگا تھا اس پر۔ علیحدہ والا معاملہ تو اپنی دانست  
میں وہ ختم کر چکی تھی۔ آج پتا چلا کہ اس کا دامن تو ابھی  
بھی داغ واریں تھا اور شیریں۔ وہ تو چھوٹا، بالکل چھوٹا  
ساجھائی تھا اس کا۔ اوہ میرے اللہ۔ کون تھا کون نہیں تھا  
اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ کس نے کہا کیا کیا سنا وہ نہیں  
جانتی۔ وہ چیپ چاپ کرے میں آکر سوتی بن گئی تھی۔

یہ سچ تھا کہ ذیشان کے نرم لہجے اور پرشوق  
 نگاہوں سے وہ بہت پہلے اس کے دل کا حال جان گئی  
 تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ اس نے کبھی اس کے جذباتوں  
 کی پذیرائی تو کیا اسے اس بات کا احساس بھی نہیں دیا  
 تھا کہ وہ اس کی ہمارا ہو چکی ہے۔ اگر وہ اسے خاموشی  
 سے چاہ رہا تھا تو یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا اور وہ کیوں کسی  
 کے فعل کے لیے جواب دہ ہوتی۔ اس نے پہلا فیصلہ  
 ہی غلط کیا تھا سوا ب سدھارنا بھی اسے ہی تھا۔ بہت  
 رو چکی تھی وہ پر اب نہیں۔ چپکے سے اٹھ کر اس نے نانو  
 کا فون اٹھایا اور مناسب الفاظ کے انتخاب سے ایک  
 پیغام لکھا، ذہن نشین نمبر کو ایک بار دل میں دہرایا اور  
 آنکھیں بند کر کے بھیج دیا۔ بھجوا گیا پیغام مٹا کر فون

وہ ٹریک پر پاگلوں کی طرح بھاگ رہی تھی۔  
صبح کی خنک ہوا میں بھی اس کا ذوق پینہ پینہ ہو رہا  
تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کا پینہ نہ کر بہہ جانے  
کا ارادہ ہو۔ اوائل سیرا کا سورج اونچا ہو کر اس پاگل  
لڑکی کو دکھ رہا تھا۔ اس دائروی ٹریک پر بھاگتے وہ  
زندگی کے دائرے سے نکلنے کی کوشش میں تھی۔ بے  
تجربہ بھاگنے کے بعد بھی وہ اسی مقام پر آ جاتی تھی جہاں  
سے آغاز کیا تھا۔ چہرے پر سخت حقیرانہ تاثرات لیے  
بے نیازی سے وہ بھاگتی ہی چلی جا رہی تھی۔

”میرے اللہ۔“ گالوں پر بہتے آنسوؤں کے ساتھ نانو نے بے اختیار اللہ کو پکارا تھا۔ تھکے جسم نے ساتھ دینے سے انکار کیا تو شل ٹانگوں کے ساتھ وہ نانو کی طرف آگئی۔ دونوں کے درمیان کیسا خاموش معاہدہ تھا کچھ نہ بوجھنے اور کچھ نہ بتانے کا۔

چوڑی طویل گھر کو جانی مشرک مڑتے ہی حرا کی نظر مین گیٹ کے سامنے بائیک پر بیٹھے ڈیٹان پڑی۔ اس کے پاس ایک لڑکا کھڑا تھا جس کے چہرے پر بیاہ ماسک تھا۔ قریب ہی ایک اور لڑکا ایسے

”شیری۔ شیری باہر آؤ۔ ویشان اٹھیں۔ آکھیں کھولیں ہم آپ کو اسپتال لے جا رہے ہیں۔“ اس کے آنسوؤں نے ویشان کا بھی چہرہ بھگو دیا تھا۔ پوری ہمت سے ویشان نے آکھیں کھول کر اس پری دش کو دیکھا۔ اس کے بعد اس کی آکھیں بند ہو گئی تھیں۔ زینب اس کا چہرہ چتھپتا رہی تھیں۔ گھر میں موجود سب افراد باہر نکل آئے تھے اور بد قسمتی سے ان میں گھر کا کوئی مرد شامل نہیں تھا۔

”شیری کہاں ہے؟“

”وہ تو کالج چلا گیا۔ مم..... میں ایسبیلنس کال کرتی ہوں۔“ سین اندر بھاگی۔

”رکو..... رکو جاؤ۔ بہت خون بہہ رہا ہے۔“  
سننے میں گولی لگی تھی جبکہ بائیک سے گرنے کی وجہ سے  
سرگٹ کے پہلو میں کٹڑے ستون سے جا کر لایا تھا۔  
خون بے تحاشہ بہ رہا تھا۔ وہ مضطرب سی اٹھی۔

”آپ مل کر انہیں بانٹ کر پٹھانیں علیحدہ تم  
سنجھال کر پیٹھ جانا میں بانٹ کر پرلے جانی ہوں۔“  
ہامی سمجھ رہی تھی وہ اپنے حواسوں میں نہیں جبکہ ابھی تو  
وہ حواسوں میں لوٹ رہی تھی۔

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
فہرست کتب	شاہزادہ جہانگیر	500/-
تجلیات	شاہزادہ جہانگیر	250/-
ہم سفر	فرحت اللہ خان	400/-
بہارِ عالم	فرحت اللہ خان	250/-
سازِ جہانگیر	فرحت اللہ خان	500/-
سازِ جہانگیر	فرحت اللہ خان	350/-
سازِ جہانگیر	فرحت اللہ خان	300/-
سازِ جہانگیر	آریہ سماج	400/-
سازِ جہانگیر	آریہ سماج	400/-
سازِ جہانگیر	میرزا جہانگیر	200/-
سازِ جہانگیر	میرزا جہانگیر	180/-
سازِ جہانگیر	میرزا جہانگیر	450/-
سازِ جہانگیر	ملک	300/-
سازِ جہانگیر	ملک	120/-
سازِ جہانگیر	ملک	300/-
سازِ جہانگیر	فرحت اللہ خان	300/-
سازِ جہانگیر	آریہ سماج	300/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	500/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	180/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	180/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	250/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	150/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	350/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	300/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	400/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	400/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	300/-
سازِ جہانگیر	رضا خان	400/-

بانیک سیدھی کی اور بیٹھ کر ہیملٹ پہن لیا۔ سب کی مدد سے ذیشان کو بانیک پر بٹھایا گیا۔ علیحدہ سے اسے پیچھے سے گلے سے لگا کر قابو کر رکھا تھا۔ اس کا چوڑا سینہ حرا کی پشت سے جڑا تھا۔ دونوں کے لیے اس کا وزن سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اس کے باوجود ہمت کر کے وہ اسے ایک پراسٹیوٹ ہسپتال لے آئی تھیں۔ اگرچہ پولیس کیس تھا لیکن پیسے کی اہمیت سے کسے انکار ہے؟

علیحدہ سے سین سے لیے فون سے گھر فون کر کے ہسپتال کا بتا دیا تھا جس کی وجہ سے تھوڑی دیر میں ہی یاموں اور مای وغیرہ آگئے تھے۔

”گوئی کندھا چپ کر رکھ گئی تھی۔ اب صرف زخم ہے جس کی پٹی کر دی گئی ہے اور سر پر لگی چوٹ سے زیادہ خون بہا تھا غالباً اسی کی وجہ سے بے ہوش ہوئی تھی۔ وقت پر لے آنے کی وجہ سے بچت ہو گئی ہے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر کے رٹے رٹائے جملے اس وقت کسی نعت سے کم نہیں تھے۔ سب نے اللہ کا شکر ادا کر کے شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے دیکھا تھا مگر وہ وہاں بھی نہیں گئی تھی؟

وہ تو ان سب کے وہاں پہنچتے ہی گھر واپس آگئی تھی۔ وجود شکل اور طبیعت بری طرح مضحک تھی۔ اسے ڈھیر ساری تنہائی کی ضرورت تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ایک بار تو ٹھٹک کر رک گئی۔

”السلام علیکم ابو۔“ چار قدموں کا فاصلہ طے کرنے میں سانس پھولنے لگی تھی۔ سامنے کھڑا شخص وہی تھا، جس کا نام اس کے نام کی پہچان تھا منصور احمد۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار دیتے ہوئے اسے پہلو سے لگایا۔ ناٹو ٹنگ سی بستر پر بیٹھی تھیں تو حرا منصور احمد کے زندہ ہونے سے جا بھر گئی۔

”میں تمہیں لینے آیا ہوں کتنا وقت لگے گا پیکنگ میں۔“ ناٹو کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے نرم

لہجے میں انہوں نے حرا سے پوچھا۔  
”بس پانچ منٹ۔“ ناٹو سے نظر جراتے اندر چلی گئی۔

حرا کی بات سے ناٹو کو اتنا شاک لگا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو انہوں نے اتنے یقین سے منصور احمد سے کہا تھا کہ حرا اس کے ساتھ جانا تو دور اس کی طرح دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرے گی۔ ایک باپ کے ہوتے ہوئے اس نے قیموں کی طرح زندگی گزار لی تھی۔ اب وہ کیسے اس باپ کے ساتھ جانے کو راضی ہوگی۔ انہیں تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے اور حرا جاتی ہے اور یہ بھی کہ اسی نے رات بیچ کر کے انہیں بلایا تھا۔

”مجھے معاف کیجیے گا نا تو میں نے کوشش کی تھی آپ کے ساتھ، آپ کے پاس رہنے کی لیکن ہر کوشش کامیاب تو نہیں ہو سکتی نا۔“ اس کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔ چند ماہ نے ہی اس لڑکی کو اتنا بے حال کر دیا تھا کہ وہ چاہے اسے روک نہ پائیں اور حرا منصور خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل گئی۔

☆☆☆

بہت پہلے ہی اس نے ماں کے دکھوں کا پوچھ بانٹ لیا تھا۔ منصور احمد کی طلب کوئی اور تھی لیکن والوں نے زبردستی ماہ جبین ان کے لیے باندھ دی تھی۔ دو سال تک انہوں نے مختلف حیلے بہانے اپنے ان چاہے سرال والوں کو تنگ کر کے رکھا۔ لیکن جانے وہ کس مٹی سے بنے تھے کہ ماہ جبین کو پھر بھی ان کے سنگ رخصت کر دیا۔ وہ نہیں جانتے تھے اس رخصتی کے لیے ماہ جبین نے کیا قیمت چکانی ہے۔ ماہ جبین کو اگر ان کی دلی وابستگی کا علم ہوتا تو شاید وہ اپنی ضد سے پیچھے ہٹ جاتیں۔ منصور احمد گھر والوں کے ہاتھوں مجبور انہیں بیاہ تو لائے لیکن بڑی مشکل سے ماں باپ کی زندگی تک اس ان چاہے رشتے کو نبھاتے رہے۔ ساڑھے تین سال کی مختصر مدت کا رشتہ ختم ہونے سے پہلے شاہینہ ان کی زندگی میں بیوہ کی حیثیت سے آچکی تھی۔ انہیں لگا تھا ماہ جبین اسے گھر لوٹ جائے گی۔ وہ نئی زندگی میں کھو کر ا

ہمول چکے تھے اور بھلائے ہی رکھتے اگر شاہینہ انہیں اولاد دینے کے قابل ہوتیں۔ انہیں ماہ جبین کے پاس اپنی بیٹی کی یاد آتی۔ انہوں نے وہاں ہاؤس کا رخ کیا تو منہ کی کھائی پڑی۔ انہوں نے کچھ کہے سے بغیر منصور احمد کو گھر سے نکال دیا تھا۔ پھر ایک اتفاق ہی تھا کہ وہ اپنے گھر اس گھر چلے گئے جہاں انہوں نے کرائے پر ماہ جبین کو رکھا تھا۔ ماہ جبین اپنا زیور اور جہیز قیمتی چیزیں کراس گھر کو خرید چکی تھیں۔ انہوں نے پہلی ملاقات میں ہی دروازے میں کھڑی ماہ جبین کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ حرا نے ماں کے پیچھے سے اس خوش حال شخص کو دیکھا تھا جس کی ایک تصویر کرے کی دیوار پر لگی تھی۔ حرا کو دیکھ کر وہ مانتی بے آب کی طرح چلا تھا لیکن ماہ جبین نے اس کے منہ پر دروازہ دو مارا تھا۔ پھر وہ اکثر آنے لگا۔ بند دروازے کے پار کھڑا صدائیں لگا تا وہ شخص بھکاری نہیں تھا لیکن بھکاری بن گیا تھا۔ اولاد کی خواہش کیسی ظالم تھی۔ وہ اور شادی کر لیتا لیکن شاہینہ کو اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔

ماہ جبین جس نے اتنی اذیتیں اٹھائی تھیں وہ اس شخص کو یہ سکون نہیں دے سکتی تھیں۔ انہوں نے حرا کو سب کچھ بتا دیا۔ اس چھوٹے سے ذہن میں ہر بات غیر جانبداری سے ڈال کر اس سے فیصلہ مانگا تھا اور اپنے حق میں جو اب سن کر آسودہ ہو گئی تھیں۔ انہیں یقین تھا منصور ان سے حرا کو جبین نہیں سکتا اس کے باوجود انہوں نے حرا کو ایک مرد کی طرح پالا تھا۔ نزاکت اس کے قریب بھی نہیں آنے دی تھی۔ گھر کے سخت سے سخت کام کے لیے اپنے لفظوں سے ہمت دی تھی۔ اس کے خود پر اعتماد کے پودے کو تناور درخت بنانے میں جان لگا دی تھی۔ زمانے کے موسموں سے لڑنے کے لیے اس کا اندر مضبوط کیا تھا۔ حرا ایک ایسا موم تھی جو اپنی ماں کے بنائے سانچے میں باآسانی ڈھلتا چلا گیا۔ ماں کے بعد اس نے ماں کی خواہش کا احترام کرتے باپ سے دوری بنائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ذہانت سے منتخب تیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

2018

کے شہر

ایک مہینہ

واپسی کے

محبت وہ جذبہ ہے جو ساری کائنات کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اسی جذبہ کو بیان کرتی سیدہ عطیہ زہرہ کی ایک اچھوتی تحریر،

زبان خنجر

اعلاص کی ماری ایک دو شہرہ جو مقام پرستوں میں گمری ہوئی تھی رشتوں میں بد صورتی اور منافقت کا احوال بیان کرتا جاوید راہی کا نثر اعجاز،

یادوں کا محل

بدلے اور جذبات کی آگ میں جلنے شخص کا اقدام راشد بن راحت کے قلم سے،

دھندلی

دنیا میں سب گل ہاتھ لے کر قاتل کا کیا تھا، وہ گل ایک عورت تھی زہرا زین اور زین دنیا میں لہادی کی جڑیں ماہ وش طالب کی کج بانی،

مقید خاک

پراسرار مرزئین سے وابستہ حیرت انگیز واقعات کی بازگشت، ایک شخص کی آپ بیتی

ضواریہ ساحر کی ایک سفر جریا غری مرام میں، اس کی علاوہ ایس ایس کی روایتیں، سسٹیمس اور تجسس سے بہرہ ور 9 مشہور معروف مصنفین کی طبع راہ وترجمہ کھانیاں

ستمبر 2018 کا تازہ شمارہ آج خریدیں

مرنے سے پہلے ماہ جبین نے اسے منصور کا نمبر  
بجھتا دے دیا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے باپ کے  
پاس چلی جائے۔ وہ اس وقت ان کے پاس جانا نہیں  
چاہتی تھی۔ اس کے باوجود کئی راتیں وہ اس کا رڈ کو  
ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی یہاں تک کہ وہ نمبر وہ پتا اس  
کے ذہن میں محفوظ ہو گیا تھا۔ منصور احمد ماہ جبین کی  
وفات پر شہر سے باہر تھا ورنہ یقیناً ممکن تھا کہ وہ مرگ  
والے گھر میں آکر بھلا پھنسا کر اسے اپنے ساتھ چلنے  
پر آمادہ کر لیتے۔ اس نے جان بوجھ کر انہیں لاعلم رکھا  
تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ خود کیا تھا۔ اسے تسلیم تھا کہ یہ  
فیصلہ غلط تھا اور اب اس نے اس فیصلے کو سدھارنا تھا۔  
منصور احمد اس کا باپ تھا، اسے اس کی چاہ تھی۔ اس  
بہی بہتر لگا کہ وہ ان کے پاس چلی جائے۔ اب اگر  
یہ بھی اس کا غلط فیصلہ تھا تو وہ دل و جان سے اس کے  
نتائج بھگتے کو تیار تھی۔

☆☆☆

ذیشان کو اگر علم ہوتا کہ اس حادثے سے حراس  
پر اپنا آپ کھول دے گی تو وہ بہت پہلے ان لڑکوں  
سے کہتا کہ وہ چند روپوں کے لیے آکر اسے گولی  
مار دیں بلکہ وہ تو خوشی خوشی ان کی طلب پوری کر دیتا۔  
اس پر بھی روتی ہوئی حرا کے آنسو اس کے  
چہرے پر بھی گرے تھے۔ وہ ذیشان حیدر کے لیے  
بے چین تھی۔ وہ اس کے درد پر روتی تھی۔ اس کے  
بازو پر سر رکھے اگر دم بھی نکل جاتا تو وہ یہ سمجھتا کہ اس  
کی زندگی نے اس کی آخری خوشی پوری کر کے اپنا حق  
ادا کر دیا۔ وہ گھر آیا تو پتا چلا حرا چلی گئی ہے۔ گویا  
خوشیاں ذیشان حیدر کے لیے بھی ہی نہیں۔ علیہ کی  
زبانی اسے وہ سب پتا چلا تھا جو تائی ای کی خواہش پر  
باسط نے کہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ باسط کے  
انکار پر خوش ہو یا حرا کی تذلیل پر روئے۔ علیہ کی  
منگنی والا معاملہ تو بابا نے بند دروازے سے پیچھے مٹا  
اور اس کے سامنے پھول کر رکھ دیا تھا۔ علیہ نے اپنی  
غلطی قبول بھی کر لی تھی اور شیری..... نہیں۔ حرا منصور  
ایسی نہیں تھی۔ اس کا دل جانتا تھا۔ ہاں اگر اس کا نام

ذیشان کے ساتھ لیا گیا تھا تو صرف وہی جانتا تھا کہ  
یہ سب بے بنیاد تھا۔ اسے اپنے لیے ایسے بے حال  
ہونے دیکھنے سے پہلے تو وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس  
کی حرا کی زندگی میں کوئی اہمیت ہے۔ ہو سکتا ہے یہ  
اس کے وہم ہی ہو۔ شاید اس کی جگہ گھر کا کوئی اور فرد  
ہوتا تب بھی اس کا یہی رد عمل ہوتا لیکن دل تو خوش فہم  
ہی تھا ناں۔

اس نے انتظار کیا تھا کہ شاید زینب اس سے  
اس معاملے پر بات کریں۔ لیکن زینب اتنی پامال نہیں  
تھیں۔ باسط جس لڑکی کو مسترد کر چکا تھا وہ اسے  
ذیشان کے لیے کیسے قبول کر لیں اگرچہ ان کا دل  
نہیں مانتا تھا کہ حرا کا شیری یا ذیشان سے کوئی ربط رہا  
ہوگا۔ حرار یقیناً نہ بھی کرتیں تو اپنے گھر کے بچوں پر  
انہیں پورا یقین تھا اور کچھ بھی ہو سکنے کے امکان کو نظر  
میں رکھتے ہوئے انہوں نے ذیشان سے اس معاملے  
پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا  
اپنے منہ سے اقرار کرے کہ ان کا بھرم توڑ دے۔ ہاں  
یہ اور بات کہ ذیشان حیدر نے پہلی بار ماں کے سامنے  
اپنی خواہش سیر اور نظر اٹھا کر رکھی تھی۔ وہ تو اسے دیکھ کر  
جبراً ان رہ گئی تھیں۔ ان کے سامنے کھڑا ان کا اپنا بیٹا تھا  
انہیں خود کو یقین دلانا پڑا تھا۔ وہ نہ تو اکھڑتا نہ ضدی  
لیکن اس کی بات میں ایک عزم تھا، التجا تھی۔ انہوں  
نے بار بار اس کی خواہش کو رد کیا اور وہ بار بار ان کے  
باس آتا رہا یہاں تک کہ الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ ان  
کے پاس اب بھی آتا تھا لیکن اب اس کی زبان نہیں  
نظر سوال کرتی تھی۔

☆☆☆

گھر میں علیہ کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا  
تھا۔ منگنی کے بعد سے ہی جبین کی تیاری شروع ہو گئی  
تھی لیکن اب تو تمام لڑکیوں کو اپنے کپڑے اور  
کپڑوں کے ساتھ کی میچنگ چیزوں کی فکر ستارتی  
تھی۔ بارات کے لیے ہال بک کر دیا گیا تھا لیکن  
مہندی کے لیے لڑکیاں کسی طور پر بھی ہال کے لیے  
راضی نہیں ہوئی تھیں۔

”دس بجے تو ہال کا ٹائم ختم ہو جاتا ہے اور دس  
بجے تک تو ہمارا فنکشن شروع بھی نہیں ہوتا۔ سب کی  
منتظرہ رائے یہی تھی اسی لیے مہندی کے فنکشن کے  
لیے گھر ہی سجایا گیا تھا۔ گیندے کے زرد پھولوں اور  
سرخ مہین پکڑے کے پردوں سے سجاد کی کئی  
تھی۔ فنکشن کے لیے لائن میں انتظام کیا گیا تھا۔  
وسیع لان کو دو حصوں میں تقسیم کرتی سرخ کارپٹ کی  
رہ گزر بنائی گئی تھی جس کی اطراف میں خواب ناک  
سبز روشنی کے گلوب تھے۔ رہ گزر کے اختتام پر سرخ  
وسفید پھولوں سے نشست کی چھت بنائی گئی تھی۔  
اطراف میں انہیں پھولوں کی لڑیاں تھیں۔ نشست  
کے علاوہ پورا لان نیم تاریک تھا۔ نشست پر دو دھیا  
سفید روشنی تھی۔ علیہ ردائی پہلے رنگ کے جوڑے  
میں ملبوس خود بھی زرد پھول لگ رہی تھی۔ ہر تھوڑی  
دیر بعد وہ مضطرب سی ادھر ادھر نظر دوڑاتی۔ اسے حرا کا  
انتظار تھا۔ دادو سے منصور احمد کا پتہ لے کر اس نے حرا  
کے نام شادی کا کارڈ پوسٹ کیا تھا اور اسے یقین تھا  
کہ حرا ضرور آئے گی۔

تقریب شروع ہونے میں وقت تھا۔ مہندی  
لگانے کے لیے بار بار سے لڑکیاں بلوائی تھیں۔ جب  
وہ آئیں تو ان کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ چہرہ  
شناس تھا لیکن وہ پہچان نہیں پائی۔ چند سیکنڈ کے بعد  
ذہن میں حرا کی شبیہ ابھری تو علیہ کی چیخ نکل گئی۔  
جامہ دار کے برعکس سرخ غرارے پر آدمی آستین والی  
اوپن شارٹ شرٹ کمر تک آتے بالوں میں بڑے  
بڑے کرل لہریں کی پیدا کر رہے تھے۔ مائیک سے نکلتی  
چھوٹی سی ہندیا کشادہ ماتھے پر چمک رہی تھی۔ وہ اس  
وقت وہ حرا گنگ ہی نہیں رہی تھی جسے وہ سب جانتے  
تھے۔ اس کے کپڑوں اور میک اپ کا لحاظ کیے بغیر  
علیہ بری طرح اس کے گنگے لگی تھی۔

”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔“ اسے زور  
سے سمجھتے ہوئے وہ بولی تو حرا مسکرا دی۔  
باری باری وہ سب سے ملتی تھی اور یہ بھی شکر کہ  
گزری باتوں کا کسی نے ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی نے بھی

اس کے خاموشی سے چلے جانے کی وجہ نہیں پوچھی  
تھی۔ جہاں سب ہی اس کے خالص لڑکی والے  
روپ سے حیران تھے وہیں سب ہی نے جی پھر کر اسے  
سراہا بھی تھا۔ آج تو اس کے چھب ہی زبانی تھی۔ نا تو تو  
ویسے بھی اس کے صدقے واری جانتے نہیں چھکتی تھیں  
آج تو وہ لگ بھی اتنی پیاری رہی تھی۔ اپنی تیس سالہ  
زندگی میں یہ پہلی شادی تھی جس میں وہ شریک ہوئی  
تھی۔ سب کچھ بھلا کر وہ خوش تھی۔ لان کے ایک  
کونے میں بیٹھی وہ یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی  
جب رانی آکر اس کے سر پر سوار ہوئی۔

”چلیں مہری تھوڑی سیلپ کروا دیں، مہندی  
کی پٹیلیں نیچے لانی ہیں۔“ وہ اس گوشہ عایت سے نکلتا  
نہیں چاہتی تھی۔ یوں بھی اس کا لباس اس کے لیے  
امتحان بنا تھا۔ بہت سے بہانے بناتے اس نے بہتیرا  
منع کیا لیکن وہ اسے لیے بغیر گئی نہیں۔ بمشکل اپنے  
کپڑے سنبھالتی وہ اس کے ساتھ چل دی۔

دونوں ہاتھوں میں مہندی کی پٹیلیں پکڑے وہ  
سیڑھیوں سے اتر رہی تھی۔ دو پٹا فرنیال نے کندھے  
سے لے جا کر کمر پر باندھ دیا تھا، اس کے باوجود  
غرارے سے انھیں ہو رہی تھی۔ اس کا دھیان  
کپڑوں کی طرف ہوا تھا جب کسی لڑکی کے پاس سے  
گزرنے پر اسے لگا سا دھکا لگا اور اپنے غرارے سے  
الچھ کر وہ توازن کھو بیٹھی۔ مہندی کی پٹیلیں ہلکے سے شور  
سے زمین پر جا پڑی تھیں اور وہ اوپر آنے کے لیے  
پہلی سیڑھی پر قدم رکھے باسط پر۔ شاخ گل کی طرح  
چمکیلا بدن اپنی فطری خوشبو کے ساتھ اس کی بانہوں  
میں جھول رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ مہک سا گیا ہو۔  
اس کے حواس اس کے ساتھ نہیں تھے۔ اگر وقت روکا  
جا سکتا تو وہ یہیں روک لیتا۔ اس کی بند آنکھیں ایک  
دم سے کھلی تھیں اور باسط کو کرنٹ لگا تھا۔ ایک لمحے کی  
تاخیر کے بغیر وہ پھٹکی کی طرح تڑپ کر اس کی بازوؤں  
سے لگی تھی۔ ایک نگاہ غلط بھی اس پر ڈالے بغیر وہ  
وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ کیوں اس کو کوئی وضاحت  
دیتی۔ مہندی کی پٹیلیں وہیں پڑی تھیں اور وہ اسی



سیڑھی پر کھڑا تھا۔

”حرا.....!“ سرگوشی کی صورت اس کے ہونٹوں سے اس کا نام ادا ہوا تھا تو یہ حرا بھی خوش گوار سی چیزت نے اسے گھیر لیا تھا۔ حرا کے جانے کے بعد ممانے باسط کے روپے پر بہت افسوس کیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنے قہقہے پر نظر ثانی کر لے۔ آخر اس کی ماں تھیں اور جانتی تھیں کہ اس کے لگائے سب الزام بے بنیاد اور جھوٹے تھے۔ تب اس نے نخوت سے منہ پھیر لیا تھا۔ اور اب اس ایک لمحہ میں فیصلہ از خود ہو گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے گیا لھر سوتے وہ آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

تقریب دور سے دیکھتے ہوئے بھی وہ بے حد لطف اندوز ہوتی تھی۔ باری باری سب لڑکیوں نے اسے بلایا بھی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔ ان کپڑوں کی وجہ سے جو ہو گیا تھا وہ کافی تھا۔ وہ مزید کوئی تماشا نہیں چاہتی تھی۔ سب لڑکیوں نے مہندی لگا لی تو بے حد اصرار سے حرا کے ہاتھوں پر بھی مہندی لگا دی۔ یہ پہلی بار تھا جب حرا نے اس کی ایسی مہکائی تھی۔ رات کافی بیت چکی تھی اور کسی کے سونے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ پوری کوشش کے بعد بھی دو بجے تک اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگی تھیں۔ نانوکا دھر ا دھر دیکھا لیکن وہ نظر نہیں آئیں تو وہ ان کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوں گی لیکن وہاں کسی کو ناپا کروہیں لیٹ کر سو گئی۔

مہندی کی تقریب ختم ہوتے ہوتے سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ذیشان بھی کام نمٹا کر سونے کے لیے کمرے میں آیا تھا جب ایک خواب کو بستر پر سوتے دیکھا۔ کھلے بال اس کے سینے پر بکھرے تھے۔ ایک ہاتھ سینے پر اور دوسرا اس کے پہلو میں تھا۔ لمبی انگلیوں کی پوریں مہندی سے سرخ ہوئی تھیں۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ حرا..... یہاں..... اس کے کمرے میں۔ اس کا دل جیسے دھڑکنے لگا ہوا تھا۔ شاید اس کی نیند کے احترام میں کہ نہیں دھڑکنیں

اس پری وٹس کے آرام میں مل نہ ہوں۔ سر دیوں دادو سے بیڑی کی گرمانش برداشت نہیں ہوتی تھی اس لیے سردی کے کچھ مہینے وہ ان کے ساتھ کمرہ بدل کر رہا تھا۔ اسی غلط فہمی کی وجہ سے وہ یہاں بھی۔ سنو راپوٹ لیے اس کی خواہش اس سے چند قدم دوری پر تھی۔ وہ اس کے قریب ہوا۔ اس کی پرشوق نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ سوئی ہوئی بھی کھل کر مسکرائی دی۔

کس لیے تم نیند میں شرما رہے ہو اس طرح خواب میں کیا آگے ہیں ہم تمہارے سامنے بڑی آہستگی سے اس نے شعر منگایا۔ مندی مندی سی آنکھیں کھل کر بند ہوئیں اور اگلے ہی لمحے پوری کھل گئیں۔ پلکوں تلے خوابوں کی پوری دادی سانس لے رہی تھی۔ چشمے کے شیشوں کا جابجی اب تو حائل نہیں تھا۔ اس کے دل کو لگدگی سی ہوئی۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”میں آپ کو سوا ہوا دیکھ چکا ہوں اس لیے میں یہ نہیں پوچھوں گا۔ آپ بتائیں میرے کمرے میں کیوں سو رہی ہیں؟“ اس کا لہجہ شریر ہوا تھا۔

”آپ کا کمرہ؟“ گرون ٹھہرا کر اس نے ارد گرد دیکھا۔

”یہ تو نانوکا کمرہ ہے۔“

”اطلاع کے لیے شکریہ لیکن آپ کو اپنی معلومات اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے کیوں کے سر دیوں میں یہ کمرہ میرے استعمال میں ہوتا ہے۔“

”اوہ۔ سو سو رہی۔“ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بستر سے اٹھی تھی۔

”آپ جا چیں تو یہاں سو سکتی ہیں“

”نہن..... نہیں۔ شکریہ۔ مجھے پتا نہیں تھا۔“

تھا۔ پہلا قدم اٹھاتے ہی وہ ڈمک گئی۔

”سنبھل کر۔“ لوہیتی نظروں سے نکتے ذیشان نے اس کے بازو پکڑ کر سہارا دیا۔ وہ اس سے چند قدم دور ہو کر کھڑی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے مسکرائی چاندنی شر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے کمرے کی گرمانش حرا منصور کی نرم بانہوں سے ہوتے ہوئے اس کا دل پگھلا رہی تھی۔ وہ بری طرح نروس ہو رہی تھی۔ جھٹک کر میزوار کر اس نے ہاتھ میں پکڑ لی۔ جانے کے لیے وہ اس کے قریب سے گزری تھی جب بے اختیار ذیشان نے اس کا راستہ روک لیا۔

”ایسے بھی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ بوجھل لہجے میں کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ سب نے اس کی تعریف کی تھی لیکن دل ایسے تو کسی کے کہنے سے نہیں دھڑکا تھا پھر اب کیوں اور اس کیوں کا جواب وہ جانتا نہیں چاہتی تھی یا جانتی تو تھی بس ماننا نہیں چاہتی تھی۔ دھڑکنیں سنبھلتی وہ بارہنگر گئی۔ وہ اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ حنائی خوشبو میں بے نیچے پر اسے باقی کی رات جاگ کر گزارنا تھی۔

☆☆☆

بارات آنے والی تھی۔ ثروت ہال کے دروازے میں کھڑی اس بچہ پر وہن بنی علیحدہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ڈیپ ریڈ کلر کے روایتی لہنگے میں اس کا روپ کسی شہزادی کی طرح دمک رہا تھا۔

”آپ پریشان ہیں ماں؟“ انہیں ایسے گم صم کھڑے دیکھ کر اندرا تا باسط ان کے پاس رک گیا۔

”ارے نہیں۔ پریشانی کس بات کی۔ سوچ رہی ہوں اگر میرا بیٹا ہاں کر دیتا تو آج اس کے بھی سہرے کے پھول کھل جاتے۔“

”آج ہاں کر دوں تو؟ وہ خوش مزاجی سے بولا تو ثروت کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ باسط اور ایسی خوش مزاجی۔ قرب قیامت کی نشانی تو نہیں۔“

”اب تو چھوڑا وقت تو دو۔ میں کوئی لڑکی دیکھ لوں۔ پیاری۔“

”تو جو لڑکی پہلے ڈھونڈی تھی۔ وہ پیش کش ختم

ہو گئی کیا؟“ اس نے بات کاٹی۔ بظاہر اس نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی تھی لیکن ثروت بھی ماں تھیں۔ وہ جانتی تھیں یہ سب بے وجہ نہیں اسی لیے ایک دم چونک اٹھی تھیں۔

”تو کیا میں حرا کے لیے ہاں سمجھوں“

”بالکل۔ دل و جان سے ہاں ہے۔“ سینے پر ہاتھ رکھ کر وہ جھکا۔

”لیکن۔ تم نے تو کہا تھا.....“ انہوں نے جان بوجھ کر بات ا دھوری چھوڑ دی تھی۔

”بھول جائیں ماما! وہ..... وہ سب جھوٹ تھا۔ آئی ایم سوری۔ میں اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ آپ بس جلدی سے بات کہی کریں۔“ ان کے پہلو میں کھڑے باسط نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالی کر لاڈ سے ان کے کندھے پر سر رکھا۔

”ضرور بیٹا! بس ذرا شادی سے فارغ ہو لیں تو میں اماں سے بات کرتی ہوں کہ وہ منصور سے بات کریں۔ ظاہری بات ہے حرا ان کی بیٹی ہے۔ اور ان کے پاس ہے تو ان سے پوچھنا پڑے گا۔“ انہیں نے سوچتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”آئی لویو ماما! اور ابا بیٹھ ماما ان داور لڈ۔“ اندرا آتی ہوئی زنب نے ایک ایک لفظ بغور سنا تھا۔ تو اب عید الباسط بھی اس کا طلب گار ہوا تھا۔ اس سے بہتر موقع انہیں کب مل سکتا تھا باسط کی خواہش پر

ذیشان کی خوشی کو نو قیامت سے کر جیٹھانی کو نیچا دکھانے کا۔ بیٹی کی رخصتی کو بھول کر ان کا دماغ نئے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گیا تھا۔ انہیں جو بھی کرنا تھا بچے

بیروں پر اور جلدی کرنا تھا۔ ذیشان کئی بار ان کے سامنے اپنی خوشی کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ وہ جانتی تھیں اس کی طبیعت میں لہروں کی شوریدگی نہیں، وہ گہرا اور ٹھہرا سمندر ہے۔ وہ تو بھی اپنی ضرورت کے لیے بھی

ان تک نہیں آیا تھا لیکن حرا ایک ایسی خواہش، ایسی خوشی تھی جس کے لیے وہ بار بار ان تک آتا رہا، اس کی ہر نظر سوال بن گئی تھی۔ اب وہ اس کی خواہش پوری کر کے پوری زندگی کے لیے اس کے آگے سرخرد ہو سکتی

تھیں۔ حراسے تو انہیں پہلے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ فوراً ساس کے پاس جا چکی تھیں۔ ایک وہی تھیں جو اس معاملے میں ان کی مدد کر سکتی تھیں۔ آخر ان کی انکوائری اور پیاری نواسی کا معاملہ تھا۔ پھر لڑکا بھی ڈیشان جیسا ہیرا تھا وہ ہیرا جسے کسی تراش کی بھی ضرورت نہیں تھا۔

حسب توقع وہ سن کر ہی خوش ہو گئی تھیں۔ ہتھیلی پر سرسوں بجاتے وہیں ہال میں منصور احمد سے بھی بات کر لی گئی تھی۔ انہوں نے سارا اختیار حرا کو یہ کہہ کر دے دیا تھا کہ اس کی زندگی ہے اگر اس رشتے سے اسے خوشی ملتی ہے تو انہیں وہ اس کی خوشی کے لیے دل و جان سے راضی ہیں۔

حراسے بات کرنے کی ذمہ داری بھی نانوکو سونپ دی گئی تھی۔ زینب چاہتی تھیں کہ جلد از جلد سب کچھ طے پا جائے۔ ان کے دل میں جیٹھانی کی طرف سے ایک خوف سا تھا کہ تاخیر کی صورت وہ جیتی بازی نہ ہار جائیں۔ اسی لیے انہوں نے بار بار تاکید کے ساتھ جلد بات کرنے کا وعدہ لیا تھی۔

علیہ کی رخصتی کے بعد جب گھر آئے تو سارے ہی لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ موضوع غن بلا شہر علیہ کی شادی کی تقریب تھی۔ کس نے کیا پہنا، کون کہاں سے تیار ہوا، کون کیسا لگ رہا تھا، کل کیا پہنا جائے وغیرہ۔ ایسے میں حرا کو وہاں اپنا آپ مس فٹ لگ رہا تھا۔ اسی لیے کچھ دیر زبردستی وہاں بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر نانوکو کے کمرے میں چلی گئی۔ ہائی ہیل کی وجہ سے پیردوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ہیل اتار کر اس نے بال بوتی میں قید کیے اور تبدیل کرنے کے کپڑے نکالنے لگی۔ شکر ہے کپڑوں کی وجہ سے آج کچھ تماشا نہیں ہوا۔ لائے ہوئے کپڑے چھوڑ کر وہ صبح اسٹون درک ٹیٹھ شلوار لے آئی تھی سو کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ وہ چیخ کرنے جا رہی تھی جب شیریں نانوکو کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ انہیں بستر پر لٹا کر وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”اندر کیوں آگئی تھیں؟“

”دیسے ہی۔ مجھے ان جیسی باتیں نہیں آتیں۔“  
 نہ ہی مجھے ان کی باتوں کی سمجھ آتی ہے۔ اس لیے سو وقت برباد کرنے سے بہتر ادھر آ کر سو جاؤں۔“  
 اس کے انداز میں ایسی بے ساختگی اور بھولا پن تھا کہ اس نے بے اختیار اس پر پیارا غبار کیا۔ وہ ڈیشان کے ساتھ حرا کے رشتے کی بات پر اپنا خوش تھیں کہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہی اصل بات کی طرف آگئی تھیں۔

”زینب نے تمہارا رشتہ مانگا ہے ڈیشان کے لیے اور منصور نے سب تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟“

اس کا چہرہ ایک دم بے تاثر ہوا تھا۔ نانوا اندازہ نہیں کر پائیں کہ ان کی بات پر وہ دھکی ہوئی تھی یا ناراض۔ کیوں کہ خوش تو وہ بہر حال نہیں تھی۔

”میرا اس گھر اور اس گھر کے افراد سے جو تعلق ہے میں اسے ہی برقرار رکھنا چاہتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ مجھے کسی بھی نہ رشتے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔“ آہستگی سے کہہ کر اپنے کپڑے اٹھاتی وہ تبدیل کرنے چلی گئی۔  
 اس کا دل چاہ رہا تھا وہ خوب سارا رو لے۔ خوشیوں کی دستک پر اس نے دروازہ تو بند کر لیا تھا لیکن اب محبت کی صدا پر کان کیسے بند کرے؟ ڈیشان کوئی ہیرہ نہیں تھا۔ عام سی شکل و صورت والا عام سا لڑکا تھا اور باسط جیسے خوش شکل کے سامنے کچھ زیادہ ہی عام لگتا تھا۔ اب یہ تو حراجاتی تھی یا اس کا خدا کہ وہ اس کے لیے کتنا خاص تھا۔ انجان دیس میں نظروں سے چھلنی کرتے لوگوں میں دیی تو تھا جو خاموش آنکھوں سے اس کی مسجائی کرتا تھا۔ اتنے پتھر بھوں میں اکیلا پھول برسانے والا بھی خاص نہ ہوتا تو کون ہوتا؟ وہ ان عام سی آنکھوں سے جھلکتے پر خلوص محبت کے جذبوں کی اسیر ہوئی تھی اور اب جب دل میں جھپی دعائیں مستجاب ہونے کا وقت آیا تھا تو اس نے خود انکار کر دیا تھا۔ عبدالباسط سے اسے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اس رات اس نے واپسی کی تیاری شروع کر لی تھی۔ پاپا کو کوئی کام تھا جس کی وجہ سے

انہیں آج ہی واپس جانا پڑ گیا تھا اور اگر نانوا سے پہلے بات کر لیتیں تو یقیناً وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ بے دلی سے ویسے کی تقریب دیکھ کر جب علیہ کو گھر لے کر آئے تو اپنا مختصر سامان اٹھا کر نانوکو اللہ حافظ کہتی وہ وہاں ہاؤس سے باہر نکل آئی تھی۔ پاپا سے کہہ کر اس نے گاڑی منگوائی تھی۔ باہر آ کر اس نے گاڑی کی تلاش میں نظر دوڑانا شروع کی ہی تھی جب سیاہ وٹراس کے عین سامنے آ کر رکی۔

”زیادہ وقت نہیں لوں گا بلکہ اگر کہیں گی تو آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں گا۔ پلیز بیٹھیں۔“  
 ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولے ڈیشان اس احترام سے کہہ رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم آگے بڑھ گئے۔ اس سے بیک پڑ کر اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر رکھ دیا اور آ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ تارکول کی سیاہ سڑک پر گاڑی انجان منزلوں کی طرف چل پڑی۔ خاموشی بڑی خاموشی سے ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ پہلے تو وہ چپ چاپ اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی لیکن جب کافی دیر تک وہ کچھ نہیں بولا تو خود ہی بات شروع کی۔

”آپ کیوں آئے ہیں؟“  
 ”یوں ہی۔۔۔۔۔۔ اس نے سرسری سا جواب دیا۔

”انکار کی وجہ جاننے آئے ہیں؟“  
 ”نہیں انکار کو اقرار میں بدلنے، ایک گہری نظر اس پر ڈال کر اس نے جواب دیا۔ حراسے دل مضبوط کیا تھا۔ وہ کسی کو کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی اسی لیے خاموشی سے نکل رہی تھی۔

”وہ کیسے؟“  
 ”جب تک ڈاکٹر کو مرض نہ بتائیں وہ کس بیماری کا علاج کرے گا؟“  
 ”ڈاکٹر قابل ہو تو مرض کی تشخیص بھی خود ہی کر لیا کرتا ہے۔“  
 ”او کے۔ اب سیدھی بات۔“ گاڑی اس نے

## بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیاں

مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 ماسک مفت

قیمت 300/- روپے

ڈاک خرچ - 50/- روپے

بندوبست ہاؤس

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

ایک جگہ روک دی تھی۔ ”اگر آپ باسط کے لگائے الزامات کی وجہ سے انکار کر رہی ہیں تو یقین کر س جتنا آپ کو ان کے جھوٹے ہونے کا پتا ہے ہم سب کو بھی آپ پر اتنا ہی یقین ہے۔ تاہم ثروت کے سامنے اس نے خود مانا ہے کہ وہ جھوٹے اور بے بنیاد الزام تھے۔ مانے خود سنا تھا۔“ اپنی مرضی کی کانت جھانٹ کر کے زینب نے ذیشان سے بھی ان باتوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ اسے یہی تاثر دے رہی تھیں کہ باسط کی باتوں کی وجہ سے وہ اس رشتے سے انکاری تھیں۔

”حرا! آپ بے فکر رہیں میرے لیے میری خوشی اور چاہت سے بھی اہم آپ کی عزت ہے اور میں کیا یہاں سب ہی آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کی عزت کرتے ہیں۔“

اپنے ہاتھوں پر نظر جما کر بیٹھی حرا حیران ہوئی تھی۔ اس نے تو آج تک خود سے بھی اعتراف نہیں کیا تھا کہ باسط کی باتوں سے دل برداشتہ ہے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ چار دن بھی اس الزام کے ساتھ نہیں رہ سکی تو عمر بھر کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ اعتراف کرتی بھی کیسے؟ اس کا ضمیر اسے ملامت نہ کرتا کہ وہ جو کردار کی بات پر لڑنے کو حق سمجھتی ہے وہ ایسے کیسے سب چھوڑ کر جاسکتی ہے۔

”آپ کو ان سب کی محبت اور عزت کا احساس کبھی نہیں ہوا؟“

”احساس ہے تب ہی تو میں بھی پیار کرتی ہوں“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ نظریں اب بھی اپنے ہاتھوں پر تھیں۔

”آپ سے بھی.....“ بے ساختہ روانی میں کہہ کر اس کی شرارت سمجھ میں آنے پر اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کھل کر ہنسا تھا اور اس کی ہنسی سے حرا بری طرح جھینپ گئی۔ اس کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ اس کے شرمانے کا منظر ذیشان نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔ اس نے ہمیشہ اسے پر اعتماد اور سرانٹھا کر بات کرتے دیکھا تھا۔ سو اس کے لیے اس

کے یہ انداز غیر متوقع تھا۔  
”آپ شرمانی بھی ہیں؟“ اس کے شرمانے سے وہ شوخ ہوا تھا۔  
”کیوں؟ پر اعتماد لڑکیاں بے شرم ہوتی ہیں؟“ وہ سر اٹھا کر فوراً بولی تھی۔ اس کی حاضر جوابی سے ذیشان بہت محظوظ ہوا تھا۔ دونوں کا مشترکہ ہتھیار ہواؤں میں مہکا تھا۔ آسمان پر چاند نے ان کی نظر اتاری تھی۔

☆☆☆

حرا کا اقرار نے گھر بھر میں برقی رد و دوازی تھی۔ ابھی تو علیہ کی شادی کا ہنگامہ تھا تھا کہ ایک اور شادی۔ ارے بھئی نکاح ہی تو شادی ہوتی ہے نا۔ علیہ تو اتنی خوش ہوئی تھی کہ نئے نوے دو لمبے کا بھی لحاظ کیے بغیر اسے ہاتھوں سے پکڑ کر گھما دیا تھا۔ اگرچہ پاپا نے ایک دو بار اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ گھما کر چند دن پہلے یہ معاملات طے پا جاتے تو علیہ کے ساتھ ذیشان کی بھی شادی کر دی جاتی لیکن علیہ خوش تھی کہ بھائی کی شادی اس کی شادی کے ساتھ نہیں رکھی گئی ورنہ اپنے اکلوتے بھائی کی شادی اس نے خاک انجوسے کرنی تھی۔ ثروت اور باسط کے علاوہ سب ہی خوش تھے۔

ثروت پر تو یہ خبر بجلی بن کر گر گئی تھی۔ ان کے تو دہم دگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی ہاتھ سے سب نکل جائے گا۔ ان کے لیے تو دیرا صدمہ تھا۔ وہ سین کے لیے ذیشان کا سوچے بیٹھی تھیں۔ اس بات کو بھلا کر کہ منہ سے کہا تھا علیہ کا باسط کے لیے دیکھ لیں گھر کی بیٹی گھر میں رہ جائے گی۔ علیہ انہیں خود ہی پسند نہیں تھی سو انہوں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھایا۔ حرا کی جگہ کوئی اور ہوئی تو شاید ان کو اتنا دکھ نہ پہنچتا۔ حرا تو انہیں بھی پسند تھی اور اب تو باسط بھی رضامندی دے چکا تھا اور باسط۔ اسے حرا سے محبت تھی پانہیں اس بات کا فیصلہ وقت پر بھی چھوڑ دیا جائے تو فی الحال وہ اس کی شدید ترین خواہش تھی۔ وہ خواہش جو شہرہ گئی تھی۔ نا آبودہ خواہشیں

شدید نہ بھی ہوں تو دل سے نکلنے میں وقت لیتی ہیں۔ اب تو حرا کو رہنا بھی اسی گھر میں اور اس کی نظر کے سامنے تھا۔ یہ ناممل خواہش اس کی بائیں اور ہار قبول کرنا کم از کم اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا اس لیے کسی کے بھی علم میں لائے بغیر اس نے اپنی پوشنگ دوسرے شہر میں کر دالی تھی۔ ابھی تک کے لیے وہ اتنا ہی کر سکتا تھا۔ بہت جلد اس نے ملک سے باہر جانے کا بھی ارادہ باندھ لیا تھا۔ حرا سے نفرت کے ساتھ رہنا اس کے لیے زیادہ آسان تھا۔ کاش وہ اس کے لیے قابل نفرت ہی رہتی۔ کاش اس کے احساس اس کے لیے ناپسند نہ تھے۔ کاش اس نے ماما سے بات نہ کی ہوتی۔ لاتعداد کاش تھے جو اس کی زندگی مشکل بنا رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی جادو کے زور پر خود کو غائب کر لیتا۔ کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو جتنے بھی مختصر ہوں تاوان میں پوری عمر لگ جاتی ہے۔ حرا کی محبت بھی اس کے لیے وہی خواب تھی۔

☆☆☆

منصور احمد کے لاکھ انکار پر بھی نانوں نے ان کی ایک نہیں چلنے دی اور حرا کے نکاح کی تقریب دہاج ہاؤس میں ہونا قرار پائی۔ اصل میں ذیشان چاہتا تھا کہ نکاح کسی میرج ہال یا کہیں بھی اور نہ ہو بلکہ اس پاکیزہ رشتے کی بنیاد اس گھر میں ہی رکھی جائے تاکہ محبت کو امر کرتے ان لمحوں کو وہ جب چاہے کھلی آنکھوں سے جی سکے۔ نانوں نے جس طرح حرا کا انکار سب سے خفیہ رکھ کر اس سے بات کی تھی اور پھر اسے منانے اس سے بات کرنے کا موقع فراہم کیا تھا اسی طرح وہی اس وقت بھی اس کے کام آئیں۔ اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر انہوں نے سب کو چپ کر دیا تھا اور اس طرح ایک بار پھر لان کو نئے سرے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں صرف قریبی رشتہ داروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ رخصتی پر سب کو اکٹھا کر لیا جائے گا۔ سوروشنیوں میں نہانے لان میں چند گئے چنے مہمانوں کی موجودگی میں فی پنگ میکسی

میں ملبوس دہن بنی حرا کے جملہ حقوق ذیشان حیدر کے نام لکھ دیے گئے تھے۔

گلابی رنگت والی کانچ کی گڑیا ذیشان کی پرشوق نگاہوں سے بری طرح شرمارہی تھی۔ اس نے وہاں سب کے سامنے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ تب ہی ماموں کے کہنے پر اسے کھانا کھانے کے لیے سینک اسے اندر لے جانے کے لیے آگئی۔ بھاری زیور اور بڑے سے دوپٹے کے ساتھ کام والی میکسی اور اس پر اس کا میک اپ۔ سب سے بڑھ کر اس کی ہیل۔ دہناپے کے روپ سے اچھتے وہ اچھی تو اس کی نظر دو قدم دور ہونوں میں دبی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ذیشان پر بڑی۔ جلدی سے نظر جھکا کر اس نے تیزی سے قدم بڑھائے اور بری طرح لڑکھڑائی۔ اس کا ہاتھ سین کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ دہن بنی زمین یوں ہو جاتی ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا آگے بڑھ کر ذیشان نے اسے سنبھال لیا۔

قریب سے ہی ”اودو.....“ کی آواز بلند ہوئی۔ ہونٹ کاٹتے وہ اپنی میکسی سیٹ کرنے لگی۔ سینک اس کے پیچھے کھڑی اس کا دوپٹا ٹھیک کر رہی تھی جب سب کی نظر بچا کر ذیشان اس کے قریب ہوا۔

”آپ ڈاؤن رشرٹ ہی پہنا کر پس پھر مجھے بھی آپ کے پیچھے بائیک پر بیٹھنے میں آسانی ہوگی۔ ایسے کپڑے کرے تک کے لیے رکھ لیتے ہیں تاکہ جب بھی گریں مجھ پر ہی گریں۔“ اس کی شوخ نگاہیں حرا کی آنکھوں میں محبت ناسے لکھ رہی تھیں۔ حرا کا چہرہ شرم سے سرخ ہوا تھا۔ اسی وقت فریال نے ہاتھ میں پکڑے کمرے سے اس خوب صورت لمحے کا عکس قید کر لیا تھا۔ محبت نے سنہری خوشبوؤں کی رہ گزر پر قدم رکھ دیے تھے جہاں لمحہ خوشیوں کے چراغ روشن تھے۔

☆☆

نگہت عبد اللہ

# پہلی سچی بیکگراؤں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک نشان ہوتا بھادوچ اور بچوں کی مدد کرتے تھے۔  
حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتے تھے حیدر علی کی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فائزہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔  
حیدر علی کی تین بیٹیاں سہیلہ، خیزہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے خیزہ اور بیلا تھے۔  
سہیلہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خیزہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خیزہ کا خالہ زاد شریل اس کو چاہتا ہے۔ خیزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حیدر علی کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔  
حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ خیزہ کو جاہ مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ریکا اس کو پسند کر لیتی ہے جو قافو قاف خیزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔  
تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زہرا کی بیوی کا بچہ لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضا مند نہیں ہے۔



سونا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خیزہ اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے لیکن وہ خیزہ سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر والے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خیزہ سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خیزہ تیمور کی محبت میں رضا مند ہو جاتی ہے اور حیدر علی کی کم عمری اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خیزہ کو ایک الگ فلیٹ میں بیاہ کر لے جاتا ہے۔

کیا یہ سچی بیکگراؤں





”سارہ بہت شوق سے بچے کی شاپنگ کرتی پھر رہی ہے۔ ابھی بھی اسی سلسلے میں لگی ہوئی ہے۔“ بابا نے سارہ کے لیے اس کی پریشانی سمجھتے ہوئے بتایا پھر اپنا سوال دہرایا۔

”کس کا بچہ ایڈاپٹ کر رہے ہو؟“

”جی وہ..... میرا ایک دوست ہے۔“

”دوست؟“ بابا کی آنکھوں میں ہنوز سوالیہ نشان تھا۔

”آپ نہیں جانتے بابا اسے۔ بوسٹن یونیورسٹی میں ہم ساتھ تھے۔ اور کیونکہ ہمارے شعبے الگ ہیں اس لیے پارٹنر وغیرہ میں ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا نہیں ہے۔“ وہ اب سنبھل کر پول رہا تھا۔

”ہوں۔“ بابا ہنکارا بھر کر جانے کیا سوچنے لگے تو اسے اس موضوع سے ہٹنے کا موقع مل گیا۔

”سارہ کب لگی ہے ما؟“

”شام سے کچھ پہلے..... تم اسے فون کر کے معلوم کر دو کہاں ہے۔“ ماما نے بتا کر کہا۔

”جی.....“ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر پیش کرتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا تو تیل جاتے ہی سارہ کے سیل فون کی ٹون کمرے میں گونجنے لگی۔

تیمور غزنی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر سارہ کے سیل فون پر نظر پڑی تو خاصا بددل ہوا۔

”شٹ.....“ وہ لائن کاٹ کر بیڈ پر ڈھس گیا۔ اب انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لیکن اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ابھی چیخنے کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سارہ شاپرز سے لدی پھندی کمرے میں داخل ہوئی اور اسے جوتوں سمیت بیڈ پر نیم دراز دیکھ کر تجب سے پوچھنے لگی۔

”تم ابھی آرہے ہو جی!“

”نہیں دیر ہوئی۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر اس کے سیل فون کی طرف اشارہ کیا تو وہ معذرت کرنے لگی۔

”سوری..... سوری تمہی! میں سیل لے جانا بھول گئی اور سچ میں خود اتنی پریشان ہوئی۔ یہی خیال رہا کہ تم مجھے کال کر رہے ہو گے اور اسی لیے تو میں جلدی آگئی ہوں۔“

”اچھا رکھو یہ سب اور جلدی سے کھانا لگاؤ میں چلیج کر کے آتا ہوں۔“

وہ اس خیال سے کہ کہیں سارہ اپنی شاپنگ دکھانے نہ بیٹھ جائے فوراً داش روم میں بند ہو گیا اور قصد اس نے شاور لینے میں کچھ دیر لگا لی تھی۔ پھر سیدھا ڈائننگ روم میں آیا تو سارہ کھانا لگا چکی تھی۔

”ماما..... بابا.....؟“ اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ مغرب کے بعد کھالیتے ہیں پھر بھی میں نے ان سے ابھی پوچھ لیا تھا۔“

سارہ کو شاید بھوک لگی تھی اس نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالتے ہی کھانا شروع کر دیا تو وہ بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگا۔ شاید اس لیے کہ خزیہ نہ لاکھ بھوک بھوک چلائی لیکن اس سے پہلے تو زلی تھی، یہ پہلا غیر ارادی سواز نہ تھا۔ جسے لاشعور سے شعور تک سفر کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ کھانے کے بعد جب سارہ بچے کی شاپنگ اسے دکھا رہی تھی تو اس کی نظروں میں خزیہ کا چہرہ سما گیا۔ جس کے چہرے پر چمکتی الوہی خوشی کے مقابلے میں سارہ بھیجی پڑ گئی تھی۔ اور یہاں وہ پھر ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ رات جانے کیا کیا سوچتا رہا اور صبح آفس پہنچتے ہی سو نیا آبی کو فون کیا اور اس کی کھٹکتی آواز سنتے ہی بولا تھا۔

”آپنی میں بہت پریشان ہوں۔“

”کیوں اب کیا پریشانی ہے؟ ما شاء اللہ باپ بننے والے ہو۔“ سونیا کم ہی سنجیدہ ہوتی تھی۔

”ہاں لیکن میری کچھ بھی نہیں آ رہا ادھر خزیہ نے بچے کے لیے اتنی حساس ہے اور ادھر سارہ دن گن رہی

شہرینہ نے آنکھیں بند کی تھیں کان تو بند نہیں کیے تھے پھر بھی اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ غافل آنکھوں کے اندر خوف ناک منظر تھا جس نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ کئی دیر بعد اسے حمزہ کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

”کیا ہوا چپ کیوں ہو گئیں۔ بولو ناں۔“

”حمزہ..... ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں شفاف سڑک پر بائیک سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر اسے حمزہ کی شرارت سمجھنے اور خود پر قابو پانے میں لگی۔ پھر محض اس پر جتانے خاطر کہ وہ خائف نہیں ہوئی تھی کھٹکتی آواز میں پوچھنے لگی۔

”اب ہم کہاں پرواز کر رہے ہیں؟“

”ارے تم زندہ ہو۔ میں تو سمجھا تھا تمہاری روح۔ وہ کیا کہتے ہیں.....“

”دقش غصہ سے پرواز کر گئی۔“ اس نے فوراً غلغلہ مٹا دیا تو وہ بے ساختہ ہنسنا تھا۔

”ہنس لو تمہاری ہنسی تو میں گھر جا کر نکالوں گی۔ ابھی میں صرف انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ سچ حمزہ مجھے نہیں پتا تھا کراچی کی شامیں اتنی خوب صورت ہوتی ہیں۔“ اسے واقعی ٹھنڈی ہوا کھلکھلانے پر مجبور کر رہی تھی۔

”ہوتی تو نہیں ہیں۔ ابھی کیونکہ میں ساتھ ہوں اس لیے تمہیں ہر شے خوب صورت لگ رہی ہے۔“

”اوہو، خوش فہمی تو دیکھو۔“

”دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ۔ خوش فہمی ہے یا حقیقت!“ حمزہ نے کہا تو اس نے جھٹ حمزہ کے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بے وقوف میرے نہیں اپنے دل پر۔“

”میرا دل تو پاگل ہے۔“ وہ کہہ کر ہنسی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

تیمور غزنی کو آج آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ اٹھنے سے پہلے اچانک اسے خیال آیا کہ سارہ نے کال کی۔ اور اسے تو کام میں موع ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن سارہ وہ تو دیر ہو جانے کی صورت میں ضرور کال کرنی تھی۔ قدرے اچھنبے میں سارہ کو کال ملتے ہوئے آفس سے نکلا تھا۔ دوسری طرف تیل جانی رہی لیکن کال رسیڈ ہوئی۔ جس سے متوجش ہو کر وہ تمام راستہ بار بار ٹرائی کرتا رہا لیکن جواب نہ ارد۔ پھر گھر آتے ہی وہ تقریباً بھابھ قدموں سے اپنے کمرے میں آیا تھا۔

”سارہ.....!“ اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

”سارہ.....“ کمرہ ڈزیننگ روم، داش روم وہ کہیں نہیں تھی۔

”کہاں چلی گئی۔“ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اٹنے بیروں ماما سے پوچھنے ان کے کمرے میں آیا تو بابا وہیں موجود تھے۔

”ماما، سارہ کہاں ہے؟“ وہ سلام کرنا بھول گیا۔

”سارہ کو تم نے جس کام سے لگایا ہے وہ اسی میں مصروف ہے۔“ ماما کے جواب سے زیادہ ان کے

چہرے، سپاٹ نیچے سے الجھ کر وہ بابا کو دیکھنے لگا تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے پوچھنے لگے۔

”کس کا بچہ ایڈاپٹ کر رہے ہو؟“

”جی.....!“ وہ اس اچانک سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔

ہے۔ میں کیسے! کیا کروں گا۔“ ذہنی انتشار کے باعث وہ اپنا مفہوم واضح نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن سونیا پھر بھی تھی۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تجھی۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔“

”ک..... کیا سوچا ہے آپ نے۔“ وہ لرٹ ہوا تھا۔

”یہ میں ابھی بتاؤں گی۔ بس تم اطمینان رکھو۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔ اور ہاں کنب کی ڈیٹ ہے ڈاکٹر نے؟“ سونیا نے اپنی طرف سے اسے اطمینان دلا کر پوچھا تو وہ گہری سانس کے ساتھ بولا تھا۔

”جانتی نہیں..... میرا مطلب ہے ابھی ڈیٹ نہیں دی۔“

”ٹھیک ہے۔ جب بھی ڈاکٹر ڈیٹ دے مجھے پہلے سے بتا دینا۔“

”اچھی بات ہے۔“ وہ فون رکھ کر سوچنے لگا کہ جانے سونیا نے کیا پلان کیا ہے۔

☆☆☆

شہرینہ کو آج اپنے گھر جانا تھا۔ اس نے خزیںہ سے کہا تھا کہ وہ پہلے عالیہ خالہ کے گھر جائیں گے اور وہاں سے ای کو ساتھ لیں گے۔ خزیںہ اس سے متفق ہو گئی تھی۔ لیکن جب نکلنے سے پہلے شہرینہ نے حمیدہ بیگم کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر آ چکی ہیں۔ یوں عالیہ خالہ کے ہاں جانا ملتی کر خزیںہ پہلے اسے شاپنگ مال لے گئی جہاں اس نے خاص طور سے شہرینہ کے لیے شاپنگ کی۔ کیونکہ تیور غزنی نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بہن چوکی باران کے ہاں رکی ہے تو وہ اسے یوں خالی نہ جانے دے۔ کوئی تھکے ضرور دے اور اس نے اپنی طرف سے بھی تھکے دینے کو کہا تھا۔ اس لیے جب شہرینہ نے رخ کیا تو وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

”یہ میں نہیں غزنی دے رہے ہیں۔ اگر تم نہیں لوگی تو وہ ناراض ہوں گے۔“

”لیکن خزی، یہ سب بہت زیادہ ہے۔“

”کوئی زیادہ نہیں اور اب بتاؤ کہاں چلتا ہے؟“ خزیںہ نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ سبھی نہیں۔

”کہاں چلتا ہے مطلب.....؟“

”مطلب گھر تو جانا ہی ہے اور کہیں گھومنا چاہو تو.....؟“

”تو سمندر کا نظارہ کراؤ۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”کیوں بکلی حزرہ تمہیں ادھر نہیں لے گیا؟“

”نہیں سارا شہر گھمایا لیکن ادھر نہیں لے گیا۔ سچ بہت دن ہو گئے سمندر دیکھے ہوئے آخری بار یاد ہے تمہاری شادی سے پہلے ہم دونوں حزرہ کے ساتھ ہی گئی تھیں۔“

”ہاں اور میں نے کہا تھا تم شادی کے بعد روز آیا کرنا۔ لگتا ہے حزرہ نے وہی بات پکڑ لی ہے۔“ خزیںہ نے کرتے ہوئے محظوظ ہوئی تھی۔

”اگر ایسا ہے پھر تو میں واقعی روز جاؤں گی۔“ شہرینہ بے ساختہ بولی تھی۔

”لیکن اب تو سی دیو کا حال برا ہے۔ اتنا گندمچا دیا ہے۔ میرا بالکل دل نہیں چاہتا وہاں جانے کو۔ خیر تم فکر مت کرو تمہیں میں سمندر کا نظارہ کرا دیتی ہوں لیکن مجھے پانی میں جانے کو مت کہنا۔“ خزیںہ نے پہلے ہی سے بار کرا دیا تھا اس لیے شہرینہ نے اسے اصرار نہیں کیا لیکن خود کو نہیں روک سکی۔ دوسرے لہروں کا مچلنا دیکھتے ہی اس کا دل بھی چل گیا۔

”بس خزی پانچ دس منٹ۔“ اس نے چلیں گاڑی ہی میں اتار دیں اور ننگے پاؤں تیز قدموں سے چلتی

کئی ریت پر آتے ہی رک گئی۔

وہ ہمیشہ اس منظر میں کھو جاتی تھی۔ دور سمندر یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے گھل رہا ہو۔ وہ بہت شوق سے اپنے موبائل سے مودی بنانے لگی کہ اچانک موبائل اسکرین پر حزرہ کا چہرہ دکھ کر وہ خوش گوار حیرت میں گھر گئی اور فوراً کیمرو نیچ کر کے اسے پکارنا چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک پری دس کو دیکھ کر اس کی آواز حلق ہی میں اٹک گئی۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر اس نے کیمرا آن کر کے ان دونوں کو فوکس کیا اور کلک کا مٹن دبا کر پھر انہیں دیکھنا چاہا لیکن اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

”کل وہ اس کے ساتھ تھا اور آج..... وہ جو کوئی بھی تھی اسے حزرہ کا اس کے اڑتے بالوں سے اٹھیلیاں کرنا لگا گیا تھا۔ پلٹ کر بھاگتے ہوئے وہ آ کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔

”ارے اتنی جلدی آ کیوں۔“ خزیںہ نے تعجب کا اظہار کیا پھر اس کا چہرہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ ”تم روری ہو؟“

”نہیں دو پانی۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ ورنہ تو یہ تھا کہ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو شو لے لو۔“ خزیںہ نے نوک کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

پھر دو تھکے دو تھکے سے خزیںہ ہی کوئی بات کر لیتی لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔ حلق میں انکا گولا اسے ہوں ہاں بھی نہیں کرنے دے رہا تھا۔ ایک دو بار خزیںہ نے کسی بات پر جواب طلب نظروں سے اسے دیکھا بھی لیکن وہ یوں بن گئی جیسے سن ہی نہیں رہی۔ اور گھر آتے ہی وہ سیدھی دایں روم بھاگ گئی اور ابھی صرف منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر نکل آئی۔ کیونکہ جانتی تھی خزیںہ زیادہ دیر نہیں رکے گی اور واقعی خزیںہ کھڑے کھڑے ہی حمیدہ بیگم سے بات کر رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔ ورنہ تو یہ تھا کہ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

”لڑکی دیکھنے میں اچھی ہے اور گھر انہ بھی اچھا لگ رہا تھا۔ اب اللہ کرے بات بن جائے۔“

”بن جائے گی ان شاء اللہ پھر عالیہ خالہ سے کہیے گا شادی میں دیر نہ کریں۔ آج حالات ایسے ہیں ممکنیاں ہوتی ہیں ٹوٹ جاتی ہیں پتا بھی نہیں چلتا۔“ خزیںہ نے کہا تو وہ جو اندر کھلونے لیے کھڑی تھی بول پڑی۔

”پاں تو ایسے ہی تو نہیں متنگیاں نوٹیں کوئی بات ہوتی ہے جب ہی ٹوٹی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو اور میں بھی یہی کہنا چاہ رہی ہوں کہ ایسی باتوں کی نوبت ہی نہیں آنے دینا چاہیے۔ چٹ متگی اور پٹ بیاہ۔“ خزیںہ نے اس کی تائید کی پھر حمیدہ بیگم سے کہنے لگی۔

”اور ای آپ بھی اب دیر نہ کریں۔ میری ڈیلیوری کے بعد اس کی شادی طے کر دیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ یکدم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ”خبردار جو تم نے میری شادی کا نام لیا تو۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں مجھے نہیں کرنی شادی۔ سنا آپ نے امی۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

”ارے تو اس میں اتنا۔“ خزیںہ نے کہا تو وہ ہونٹوں ہی میں رہ گئی۔ کیونکہ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ دل جو بوجھل ہو رہا تھا اور رونے کو بہانہ چاہیے تھا۔

حمیدہ بیگم حیران پھر پریشان ہو گئیں اور پریشان تو خزیںہ بھی ہوئی لیکن ٹھٹھک بھی گئی تھی۔ البتہ ٹوکے سے باز رہی اور بڑی مشکل سے اسے چپ کرنا پھر بہلا کر گئی تھی۔

☆☆☆

کبھی کبھی رات اپنے اندر بڑے اسرار لیے آتی ہے۔ ایسی ہی رات تھی۔ خاموشیوں میں لیٹی ہوئی نہ خواب ناک، نہ خوف ناک۔ دل کے کھلیانوں سے سرسراہٹ ہوئی گز رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ کون نیند

”میری بات سنو شہرینہ.....!“ اس کے بعد وہ انتظار ہی کرتا رہا جواب تو کیا آتا شہرینہ نے اس کا نمبر ہی ہلاک کر دیا تھا۔ جس سے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی اس کا دل جا ہار بیکار ہو کر بے بس کر دیتی تھی۔ حقیقتاً اس کے اندر ایسا ہی اہل اٹھ رہا تھا کہ ادھی نائٹ کی ٹنگ ٹنگ کرتی رہا اس کے سامنے آن لپٹی۔ غالباً اسے جیت لینے کے احساس میں سرشار تھی۔ میز پر دونوں بازو بٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کل شام کے رنگین لمحات کو دہرائے گی۔ پھر مایوس ہو کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ کیا کسی کا خون کر کے آئے ہو؟“

”ہاں۔“ بنا حرکت کیے حمزہ نے جواب دیا تھا۔  
”میں کا؟“ وہ اچھل پڑی۔ ”بناؤ ناں حمزہ..... کیا سچ سچ تم نے..... مجھے تمہاری آنکھوں.....“  
”ہاں میری آنکھوں میں خون اترتا ہے۔“ وہ ایک دم میز پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔ ”اور میں سچ سچ خون کر دوں گا، اپنا یا تمہارا۔“

”مائی گاڈ! تم یقیناً پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ تھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن پھر بیٹھ گئی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں رہ رہ کر یہ دورے کیوں پڑتے ہیں۔ نہیں بلکہ تم ایکٹنگ کرتے ہو۔ بہت شوق ہے تمہیں ایکٹر بننے کا تو چلو میں تمہیں.....“

”شٹ اپ..... وہ وائٹ جیس کر بولا۔ تم جاؤ اپنے روم میں۔“  
”نہیں جاؤں گی۔ کیا کر لو گے۔“ اس کی ضد اور ہٹ دھرمی دیکھ کر حمزہ کا دماغ گھوم گیا۔ خود پر ضبط کرنا محال تھا، اس لیے وہ خود ہی اٹھ کر نہ صرف روم بلکہ آفس سے ہی نکل آیا اور ترقی کینے میں بیٹھ کر چائے آرڈر کر کے سگریٹ سناگلی۔ ذہن اس بری طرح تھج رہا تھا کہ سمجھ ہی نہیں پار رہا تھا اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ چائے پھر چائے اس کے بعد کتنی بھی دیر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ جب ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تب جیب سے سیل فون نکال کر اس نے حسان صاحب کو کال ملائی اور رپو ہوئے تک وہ الرٹ ہو چکا تھا۔

”سر! حمزہ بات کر رہا ہوں۔“ ان کی ہیلو کے جواب میں وہ فوراً بولا تھا۔  
”ہاں کیا بات ہے۔ آج آفس نہیں آئے؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ بغیر تہدید کے کہنے لگا۔  
”سر! ایم سو ری! میں مزید آپ کی جاب جاری نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ مس ربیکا کی وجہ سے میری پرسنل لائف بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے۔“ وہ رکا کہ شاید حسان صاحب کچھ کہیں گے لیکن ادھر خاموشی تھی تب اس نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے لائن کاٹ دی۔ لیکن ممکن نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ جو یہ چاہ رہا تھا کہ آج یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے تو اسے لگا دو جملوں میں تو بات بھی پوری نہیں ہوئی، باب کیسے بند ہو سکتا ہے۔

کتنی دیر وہ خود پر جھنجھلا تا رہا کہ اسے احسان صاحب کے بولنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا اور ان ہی سے کہلوانا چاہیے تھا کہ ربیکا اب اس کے راستے میں نہیں آئے گی۔ جب تک وہ اسٹینڈ نہیں کریں گے وہ کبھی نہیں کر سکتا۔ بہر حال اب دوبارہ انہیں کال کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے اگلے وقت پر ٹالی کر وہ شہرینہ سے بات کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ کیونکہ اس کا نمبر تو وہ ہلاک کر چکی تھی۔ جس پر اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ دل ہی دل میں اسے سخت ست کہتے ہوئے اس نے ٹائم دیکھا پھر ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد مقررہ وقت پر اس کے کالنگ جا بھیا۔

اس کا خیال تھا ہمیشہ کی طرح دھوکا جما کر اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دے گا۔ پھر کہیں بیٹھ کر اسے ساری رام کہانی سن کر اپنی طرف سے اس کا دل صاف کر دے گا۔ اسے یقین تھا وہ دوبارہ ویرانہ نہیں رہے گی۔ پھر واپسی کا سفر دونوں ہی خوشی طے کریں گے۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ کالنگ گیت پر نظر کریں جمائے کھڑا تھا جہاں سے لڑکیاں ٹولیوں کی صورت نکل رہی تھیں۔ پھر اسے وہ دشمن جاں نظر آ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ ہلاتا شہرینہ

میں مدھوش ہے اور کسی کی آنکھوں سے نیند روٹھ گئی ہے۔ اگر ایک پل ٹھہر کر دیکھتی تو اسے اس لالہ بانی سی لڑکی ترس ضرور آتا جس کے گرد کل تک سنہرے خوابوں کے جگنو جگمگاتے تھے اور آج وہی خواب اسے رلا رہے تھے۔ ”حمزہ..... حمزہ۔“ وہ نیکیے میں منہ چھپائی یا ہونٹوں پر تھمتی سے ہاتھ جماتی سسکی کی صورت۔ یہی نام ابھر رہا تھا۔ اگر کوئی اور اسے بتاتا کہ اس نے حمزہ کو ایک انتہائی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ساحل کی کھنڈی ہوا۔ آنکھیلیاں کرتے دیکھا ہے تو وہ مر کر بھی یقین نہ کرتی۔ اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھا جھٹلا نہیں پار ہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا جب وہ حمیدہ بیگم کے ساتھ حمزہ کے گھر کی تھی۔ تو وہاں حمزہ نے بظاہر اسے چھینٹنے کی غرض سے کہا تھا کہ ایک پری اس پر عاشق ہو گئی ہے اور اسے اپنے ساتھ پرستان لے جانا چاہتی ہے۔ ”تو یہ وہ وہ پری.....!“ اس نے سر ہانے رکھا اپنا موبائل اٹھالیا اور آن کر کے حمزہ اور اس لڑکی کی تصویر دیکھنے لگی۔ بار بار اس کی آنکھیں وہندلاتیں اور وہ..... سی سے رگڑ کر پھر نظریں تصویر پر جمادیتی۔ جبکہ اس کے اندر تنفر بڑھتا جا رہا تھا۔

”جھوٹے مکار..... میں اب تم سے کبھی بات نہیں کر دوں گی۔ میری طرف سے اس کے ساتھ پرستان جاؤ یا بھاؤ، میں، میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ وائٹ پیٹتے ہوئے دل ہی دل میں حمزہ سے مخاطب تھی پھر اچانک کچھ سوچ کر اس نے وہ تصویر حمزہ کے وائٹ اپ پر سینٹر کر دی اور ساتھ ہی تہہ کر لیا کہ وہ اس کی جھوٹی داستانیں ہرگز نہیں سنے گی۔

☆☆☆

حسب معمول آفس جانے سے پہلے موبائل چیک کرتے ہوئے حمزہ کو بڑی زور کا جھٹکا لگا تھا۔ اس کی اور ربیکا کی تصویر وہ بھی شہرینہ نے سینڈ کی تھی۔

”یا اللہ اس نے تمہیں کہاں دیکھ لیا۔“ اس کی پریشانی فطری تھی۔ اور پھر شہرینہ کا سوچ کر کہ جانے وہ کیا سمجھ رہی ہوگی اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کر پار رہا تھا۔ نہ روزانہ کی طرح پیلا کے ساتھ چھینٹ چھاڑ بھی اور یہ کہاں ممکن تھا کہ اس کی غیر معمولی خاموشی محسوس نہ کی جاتی۔ فاخرہ بار بار اسے دیکھ رہی تھیں اور گوکہ وہ صبح کے وقت ٹوکنے سے گریز کرتی تھیں لیکن اس وقت رہا نہیں گیا۔ پوچھ لیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے بیٹا۔“

”جی اماں۔“ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

”میں تمہاری طبیعت کا پوچھ رہی ہوں۔ پریشان لگ رہے ہو۔“ فاخرہ نے تشویش ظاہر کی تو وہ سر جھٹک کر بولا۔

”کوئی پریشانی نہیں اماں میں ٹھیک ہوں۔“

”لگ تو نہیں رہے۔“ بیلا بول پڑی۔ ”پریشان آ دھا بھی نہیں کھایا اور چائے بھی۔“

”ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا اماں چلتا ہوں۔“

”رکیں بھائی مجھے بھی کالنگ چھوڑ دیتے جیے گا۔ آج میری دین نہیں آئے گی۔“ بیلا فوراً چائے کا آخری گھونٹ لے کر اپنا بیگ اٹھائے اندر بھاگے گی تھی کہ اس نے روک دیا۔

”دین نہیں آئے گی تو چھٹی کر لو۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔“

”بھائی میں تیار ہوں۔“

”تو یہیں بیٹھ کر پڑھ لو۔ اچھا اماں۔“ وہ غلٹ میں ہاتھ ہلاتا باہر نکل آیا تھا۔

اور پھر آفس پہنچتے ہی اس نے شہرینہ کو کال ملائی تو دوسری طرف تیل جاتے ہی لائن کاٹ دی گئی جس سے شہرینہ کی ناراضی کا اندازہ کر کے اس نے دو تین بار پھر اس کا نمبر پیش کیا اور ہر بار نتیجہ وہی رہا تب مایوس ہو کر ٹیکسٹ لکھ کر سینڈ کیا۔

نے اسے دیکھ لیا اور فوراً پلٹ کر گیٹ کے اندر غائب ہو گئی۔ تو فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔  
 ”ماکل لڑکی۔“ وہ تقریباً ایک گھنٹہ وہیں کھڑا دانت پیتا رہا۔ کالج خالی ہو گیا پھر گیٹ بند ہونے پر اسے یہ خیال آیا کہ وہ پچھلے گیٹ سے چلی گئی ہوگی، وہاں اچانک کڑی دھوپ کا احساس ہوا تھا۔

☆☆☆

حزہ اور شہرینہ لڑتے تھے تو پھر جلدی مان بھی جاتے تھے۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ منہ موڑ کر چلی جس سے حمزہ کی جان بریں آئی تھی۔ گھر آ کر بھی اسے چین نہیں تھا۔ اپنے کمرے میں وہ مسلسل ہلکا رہا۔ اس کے پاس جانے کو چل رہا تھا لیکن یہ ڈر کہ کہیں وہ اسے حمیدہ بیگم کے سامنے رسوا نہ کر دے، وہ ہمت نہیں رہا تھا۔ لیکن شام تک وہ بے بس ہو گیا۔ دل سے مجبور ہو کر اس کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ گیٹ شہرینہ ہی کھولتی اس نے سوچا اسے وہیں روک کر بات کرے گا لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی جب گیٹ کھلنے کے ساتھ سامنے بیگم نظر آئیں۔ بمشکل سلام کر سکا۔

”خوش رہو۔ ابھی میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔“ حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ ان کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگا۔  
 ”سب ٹھیک تو ہے ناں تانی جان۔“  
 ”ہاں اللہ کا شکر ہے بس وہ شہرینہ۔“

”کیا ہوا شہرینہ کو؟“ وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گیا۔  
 ”چنانچہ کس بات کا قصہ ہے۔ سب بغیر ناشتائے کالج چلی گئی آ کر بھی کچھ نہیں کھایا۔ دو دن خزینہ کے گھر کا رہ کر آئی مزاج ہی نہیں مل رہا۔“ حمیدہ بیگم بولتے ہوئے لاؤنچ میں بیٹھ گئیں مجبوراً اسے بھی بیٹھنا پڑا۔  
 ”موسم کا اثر ہو گا تانی جان!“ وہ یہی کہہ سکا۔

”موسم کوئی نیا تو نہیں بدل رہا یہاں تو ہر دوسرے دن موسم بدلتا ہے۔ مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔“  
 حمیدہ بیگم کی آخری بات پر وہ پریشان ہو گیا۔  
 ”کیسا چکر.....؟“

”جنات دنات کا۔ دیکھتے نہیں ٹی وی پر کیسے لڑکیوں پر اثر ہوتا ہے اچھی بھلی لڑکیاں چیخنے چلانے لگتی ہیں۔ یہ بھی ضرور کسی گندی جگہ سے پھلا گئی ہے جو اس پر.....“ حمیدہ بیگم تشویش سے بولے جا رہی تھیں۔  
 ”اوہ.....“ وہ سینے میں رکی سانس بحال کر کے گویا ہوا تھا۔ ”ارے نہیں تانی جان ایسا کچھ نہیں ہے۔ اور جوئی وی پر دکھایا جاتا ہے اس پر تو آپ یقین ہی نہ کیا کریں۔ سب ڈراما ہوتا ہے۔“

”ٹی وی میں ڈراما ہوتا ہو گا اور جو میں حقیقت میں دیکھتی ہوں۔ پچھلی گلی میں مظہر صاحب کی بیٹی اچھی بھلی تھی۔ ادھر کچھ عرصے سے بیٹھے بیٹھے چیخنے چلانے لگتی ہے۔“  
 ”اف تانی جان! بس کریں۔ ہو گا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ۔ آپ شہرینہ کے لیے ایسا مت سوچیں۔“

گھبرا کر بولا تھا۔ پھر خود پر قابو پا کر کہنے لگا۔  
 ”اصل میں تانی جان خزینہ کی شادی کے بعد سے وہ خود کو ایلا محسوس کرنے لگی ہے۔ جب کوئی بات کر لے والا نہیں ملتا تو موڈ آف کر لیتی ہے۔ آپ اسے کسی نہ کسی کام سے لگائے رکھا کریں۔“  
 ”میں کیا لگائے رکھوں خود ہی کرتی ہے۔ مجھے تو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی۔“

”اچھی بات ہے۔ ابھی کیا کر رہی ہے؟“ وہ خود کو روکتے روکتے بھی اس کے بارے میں پوچھ گیا۔  
 ”سورہی ہے کب سے اٹھا رہی ہوں اس سے مس نہیں ہو رہی۔“ حمیدہ بیگم شہرینہ سے نالاں نظر آنے لگیں۔  
 ”چلیں میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔“ وہ کہنے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ حمیدہ بیگم روکنا چاہتی تھیں لیکن

نے تیزی دکھائی فوراً بچن میں آ گیا۔ اور گو کہ صرف چائے بنانی تھی لیکن وہ جان بوجھ کر بتوں کو اٹھا بیچ کر تار ہا۔ شاید آواز سن کر شہرینہ اٹھ کر آ جائے۔ لیکن اسے غائب اس کے آنے کا یقین تھا جب ہی کمرے سے نہیں نکلی۔  
 حمیدہ بیگم کے ساتھ چائے پینے کے بعد بھی وہ تکیہ دیر بیٹھ رہا۔ نظریں بار بار اس کے کمرے کی طرف اٹھتی رہیں لیکن اس نے جھلک تک نہیں دکھائی۔ آخر وہ مایوس لوٹا تھا۔ اور اب غصہ کم پریشانی زیادہ تھی۔ کیونکہ اتنی بیدگی سے تو وہ کبھی ناراض نہیں ہوتی تھی۔ اور حق بجانب بھی تھی۔ کاش وہ پہلے سے اسے ربکا کے بارے میں بتا دیتا۔ اب پتا نہیں وہ اس کا یقین کرے گی یا نہیں۔ اس رات وہ یہی سب سوچتا رہا تھا اور اگلے دن آفس پہنچنے لے بعد یاد آیا کہ اس نے کل حسان صاحب کو فون کر کے جاب جاری رکھنے سے معذرت کی تھی۔  
 ”شٹ.....“ وہ پہلے خود پر جھنجھکیا پھر سوچا اسے حسان صاحب سے براہ راست بات کر لینی چاہیے۔ اس کے مددہ جاب جاری رکھنے یا چھوڑ دینے کا سوچے گا۔ پھر وہ خود کو حسان صاحب سے بات کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ لیکن کال بلاوا آ گیا۔ یہ بھی اچھا ہوا اسے خود سے نہیں جانا پڑا۔ خود کو پرسکون کر کے وہ ان کے روم میں داخل ہوا تھا۔  
 ”بیٹھو حمزہ۔“ اس کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دے کر انہوں نے اسے بیٹھنے کا کہا تو وہ بھی آرام لے بیٹھ گیا۔

”ہاں، کیا کہہ رہے تھے کل تم.....“ قدرے رک کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔  
 ”نہ، میں مس ریکا کو نہیں سمجھا سکتا۔ وہ بہت ضدی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو ہی اسٹینڈ لینا پڑے گا۔“ وہ بہت سنجیدہ کر بولا تھا۔

”ہوں..... حسان صاحب کی نظریں یوں جھنجکیں کر اسے ان پر ترس آنے لگا۔ ایک باپ بیٹی کے سامنے اس قدر بے بس تھا۔ شاید اسی لیے لوگ بیٹی کی آرزو نہیں کرتے۔ اس کا دل چاہا خاموشی سے اٹھ کر چلا جائے۔  
 اقریب تھا کہ وہ اٹھ جاتا حسان صاحب نے خود ہی اسے جانے کا کہہ دیا۔  
 ”اسے اٹھنے کے لیے چیئر کے بازوؤں پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے پڑے تھے پھر وہ دروازے کے قریب

ماکر حسان صاحب نے پکار لیا۔  
 ”سنو..... وہ پلٹ کر رک گیا تو حسان صاحب نے میز کی دراز سے اپنا کارڈ نکالا اور اس کی بیک پر کچھ لکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔  
 ”رائل ٹیکسٹائل میں ریمیز صاحب کو یہ کارڈ دے دینا۔ وہاں تمہاری جاب ہو جائے گی۔“  
 ”تھینک یوسر.....“ اس نے بڑھ کر کارڈ لیا پھر ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا تو اسے لگا جیسے وہ آزاد ہو گیا ہو۔

☆☆☆

ہمیشہ کی طرح اس نے رات کا کھانا برائے نام ہی کھایا تھا پھر اٹھنے لگی تھی کہ حسان صاحب پکار کر بولے تھے۔  
 ”رابی! ابھی تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“  
 ”جی ڈیڈی.....“ ربکا نے ٹیبل پر دونوں بازو رکھ کر گویا اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔  
 ”شیر دانی صاحب نے تمہارے لیے حسن شیر دانی کا پروزل دیا ہے۔“ حسان صاحب سوپ پیتے ہوئے

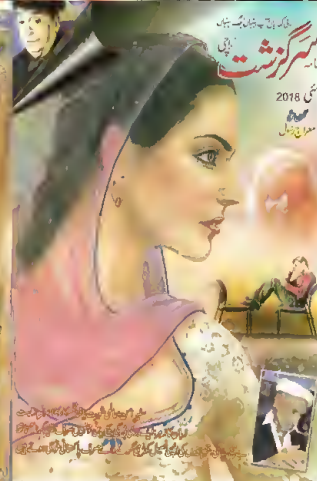
انتہی شرم سے بولے تھے۔  
 ”مجھے اور تمہاری ماما کو بھی یہ پروزل ٹھیک لگ رہا ہے۔ پھر تم نے بھی حسن شیر دانی کو دیکھا اور تمہارے لگتا ہے تمہاری اس کے ساتھ اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم سنجیدگی سے اس شے پر غور کرو تا کہ میں شیر دانی صاحب کو جواب دے سکوں۔“  
 بات کے اختتام پر انہوں نے ربکا کو دیکھا جو بڑے سکون سے ان کی بات سن رہی تھی۔ ان کے دیکھنے پر





# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA



ذرا سے کندھے اچکائے پھر اسی سکون سے بولی تھی۔

”سوری ڈیڈی آپ شہروانی صاحب کو انتظار میں نہ رکھیں۔ ابھی جواب دے دیں انہیں۔ میں بیٹے میں انٹر سٹڈنٹس ہوں۔ آئی ایم سوری۔“

”زیکا.....“ شمرہ نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”مما! میں آپ کو شمرہ کے بارے میں بتا چکی ہوں۔ کیا آپ نے ڈیڈی کو نہیں بتایا۔“

”بتایا ہے۔ تمہاری ممانے مجھے سب بتایا ہے۔“ حسان صاحب ضبط کی انتہاؤں پر تھے۔ جبکہ زیکا ضبط کھور ہی

”پھر آپ اس سے ہٹ کر کیوں بات کرتے ہیں۔“

”اس لیے کہ شمرہ کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس کے ماں باپ بہن بھائی کوئی آیا ہے

رشتہ لے کر؟“ انہوں نے شمرہ کو دیکھا تو وہ فوراً بولیں۔

”کوئی نہیں۔“

”پھر بیٹا! جب کوئی آیا ہی نہیں تو میں کیسے اس کے بارے میں سوچ لوں۔ میں تو اسی کی بات کروں

ایک بار نہیں گئی بار اچکا ہے اور ہمارے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔“

حسان صاحب نے اپنے تئیں اسے لا جواب کیا تھا۔ لیکن وہ تو جیسے اسی انتظار میں تھی۔

”شمرہ کو میں نے روک رکھا ہے ڈیڈی اب آپ کہتے ہیں تو وہ اپنے گھر والوں کو لے آئے گا اور انہیں آپ

انتظار مت کروائیے گا۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو شمرہ پریشان ہو کر حسان صاحب کو دیکھنے لگیں۔ جن کا

بالکل ساٹ تھا۔ انہوں نے شمرہ کا دیکھنا اور ان کی پریشانی مخصوص ضرورت کی لیکن ان کی طرف متوجہ نہیں ہوئے

”ایک منٹ بیٹا۔ کیا تم نے شمرہ کے بارے میں اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ آئی مین وہ جس کلاس سے

رکھتا ہے وہاں تم کیسے ایڈجسٹ کر سکو گی۔“ خان صاحب کا انداز ہنوز دوستانہ تھا۔

”یہ میرا مسئلہ ہے ڈیڈی..... آپ اس میں نہ الجھیں۔“

”لیکن بیٹا تمہیں اگر کوئی تکلیف ہوگی.....“

”مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ وہ فوراً بولی تھی اور شمرہ اب چپ نہیں رہ سکیں بلکہ چیخ پڑیں۔

”یہ کیا بکواس ہے حسان۔ یہ تو بالکل ہے آپ تو ہوش سے کام لیں۔ کیوں اسے اتنی دھچک دے رہے ہیں۔“

”زیکا! شمرہ اور ربیکا تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ تمہاری ماما کو میں سمجھا لوں گا۔“ حسان صاحب نے شمرہ

ٹوک کر کہا تو ربیکا جاتے جاتے رک کر بولی تھی۔

”اور ممما کو یہ بھی سمجھا دیجیے گا ڈیڈی کہ شمرہ اور اس کے گھر والوں کو کوئی عزت ملنی چاہیے جیسے آپ

مہمانوں کو دیتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رک نہیں فوراً پلٹ کر تیز قدموں سے

کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

”ہرگز نہیں..... ہرگز نہیں۔“ شمرہ دانت پیس رہی تھیں۔ فرحان صاحب پر ہنسنے لگیں۔

”اور آپ..... آپ نے حسان کیسے اس دو ٹکے کے لڑکے پر بھروسہ کر لیا کہ وہ ربیکا کو سمجھالے گا۔ دیکھ لیا کیا

ہے اس نے کہ وہ اس سے ہٹ کر کچھ سوچنا ہی نہیں جانتی اور آپ مزید اسے شہ دے رہے ہیں۔ آخر کیا سوچ کر؟“

”یہ سوچ کر کہ وہ اپنی مرضی سے ٹھوکر کھانا جانتی ہے تو کھانے دو۔“ جان صاحب جلد دل سے بولے تھے

”نہیں، نہیں میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔“ شمرہ کا پارہ مسلسل بڑھتا جا رہا تھا۔

”فارگا ڈیک شمرہ! تم مجھے مزید پریشان مت کرو۔“ حسان صاحب اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن شمرہ وہ

تکلاتی رہی تھیں۔“

☆☆☆

شمرہ نے حسان صاحب سے کارڈ لے تو لیا تھا لیکن اب شش و پنج میں تھا کہ اسے حسان صاحب کے ریفرنس سے

نام باپ کے لیے جانا چاہیے یا نہیں۔ اس وقت وہ سوئے لیٹا تھا پھر کچھ خیال آیا تو کارڈ نکال کر دیکھنے لگا۔ عجیب

نام تھی۔ کان کی سوچ بھار کے بعد آخراں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ جب آسانی سے نہیں ملتی تھی۔

احسان صاحب کو شاید اس پر رحم آ گیا تھا۔ کچھ بھی تھا اسے بھی بہر حال حسان صاحب سے کوئی شکایت

نہیں تھی۔ وہ تو خود بے جا رہی بیٹی کی ضد سے تنگ تھے۔

”وہ لڑکی یقیناً سائیگی ہے۔ حسان صاحب کو اسے کسی سائیکالوجسٹ کو دکھانا چاہیے۔ خیر مجھے کیا جان

اڑتی میری اس سے۔“ اس نے سر جھٹک کر انگڑائی لی پھر لائٹ آف کر کے لیٹا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔

”اس وقت کون ہے۔“ اس نے سر ہانے کے قریب رکھا موبائل اٹھا کر دیکھا اسکرین پر ربیکا کا نام جگمگا رہا تھا۔

”بچی شیطان ہے۔“ اس نے موبائل آف نہیں کیا یونہی بیٹا ہوا اور اس رکھ دیا اور آٹھنیں بند کر لیں۔ موبائل

ف ہوا پھر اس کے لمحے دوبارہ بجنے لگا۔ یعنی جب تک وہ کال ریسیو نہیں کرے گا اور وہ بڑائی کرتی رہے گی۔

”کرتی رہے۔“ خاموشی میں موبائل کی سریلی ٹون جیسے لوری کا کام دے رہی تھی۔ وہ محفوظ ہوتا داتی سو گیا تھا۔

صبح وہ فاخرہ اور بیلا کے اٹھانے پر نہیں اٹھا بلکہ اپنی مرضی سے اٹھا تھا۔ پھر فریش ہو کر کمرے سے نکلا تو فاخرہ

نے ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر ڈالے۔

”کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے۔ اتنی دیر تک سوئے۔ آفس نہیں جانا کیا؟“

”جاؤں گا۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر تخت پر بیٹھ گیا۔

”ناشٹالوں؟“

”جی..... بیلا کا لچ چلی گئی کیا؟“ اس نے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ دیر ہو گئی اسے گلے ہوئے۔ فاخرہ کہتے ہوئے پچن کی طرف بڑھ گئیں تو متوجہ سا ہو کر اس نے

دیکھنے کے لیے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا۔ دس بج رہے تھے اور کیونکہ اسے جلدی نہیں تھی اس لیے

بیٹان سے تھا۔ جب ہی کالز چپک کرنے لگا۔ کیونکہ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ موبائل کی ٹون سنتے سنتے سویا تھا۔

یہاں کی پانچ کالز کے ساتھ خزینہ کی کال دیکھ کر وہ چونکا تھا۔

خزینہ کال کر رہی تھی۔ اس نے سوچتے ہوئے فوراً خزینہ کا نمبر ملا دیا۔ تو دوسری بتل کے ساتھ ہی اس کی

ازدستانی دی۔

”ہیلو.....“

”ہاں خزینہ رات تم کال کر رہی تھیں۔ سوری! میں جلدی سو گیا تھا۔ سب ٹھیک تو ہے ناں.....!“ اس نے

اتو جہر پیش کر کے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ تم سناؤ۔“ خزینہ نے کہا تو وہ بلا ارادہ بولا تھا۔

”کیا سناؤں.....؟“

”شہریتہ سے تمہاری لڑائی وڑائی ہوئی ہے کیا؟“ خزینہ نے پوچھا تو وہ قدرے شہتا گیا۔

”نہیں تو..... کیا کہہ رہی ہے شہریتہ؟“

”کچھ نہیں میرا مطلب ہے میں نے اس سے بھی پوچھا ہے اور وہ کہہ رہی ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر شمرہ

ایوں لگ رہا ہے جیسے تم دونوں کے درمیان کوئی بات ہوئی ہے۔“ خزینہ ہمیشہ کی طرح فرنگی بات کر رہی تھی۔

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟“ اس نے اچانک کسی خیال کے تحت



پوچھا تھا۔

”بتاؤں گی۔ ابھی تم کہاں ہو؟“

”گھر پر ہوں۔ بس آفس کے لیے نکلنے والا ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے، پھر فرصت سے بات کر س گے۔ چچی جان کو سلام کہو۔“

”اللہ حافظ.....“ وہ فون رکھ کر سوچنے لگا۔ یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ شہرینہ نے ربیکا کے بارے میں نہیں بتایا۔ لیکن ایسا کیا ہوا ہے جو شہرینہ کو ان کے بچ لڑائی مانا راضی کا شک ہو رہا ہے اور اس نے شہرینہ سے بھی باز پرس کی ہے۔

”کس کا فون تھا؟“ فاخرہ اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”شہرینہ کا.....“ وہ چونک کر بولا تھا۔

”اچھا ایسی ہے میری بیٹی۔ کیا کہہ رہی تھی۔“ فاخرہ شہرینہ کا سن کر خوش ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے۔ سلام کہہ رہی تھی آپ کو۔“

”علیکم اسلام..... میری بات کرادیے۔“ فاخرہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ فون کر لیا کریں اسے اور کتنے دن ہو گئے آپ تائی جان کے پاس بھی نہیں گئیں۔ جانا چاہیے آپ کو۔“

شہرینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ناشتے میں مصروف ہو کر بول رہا تھا۔

”ہائیں۔ شہرینہ کو کیا ہوا ہے؟“ فاخرہ پریشان ہو گئیں۔

”چائیں برسوں میں گیا تھا۔ شہرینہ کو تو نہیں دیکھا۔ سوری تھی۔ تائی جان نے بتایا اس کی طبیعت کا اور وہم بھی کر رہی تھیں۔ کہ کوئی سایہ دایہ ہو گیا ہے اس پر۔“

”اللہ نہ کرے۔“ فاخرہ مزید دہل گئیں۔

”آپ آج چلی جائیے گا بیلا کے ساتھ۔“

”ضرور جاؤں گی اور تم برسوں کی بات آج بتا رہے ہو۔ اسی وقت بتاتے ہیں اسی وقت جاتی۔ ہائے میری معصوم بچی۔ اللہ اپنی امان میں رکھے۔“

فاخرہ کا بس نہیں چل رہا تھا اسی وقت چل پڑیں۔ لیکن مجبوری تھی۔ بیلا کالج سے آتی تو گھر پر تالا دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔

”اچھا اماں..... وہ درمال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا..... آج میں بنی جگہ جا رہا ہوں دعا کیجیے گا۔“

”نئی جگہ مطلب.....؟“ فاخرہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

”نئی جاب کے لیے۔ پرانی ختم ہو گئی۔“

”کیوں پرانی کیوں.....“

”بس بتایا تھا ناں وہاں مسئلے بہت تھے۔ دعا کیجیے گا یہاں اللہ بہتر کرے۔ اور ان شاء اللہ بہتری ہی ہو گی۔“ ٹھیک ہے چلتا ہوں۔

وہ فاخرہ کے مزید سوالوں سے بچنے کی خاطر قصدِ اُجالت دکھاتا ہوا نکلا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



”وہ جا رہا ہے عمارت..... اسے روک لو.....“ ماریہ کے لہجے میں انجانگی۔

”کیوں روک لوں آخر کیا تعلق ہے میرا اس سے.....“ میں غصے سے بولی۔

”وہ محبت کرتا ہے تم سے..... اتنی محبت کون کرے گا تم سے!“

ماریہ مجھے قائل کرنے پر بضد تھی اس کی ہر بات میں دلائل چھپے تھے۔ میری ساری توجہ کیمسٹری کے نوٹس پر تھی۔ مجھے ماریہ کی باتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اب تو میں تنگ آچکی تھی ان باتوں سے۔ تب میں نے غصے سے نوٹس بند کیے اور تیز نظروں سے ماریہ کو دیکھا۔

”اور میں لعنت بھیجتی ہوں اس کی محبت پر.....“ میرے لیے وہ ہی محبت کافی ہے جو میرا باپ مجھ سے کرتا ہے۔ کسی دوسری محبت کی ناہی مجھے ضرورت ہے اور نا ہی پردا۔“ مجھے محبت سے ہی انکار تھا۔

بیک کندھے پر لٹکائے کتابیں سینے سے لگائے میں جا رہی تھی، جب ماریہ کی غصے سے بھری آواز نے میرا تاقب کیا۔

”تم جھوٹی ہو عمارت!“

میں سر جھٹکتی لاہوری سے باہر نکل آئی فضول کی بحث میں اچھے کامیرا کوئی موڈ نہیں تھا۔

☆☆☆

میری واپسی تک بابا بھی گھر پہنچ چکے ہوتے تھے..... اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ جلدی آجاتے تو کھانا بھی خود بنا لیتے، ورنہ میں اور بابا مل کر کھانا بناتے تھے۔

آج بابا اور میں آگے پیچھے ہی گھر پہنچے تھے۔ اس لیے فریش ہونے کے بعد میں نے جلدی جلدی زدولی بنائی، اور ساتھ ہی رات کا بیچا سالن گرم کیا، تب تک بابا سلاہ بنا چکے تھے۔ کھانا تیار تھا۔ کھانے کے بعد میں اور بابا اپنے اپنے کمرہ میں آرام کی غرض سے چلے آئے تھے۔ روزانہ جب بھی میں یونیورسٹی سے آکر بستر پر لیٹی تو لمحوں میں نیند کی وادوں کی سیر کرنے لگتی تھی، مگر آج دل بے چین تھا اور دماغ ماریہ کی باتوں میں الجھا

ہوا تھا۔ میں ناچاچے ہوئے بھی ان سوچوں کا سفر کرنے لگی جن پر چلنے سے بھی ڈرتی تھی۔

میں پانچ سال کی تھی جب امی اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں اور ان کے بعد بابا نے ہی ہر رشتے کی کمی پوری کی تھی وہ باپ ہونے کے ساتھ ساتھ میری باں بھی بنے تھے۔ انہوں نے میرے لیے کون سی قربانی تھی جو نہیں دی تھی۔ اپنا آرام بھلا کر میری پرورش کی۔

پورے خاندان کی مخالفت لے کر مجھے پڑھایا ورنہ ہمارے خاندان کی لڑکیوں نے تو اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا نا اپنی عزت کی حفاظت کرنے کے لیے لے لے چوڑے درس دیے تھے اور نا ہی دیگر جذباتی مکالمے بولے تھے۔ انہیں جو سیکھ دینی تھی وہ میری پرورش کے دوران بابا پہلے ہی دے چکے تھے۔ سبق پڑھانے انہوں نے مجھے امتحان گاہ میں چھوڑا تھا۔ انہیں دنیا سے بڑھ کر مجھ پر مان تھا۔ وہ جانتے تھے پوری دنیا اپنا زور لگا دیتی لیکن ان کی بیٹی ان کا مان کبھی ٹوٹنے نہیں دے گی۔

اور اب اس مان کو توڑنے ولید سجان کی محبت آگئی تھی یہ محبت اپنا پورا زور لگا رہی تھی اور میرا دل کا پتہ لگا تھا۔

☆☆☆

وہ یونیورسٹی کی چوتھی منزل پر کھڑا تھا سارے اسٹوڈنٹس گراؤنڈ میں جمع تھے..... ہر طرف شور تھا..... لیکن مجھے وہ شور نہیں سیانی دے رہا تھا مجھے تو بس ماریہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”عمارت اسے روک لو..... ورنہ وہ مر جائے گا تم جانتی ہو وہ کتنا ضدی ہے۔“ ماریہ اتنی بے چین اس لیے بھی تھی کہ وہ اس کا گہرا دوست تھا۔ بچپن کا دوست۔ مجھ سے دوستی بھی تو اس نے ولید سجان کے لیے ہی کی تھی۔ ”یار چھوڑ دو اپنی ضد..... زبان سے نہیں تو، آنکھوں سے ہی اقرار کرو۔“

”یہ ضد نہیں ہے یہ میرے باپ کا مان ہے۔ ان کے پڑھانے اسباق ہیں۔ تم مجھے اس کام کے لیے مجھ پر مت گرد، جس کے لیے میرا دل راضی نہیں۔“ میں نے قطعیت سے جواب دیا لیکن ولید سجان کی نظروں کی

تپش میرے برف دل کو پگھلائے گی۔

”تمہارے بابا کا مان کسی کی زندگی سے زیادہ اہم ہے عمارت!“ ماریہ نے تاسف سے ہنسنے دیکھا۔

”ہاں ہے۔ لیکن تم یہ بات بھی نہیں سمجھ سکو گی وجہ ہماری کلاس کا ڈیفینس ہے۔“

میں نے پہلی بار نظر اٹھا کر ولید سجان کو دیکھا۔ اس کی نظریں مجھ سے کہہ رہی تھیں ”تم جھوٹی ہو عمارت“ اور میری نظریں بنا کوئی پیام دیے جھک گئیں۔ میں نے واپسی کے سفر کے ابھی محض تین قدم اٹھائے تھے اور تب ہی سارا گراؤنڈ چیخوں کے شور سے گونج اٹھا تھا۔ ولید سجان نے اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے چوتھی منزل سے چھلانگ لگا دی تھی۔

☆☆☆

اور چوتھی منزل سے چھلانگ لگانے کے باوجود بھی وہ بچ گیا تھا۔ زیادہ کچھ نہیں بدلا بس یہ ہوا کہ اسے یونیورسٹی سے فارغ کر دیا گیا اور ساتھ ہی بھی ہوا کہ اس کی کمر کے تین مہرے زخمی ہو گئے۔ بائیں ہاتھ اور ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے فرچر ہو گئی اور سر پر شدید چوٹیں آئیں۔

ساری کلاس اس کی عیادت کے لیے گئی۔ وہ تین ماہ ہسپتالز رہا اور تین ماہ میں ہر روز ماریہ مجھ سے اس کی عیادت کو جانے پر اصرار کرتی رہی۔

”دیکھو افرار کرنے سے انکل کا مان ٹوٹے گا“ عیادت کرنے سے تو نہیں۔ ہمارے نبی تو کون کی بھی عیادت کرتے تھے، وہ تو پھر تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔“

میں اس کے دلائل کبھی سنجیدگی سے سنی کبھی نہیں دیتی لیکن میرے فیصلے کمزور نہیں پڑے۔ دل پر لگا کراڑ گئے۔ لاسٹ سمسٹر کا لاسٹ سپر تھا جب ماریہ نے مجھے اس کا نمبر دیتے آخری انتخاب کی۔

”وہ جا رہا ہے یہ ملک چھوڑ کر اسے صرف تم روک سکتی ہو..... پلیز روک لو!“ اور اس بار میں اس کی بات سن کر کم گم ہو گئی تھی۔ آج رات میرے چاچو کی سیلی آ رہی تھی میرے رشتے کے سلسلے میں..... بابا بہت خوش تھے اور

ساتھ ہی سارا خاندان بھی خوش تھا کہ میں نے بنا کوئی چاند چڑھائے کیمسٹری میں ماسٹر کر لیا ہے۔

میں نے ولید سجان کو فون کرنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ میرا رشتہ چچا زاد خادہ سے طے ہو گیا تھا۔ بابا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ بھی تو ایک اعزاز ہوتا ہے کہ ماں باپ اولاد کی شادی اپنی پسند سے کریں اور بابا کی اتنی قربانیوں کے بعد اگر میں نے یہ اعزاز انہیں دیا تھا تو اس میں کوئی بڑی بات نہیں تھی ہر اچھی بیٹی اپنے باپ کو یہ اعزاز ضرور دیتی ہے۔

☆☆☆

میرے کمرے میں اس وقت ماریہ اور میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ بڑی مہارت سے میرے چہرے پر میک اپ کر رہی تھی۔ کل رات مہندی کی رسم سے پہلے میرا خیال دے نکاح ہو گیا تھا۔ اور آج اس کے سنگ میری رخصتی تھی میری اکلوتی سہیلی مجھے خادہ کی دلہن بنا رہی تھی۔ اس دن کے بعد اس نے مجھ سے ولید سجان کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی اور نا ہی میں نے خود کوئی سوال کیا تھا۔

”جانتی ہو عمارت! سجان نے جاتے ہوئے مجھ سے کیا کہا تھا۔“ ماریہ میرا پٹائیٹ کر رہی تھی جب سنجیدگی سے بولی۔

میرا دل دھڑک کر رہ گیا، میں پوچھ بھی ناسکی کہ ماریہ آج کے دن تم اس کا ذکر کیوں کر رہی ہو۔

”اس نے مجھ سے کہا تھا۔ میں جانتی ہوں یہاں سے ماریہ اگر عمارت کو اپنے دل سے مر کر بھی نہیں نکال سکوں گا۔ عمارت جیسی لڑکیاں ہوتی ہی محبت کے قابل ہیں۔ ماں باپ کا مان اور عزت رکھنے والی لڑکیوں سے کوئی ایک بار محبت کرے تو تا عمر اس کی محبت میں جلتا رہتا ہے۔“

ماریہ بولتے ہوئے اس کے دوپٹے میں پن لگا رہی تھی۔ اس کی ساری توجہ دوپٹے کی طرف تھی اور یہ مقام شکر تھا۔

عمارت کی آنکھوں میں چمکتے موتی صرف آئینے نے دیکھے تھے اور وہ چیخ چیخ کر عمارت سے کہہ رہا تھا۔

”تم جھوٹی ہو عمارت..... جھوٹی۔“

☆☆



# لڑکھائو عسکر

تیسری قسط



”سجیکٹ بھی نہیں تو.....“ دل آویز کچھ شرارت بھری مسکراہٹ کو چہرے پر سجا کر بولی۔  
 ”فیورٹ سجیکٹ.....؟“ مانی جبران ہوا تھا۔  
 ”محبت.....“ وہ ہلکھلائی تو مانی نے یکدم لب بھینچ لیے۔  
 ”تو محبت تمہارے لیے ایک سجیکٹ ہے۔“  
 مانی نے سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”صرف سجیکٹ نہیں..... میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔“ وہ ایک بار پھر گہری بات کر رہی تھی۔  
 ”اور سچائی ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔“ مانی جواب نہایت برکتہ تھا۔  
 ”اللہ نہ کرے۔“ وہ زیر لب بولی۔

”بہر حال آج کالینس بہت اچھا ہے۔ تم ایسا کروٹ میٹ بک کروادو۔ جب تک میٹ کی ڈیٹ نزدیک آتی ہے مزید پریکٹس بھی ہوگی تو جو تھوڑی بہت غلطیاں ہو رہی ہیں وہ بھی درست ہو جائیں گی.....“ مانی نے یک لخت ہی موضوع بدل دیا۔  
 ”اوکے، ٹھیک ہے۔“ دل آویز نے گاڑی اس واپسی کی راہ پر موڑ دی تھی۔ کیونکہ اب اس کے لپینس کا وقت ختم ہو رہا تھا۔

☆☆☆

”ممی کیا ہوا ہے؟“ عدی یک لخت سنبھلا تھا۔

”کیوں نہیں کر دانا چاہتی تھی.....“ دل آویز نظریں روڈ پر چبائے سبک رفتاری سے گاڑی کو آگے بڑھائے جا رہی تھی کہ مانی نے سوال کیا۔  
 ”میں جلدی سے ڈرائیونگ پاس کر لینا چاہتی ہوں اب۔“ وہ ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھ کر بولی۔  
 ”میرے اب تک کے کیریئر میں تم سب سے زیادہ انوکھی اسٹوڈنٹ ہو۔“ مانی نے ہر بار کی طرح ایک بار پھر کہا۔ ”تمہیں ڈرائیونگ سکھانے کے لیے مجھے سارے حربے آزمانے پڑے ہیں۔“ مانی نے اب دل آویز کو مکمل اعتماد سے ڈرائیونگ کرتے دیکھا تو مسکراتے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”ایسے ہی ڈرائیونگ کرو گی تو بہت جلد میٹ دینے کے قابل ہو جاؤ گی۔“

”محبت ہم قدم ہو تو ساری مشکلیں آسان ہونے لگتی ہیں۔“ دل آویز مدھم مسکراہٹ کے ساتھ گلیپر لہجے میں بولی اور خاموش ہو گئی۔  
 ”دیے آج تم خلاف معمول کچھ خاموش ہو۔“ مانی کو لہجہ بھر میں اس کی خاموشی بکھنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ خاموش نہیں تھی۔ حالانکہ اس کی ہر اک جنبش چلا کر اقرار محبت کر رہی تھی۔ لیکن مانی..... ایک بار پھر اس کی محبت سے اجتناب برت رہا تھا۔

”نہیں میں خاموش نہیں ہوں۔ بس آج تھوڑی سی تھکی ہوئی ہوں اور پھر زیر بحث میرا فیورٹ

”بیٹا دیکھ کر ڈرائیو کروناں۔“ ثمن نے آگے رکی ٹریفک کو دیکھا تھا۔ اگر وہ زور سے نہ چلاتیں تو عدی نے آگے والی گاڑی کو ٹکرا مار دی ہوتی۔ کیونکہ آگے والی گاڑی کی بریک لائٹس آن تھیں جبکہ عدی گاڑی آگے بڑھائے ہی چلا جا رہا تھا۔

”اف می آپ کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا بھی بہت مشکل ٹاسک میں سے ایک ہے۔“ عروش کی موجودگی میں ثمن کا عدی کو سرزنش کرنے پر وہ جل سا ہو کر رہ گیا۔

”بیٹا پرانی امانت ساتھ ہے تو ذرا احتیاط برتنی چاہیے ناں۔“ ثمن نے کہا۔

”کوئی بات نہیں آئی۔“ عروش پیچھے بٹھنے کے باوجود عدی کے چہرے پر چھائی خجالت بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے مسکرا کر کہا۔

”کوئی بات کہیں نہیں۔ ان کو تو بس بہانے چاہیے ہوتے ہیں مجھے سست اور ٹکا ثابت کرنے کے۔“ عدی نے نزدیکی نظروں سے ثمن کو دیکھ کر منہ بسور کر کہا۔ تو عروش مسکرانے لگی۔ ثمن نے بھی مسکرا کر عدی کے نزدیک انداز کو دیکھا تھا۔

”تم سناؤ بیٹا پاکستان میں سب خیریت ہے ناں؟ تمہارے گھر میں؟ میری عفاف کیسی ہے؟“ ثمن نے عروش سے پوچھا۔

”الحمد للہ آئی سب خیریت ہے۔ عفاف بھی ٹھیک ہے۔ آپ سب کو بہت یاد بھی کرتی ہے۔“ عروش نے ان کو آگاہ کیا۔

”جھوٹ۔۔۔“ عدی نے تیزی سے کہا تو عروش نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے تو نہیں یاد کرتی۔۔۔۔۔ آئی ایم شیور! آپ نے کبھی میرا نام بھی نہ لیا ہوگا۔“ عدی ابھی تک منہ بسور کر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

”ہاں دیسے یہ سچ کہا۔ مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ عفاف کا کوئی بھائی بھی ہے۔“ عروش مسکراہٹ دبا کر بولی۔

”دیکھا دیکھا می۔ مجھے پتا تھا۔۔۔۔۔ ایک میں ہی

تو ہوں فالٹو جس کا کبھی کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔۔۔۔۔“ عدی نے اچھٹی نظروں سے عروش کو دیکھا تھا۔

”بیٹا وہ مذاق کر رہی ہے۔“ ثمن نے عدی کے مجڑے تیوروں کو دیکھ کر کہا۔

”دیسے یہ سچ نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں مذاق کر رہی ہوں۔“ عروش کو عدی کے تاثرات لطف دے رہے تھے۔ پھر بھی سچ کو مذاق بنا دیا۔

”عدی بھائی میں واقعی مذاق کر رہی ہوں۔ عفاف سب کو بہت یاد کرتی ہے۔“ عدی کچھ نہ بولا تو عروش نے نرم لہجے میں کہا۔

”بھائی۔۔۔۔۔“ عدی نے چیخ کر کہا۔ ثمن نے اسے دیکھا۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔“ عروش نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”میں صرف عدی ہوں۔ عدی بھائی نہیں۔۔۔۔۔“ عدی نے ٹیکسی نظروں سے بیک دیوڑھے سے اسے گھورا تھا۔

”سواری میں کبھی عمر میں آپ مجھ سے بڑے ہوں گے تو۔۔۔۔۔“

”بات عمر کی نہیں رستے کی ہوتی ہے تم مجھے ان، ان، یہ، وہ، جو مرضی ہے کہو لیکن بھائی فطرتی نہیں۔۔۔۔۔“ عدی نے اچھے خاصے تے لہجے میں اسے ٹوکا تھا۔

”گلتا یہ بھی وہی شقوق ہے جن کو عزت راس نہیں آتی۔“ عروش دل برداری میں بڑبڑائی اور شیشا کر ثمن کو دیکھا۔ جو انتہائی ٹیکسی نظروں سے عدی کو گھور رہی تھیں۔

”غذی یہ کیا تمیزی ہے۔“ ثمن نے اسے سرزنش کیا۔

”محمی۔۔۔۔۔ یہ بدتمیزی نہیں، سیفٹی ہے۔“ عدی نے شریر انداز سے ثمن کو دیکھا تھا۔ انہوں نے سر پھینک لیا۔

”یہ نہیں سدھرنے والا۔۔۔۔۔ عروش بیٹا تم اس کی باتوں کا برا نہیں منانا یہ ایسے ہی فضول ہانکنا رہا ہے۔“ ثمن نے عروش کو دیکھ کر کہا۔

”کوئی بات نہیں آئی میں مائنڈ نہیں کرتی۔“ عروش مروت نبھانے میں ماہر تھی۔

”ہائے دادے“ صرف عدی“ کیا میں آپ کا فون یوز کر سکتی ہوں؟ اپنی خیریت کی اطلاع دینی ہے۔“ عروش کی مسکراہٹ میں شرارت کا عنصر عدی کو چونکا گیا۔

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔“ ثمن نے ہنس کر عدی کو چڑایا تھا اور عروش کو داد دی تھی۔

”جی ہاں کر سکتی ہیں۔۔۔۔۔“ عدی نے ڈرائیونگ کرتے کرتے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”جی السلام علیکم لالہ! عروش بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے کال ریسپونڈ کی گئی تو عروش نے کہا۔

”ہاں لالہ میں خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کوئی مشکل نہیں ہوئی، فلائٹ ٹائم پر تھی۔“

”آئی اور عدی آئے ہیں۔“ عروش دھیمی آواز میں مبین کو بتا رہی تھی۔ ایک طرف گفتگو واضح کر رہی تھی کے دوسری جانب سے کیا پوچھا جا رہا تھا۔

”وہ ڈرائیو کر رہے ہیں۔ آپ آئی سے بات کر لیں۔“ عروش نے نظریں اٹھائی تو عدی کی آنکھیں اسنے آپ پر مرکوز پائیں۔ دوسرے پل اس نے موبائل ثمن کی طرف بڑھا دیا جبکہ عدی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اب خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

”نہیں بیٹا بالکل فکر نہ کرو۔ میری اپنی بیٹی ہے۔“

”ماشاء اللہ اتنی پیاری بیٹی سے اگر کوئی غلطی ہو بھی جائے تو درگزر ہو جاتی ہے۔“ اپنی تعریف پر عروش بیک دم نزوٹس ہونے لگی۔

”جلدی ہم گھر پہنچ جائیں گے پھر عروش کا نمبر بھی ایکٹو ہو جائے گا تو پھر خوب باتیں کر لیتا۔“ ثمن نے مسکراتے ہوئے مبین کو بتایا۔

”ہاں ان شاء اللہ بیٹا بہت خیال رکھیں گے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھلا۔۔۔۔۔“ ثمن نے پھر تسلی

دی اور پھر چند سی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

تقریباً پچاس منٹس کی ڈرائیو کے بعد وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ جہاں احسن ندیم نے بھی عروش کا نہایت فراخ دل سے استقبال کیا۔

”بہت شکریہ۔ انکل آپ سے مل کر بہت اچھا لگا، مجھے بالکل ایسے لگا جیسے میرے پاپا ہیں آپ!“ عروش گلوگیر لہجے میں اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ احسن ندیم نے بھی اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

”گلتا ہے کسی ڈرامے کی شوٹنگ چل رہی ہے۔“ عدی اس کا سامان لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ ان کی اس تکلف و مروت بھری گفتگو سے زچ ہوتا ہوا بولا۔

”عدی۔۔۔۔۔ بری بات بیٹا!“ ثمن نے اسے گھر کا۔

”ممی پلیز اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ کم از کم ایک لڑکی کے سامنے تو نہ ڈانٹیں۔“ عدی ایک بار پھر چڑ کر بولا۔ تو عروش ہنسنے لگی۔

”کوئی بات نہیں صرف عدی ایسے تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“ عروش شریر لہجے میں بولی تو عدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن۔۔۔۔۔ زبان پرتالے لگے تھے۔ تو فقط اسے گھور کر رہ گیا۔

عروش کو بات بات پر منہ بسور کر شکایت کرنے



والا عدی اچھا لگا تھا۔ اب تک کے سفر میں وہ اتنا تو سمجھ چکی تھی کہ عفاف کی پہلی اچھی اور سچی ہوئی ہے۔ آپس میں دوستی بھی ہے، بے تکلفی بھی اور ایک دوسرے کے لیے احترام بھی۔ ”چلو یہ ٹیشن تو دور ہوئی۔ اب وقت اچھا گزر جائے گا اور جو میں سوچ کر یہاں آئی ہوں وہ بھی آسان ہو جائے گا۔“

”آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔ فریش ہو جاؤ تو پھر کھانا کھانا ہے۔ تمہیں ریست بھی کرنا ہوگا۔“ وہ انہی خیالوں میں تھی کہ ٹمن کی آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی کہ واقعی اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ اگلے لمحے وہ ٹمن کے ہمراہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جبکہ عدی کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☆☆☆

”آئی آپ کو مدد چاہیے کیا؟“ ٹمن صبح سے کچن میں مصروف تھیں کہ عروش اپنے ساری پیپرز اپنے کمرے میں رکھ کر ان کے پاس آ گئی۔

”ارے نہیں بیٹا تم کیا مدد کرو گی آج تمہارے انکل کی پسند کی چیزیں بنانے لگی ہوں۔ جب سے آف ہے ناں ان کا تو آج ذرا ارادہ ہے۔“ عروش کی بات پر ٹمن نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”واہ..... ہمارے گھر میں بھی پاپا کی پسند کی ڈشز بنا کرتی تھیں۔ اب لالہ کی پسند کی بھی بنتی ہیں۔ میری کوکنگ بھی اچھی ہے دادو نے سب سکھایا ہے مجھے، میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔“ عروش کو گھر کا ماحول میسر آتا نظر آ رہا تھا۔ تو خوش دلی سے ٹمن کو مدد کی آفر بھی کی۔

”ٹھیک ہے پھر تم بھی کچھ بنا لو۔ اپنی کوئی پسند کی ڈش۔“ ٹمن بچانے کی اسوج کر کہنے لگیں۔

”ٹھیک ہے میں بناتی ہوں۔“ ٹمن نے کہا۔

”میں اپنی ایک سٹیکل ریسی بناتی ہوں۔“ عروش نے ٹمن سے پوچھا تو انہوں نے اگلے لمحے فریزر سے فش نکال کر اس کو دے دی۔

”ٹھیک یو آئی.....“ عروش فش کا پکٹ پکڑ کر

مسکرا کر بولی۔

”یہ ریسی میری اپنی ہے۔ دادو کے ساتھ مل کر بنائی تھی تو لالہ کو بہت پسند آئی تھی۔“ عروش ٹمن کو بتانے لگی۔

”دادو نے بتائی تو پھر اپنی ریسی تو نہ ہوئی ناں.....“ اس سے پہلے کہ ٹمن کچھ کہتی عدی کی کچن میں آمد ہوئی اور وہ اپنے مخصوص سچے انداز میں کہنے لگا۔

”بیٹا اس نے کیا ہے کہ دادو کے ساتھ مل کر بنائی تھی.....“ ٹمن نے سچ کی وہ مزید برہم ہوا۔

”آپ کبھی میری سائڈ نہ لیتا۔“ وہ میز پر رکھی فروٹ باسکٹ سے کیلا اٹھا کر کھانے لگا اور منہ بند کر بولا تو عروش بے ساختہ ہنس پڑی۔ عدی نے ناراض نظروں سے اس کی ہنسی کو دیکھا۔

”کوئی سوتیلوں کے ساتھ بھی ایسا رویہ نہیں رکھتا جیسا مجھ اکلوتے کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔“ عدی نے ایک بار پھر اپنی ناقدری کا رونا، رونا شروع کیا تھا۔

”تمہیں ایسا تو نہیں کے آپ سوتیلے ہی ہیں؟“ عروش نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا تو عدی نے یک دم اسے دیکھا۔

”کیا مطلب.....؟“ عدی نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ ایک ہفتہ ہو گیا مجھے آئے ہوئے لیکن انکل آئی کا آپ کے ساتھ رویہ اکلوتے بننے والا تو بالکل بھی نہیں، ہاں سوتیلے والے پریر سرج ہو سکتی ہے۔“ عروش اب اس کو حقیقی معنوں میں زچ کرنے کی ٹھان چکی تھی۔ ٹمن نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے آنکھ دبا کر انہیں خاموش رہنے کا کہا اور عدی کے تاثرات سے لطف لیتے لگی۔

”او میڈم! تم یہاں پڑھائی کرنے آئی ہو کہ بچا پے کٹنی کا رول ادا کرنے.....“ عدی نے ٹمن کی نظروں سے اسے دیکھا۔

”مہی..... بتائیں اس کو کہ میں سوتیلیا نہیں ہوں بس ایسے ہی ناقدری کی موت مارا جا رہا ہوں۔“ عدی

ایک بار پھر منہ بنا چکا تھا۔

”ارے نہیں بیٹا۔ تم تو ہمارا سہارا ہو۔ ہماری جان ہو.....“ ٹمن نے محبت پاش نظروں سے عدی کو دیکھا تھا۔

”تم کیوں ہنس رہی ہو.....؟“ ٹمن کی بات پر عدی اتر آیا تھا، جبکہ عروش لب بھینچے اپنی مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ عدی اس کی معنی خیز مسکراہٹ کو دیکھ کر اکڑے انداز میں پوچھنے لگا۔

”نہیں، کچھ خاص نہیں.....“ وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”بتاؤ.....“ عدی نے جارحانہ انداز میں اس سے دریافت کیا۔

”وہ انچھیلی آئی نے مجھے آنکھ ماری ناں۔“ اس لیے ہنسی آ گئی.....“ عروش، عدی کو چھیڑنے لگی تھی۔

”عروش.....“

”مہی.....“ عدی اور ٹمن ایک ساتھ چلائے تھے۔ جبکہ عروش اب کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اب ٹمن بھی ہنس رہی تھیں جبکہ عدی کھلکھلائی عروش کو دیکھ کر ایک پل میں کہتے میں آ گیا تھا۔ دل میں ایک بار پھر وہی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں جو نون پر ایئر بیس سے ابھرتی اس کی آواز سن کر بجتی تھیں۔

”مہی ذرا دھیان رکھنا۔ یہ آگ لگانے آئی ہے۔“ عدی نے گہری نظروں سے عروش کو دیکھ کر ٹمن کو کہا تھا۔ اس کے الفاظ اور تھے لیکن مطلب اور تھا عروش نے شپٹا کر دیکھا۔

”جی نہیں..... میں مذاق کر رہی تھی۔“ عروش اب عدی سے مخاطب تھی۔

”ہاں بیٹا عروش ایسی نہیں ہے۔“ ٹمن نے عروش کی طرف داری کی۔

”ہاں ہاں ایک میں ہی تو ہوں ایسا..... باقی تو کوئی ایسا نہیں ہے۔“ عدی کا بات بات پر روٹھ جانا عروش کو حیرت سے دوچار کرتا تھا۔

”ویسے ایک بات کافی عجیب لگی مجھے.....“

عروش۔ عدی سے کہنے لگی تو اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”فاریور کائیڈ انفارمیشن..... میں جلیس نہیں ہوتا.....“ اس سے پہلے کہ عروش کچھ کہتی عدی نے کہہ کر اسے حیران کر دیا۔ اور وہ سوچ کر رہ گئی کہ عدی کو کیسے پتا چلا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔

”انداز تو جلیسی والے ہی ہیں۔“ ٹمن اب واپس کام کرنے کے لیے رخ موڑے کھڑی تھیں۔ عروش نے اپنی حیرانی کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کہا۔

”تو تم میرے انداز نوٹ کر رہی ہو.....“ عدی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”نہیں..... لیکن جب کوئی چیز نظروں کے بالکل سامنے ہو تو نظر انداز بھی نہیں ہوتی۔“ عروش نے کہا اور رخ موڑ کر چھٹی کی طرف متوجہ ہو گئی..... جبکہ عدی خود بھی اپنے انداز پر حیران ہوا جا رہا تھا۔

”مہی میرے لیے کیا بنا رہی ہیں؟“ عدی نے ٹمن سے پوچھا۔

”فٹس.....“ ٹمن نے ذرا کی ذرا عدی کی طرف دیکھا اور شر پر مسکان کے ساتھ کہا۔

”ٹھیک یو مہی.....“ عدی ان کی معنی خیز مسکراہٹ سے محفوظ ہوتا ہوا بولا۔ عروش نے پلٹ کر دیکھا اور ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ عدی کو فٹس پسند ہے..... دوسرے پل وہ اپنی ساری توجہ اپنی اسپنشل ڈش کی طرف مرکوز کر چکی تھی۔

”کاش لالہ اور دادو بھی ہوتے یہاں۔ دودن سے بات بھی نہیں ہوتی۔“ وہ ایک دم بڑبڑاتی تھی۔

”تم اتنی بے دفا ہو سکتی ہو میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔“

”لیکن تم اتنی ہی بے دفا ہو گئی میں نے بھی سوچا تھا۔“ اب عروش اپنی ڈش کو لاسٹ چمچ دے رہی تھی کہ عفاف کا منیج اس کو ایک دم بہت زیادہ خوشی سے دوچار کر گیا..... ٹمن اپنی ڈش پر تقریباً تیار کر چکی تھیں اور اب عروش کچن میں آئی تھی اس لیے اس کا منیج آتے ہی اس نے کال ملائی۔

”میں نے کب بے وفائی کی؟ تم ہی ہو جو وہاں جا کر سب بھول بھال گئی ہو۔“ عفاف نے قدرے جڑے تیوروں سے کہا۔

”میں آج کو تنگ کر رہی ہوں۔“ عروش نے ادون کا گیس نارک سیٹ کر کے فٹس ٹرے اس میں رکھتے ہوئے عفاف کو بتایا۔

”کیا۔“ عفاف کو گویا کرٹ لگا۔  
”تم کیوں کر رہی ہو.....؟“ عفاف نے پوچھا۔

”تو یہ تم تو ایسے اچھلی ہو جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔“ عروش نے ناراضی کا اظہار کیا۔  
”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے اس لیے حیرت ہوئی کہ می عمو! خود ہی ساری کو تنگ کرتی ہیں ناں۔ ہائے واوے کیا پکار رہی ہو۔“ عفاف نے اس کو بتایا اور پھر پوچھا۔

”آئی نے ہی ساری ڈشز بنائی ہیں۔ میں تو صرف فٹس فرائیڈ بنا رہی ہوں۔“ عروش ادون کی گلاس ڈور سے فٹس ٹرے کو دیکھ کر اسے بتایا۔  
”ادو اچھا مطلب عدی کی فیورٹ ڈش بنائی جا رہی ہے۔“ عفاف نے شری لکھے میں کہا۔  
”یہ اس تک چڑھے عدی کی فیورٹ ہے؟ پہلے پتا ہوتا تو کبھی نہ بنائی۔“ عروش ناگواری سے گویا ہوئی۔

”ہیں؟ وہ کیوں بھلا؟ لڑائی ہو گئی ہے کیا؟“ عروش کا لہجہ عفاف کو چونکا گیا تھا۔

”یار تمہارا بھائی بات بات پر منہ پور لیتا ہے۔ اور میں کیوں اس کے حکم مانوں؟“ عروش کا انداز شکایتانہ تھا۔ عفاف دل کھول کر مسکرائی۔  
”کون سا حکم.....؟“ حکم کی بات پر عفاف ہنسی نکلتی۔

”یہی کے جہاں جاؤ مجھے بتانا، مدد کروں گا..... یہ، وہ ایسے ہی فضول میں۔“ عروش نے

شکایت تو شروع کی لیکن اب بات بنانا مشکل ہو رہی تھی۔

”ارے..... یہ اس کے حکم نہیں ہیں۔ میں نے ہی کیا تھا اسے کہ تمہیں سپورٹ کی ضرورت ہوگی تو مدد کرے۔“ عفاف نے اسے حقیقت بتائی۔

”ہاں اس نے یہی کہا تھا۔ لیکن.....“  
”تم نے یقین نہیں کیا۔“ عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”ہاں ناں تو اور کیا..... اس نے حکم دیا تو.....“  
اب کے عروش بھی منہ بسورے ہوئے لگی تھی۔  
”اور لاڈلا ہے ناں، تو یوں ہی منہ بسور کر اپنے لاڈ اٹھواتا ہے۔ تمہارے سامنے بھی اس لیے ہمہ وقت منہ بسورے رکھتا ہوگا.....“ عفاف اسے عدی کے بارے میں بتانے لگی۔

”اب میں تو اس کے لاڈ اٹھانے سے رہی.....“ عروش تیزی سے بنا دھیان دیے بولی تھی۔  
”کیوں؟ کیا میں اتنا برا ہوں؟“ اس سے پہلے کے عفاف کی آواز اس کے کان میں پڑی..... ایک مروانہ آواز نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ عروش نے پلٹ کر دیکھا تو بچن میں عدی کھڑا تھا۔ دونوں ہاتھ باندھے نظریں اس پر جمائے نجانے کب سے کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اتنی بخوشی کہ پتائی نہ چلا.....

”عدی آیا ہے وہاں؟“ اس سے پہلے کے عروش کسی قسم کا رد عمل ظاہر کرتی عفاف نے اس سے پوچھا۔

”ہاں.....“ عروش مدھم آواز میں بولی۔  
”اچھا میری بات کر دو اس سے.....“ عفاف نے کہا تو اس نے عروش سے خاموشی سے موبائل کچھ فالسے پر کھڑے عدی کی جانب بڑھا دیا۔

اس پر نظریں چماتے عدی نے فون پکڑا..... تو عروش ہاتھ مردوٹی دیں کھڑی رہ گئی۔

کچھ سفر اکیلے کرنے پڑتے ہیں۔ بنا کسی سہارے، بنا کسی گائیڈ لائن کے۔ بنا کسی سے مشورہ کیے۔ بین نیازی بھی ایک ایسے ہی سفر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا جہاں اس کو کسی کا ایک لمحے کا سہارا بھی میسر نہ تھا۔ کوئی اس کو حوصلہ دینے والا نہ تھا۔

”بین نیازی عذبتوں کے سفر اتنے آسان نہیں ہوا کرتے اور پھر ایک طرف عذبت..... تل تل مارتی ہے، لمحہ لمحہ سلگاتی ہے۔ سفر اتنا طویل نہیں ہے، پٹ جاؤ۔ محبت پل صراط سے کم نہیں ہوتی، بہت احتیاط، بہت ٹیک ٹیک اور صاف من سے نہ سنبھالی جائے تو تار سائی کی دھکتی آگ میں جھونکنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی۔“

سفر طویل نہیں ہے لیکن اب واپسی ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کیسی محبت ہے۔ اس کے انکار، بار بار انکار نے اس محبت کی شدت میں اضافہ کیا ہے۔ ایسے کیوں ہو رہا ہے میں نہیں جانتا۔ دل اس کی جانب اس قدر کیوں کھینچا چلا جا رہا ہے میں نہیں جانتا۔ چند محلوں نے مجھے بین نیازی کو اتنے بے بس کیوں کر دیا۔ میری اپنی بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔

جب دوا سے کچھ حاصل نہ ہو تو دعا کر لینی چاہیے۔ ہم قبولیت کی گھڑی سے بے خبر ہیں۔ کون سا لمحہ ہماری فریاد کو عرش پر پہنچا کر قبولیت کا شرف بخش دے ہم نہیں جانتے۔ مجھے اب قبولیت کے اس بل کے اس پل کو کھوکھو جتنا ہے، انتظار کرنا ہے۔ محبت کا انتظار، اسی جذبے، اسی جنون سے۔“

دعائے اپنا کام نہ کیا تو..... دوسرا آپشن موجود تو ہے ہی، بین نیازی ایک بار پھر شش در شش میں جھلا اٹھا رہا تھا۔ اس سے وہ لحاظ فراموش کرنا کسی طور بھی ممکن نہ ہو رہا تھا۔ بارش میں بھیگی دل آویز نے ایسا کوئی ظلم چھوٹا تھا۔ بین نیازی بے بسی کی آخری حدوں سے جاگرا اور اب اس کا لاسٹ سمسز شروع ہو چکا تھا۔ پھر یہاں قیام کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا تھا، اس کو پاکستان واپس جانا تھا اور دل آویز اس سے اتنی دور بھی کہ ایک ہی شہر، ایک ہی جگہ رہنے کے باوجود وہ اس کی پرچھائی

بھی نہ پاس کا تھا۔

وہ سمجھ نہ کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ ایسا کیا کرنا چاہیے کہ دل آویز کو اس سے محبت ہو جائے۔ محبت نہ ہی تھی لیکن ایک انسیت تو ہو جائے۔ ایک ایسا تعلق تو بن جائے کہ وہ اس کی بات سن لے، بنا کسی ناگواری کے، بنا کسی جھنجھلاہٹ کے۔ لیکن دل آویز تو ان کی طرف دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔

”بین نیازی، اب ایک ہی راستہ بچا ہے، خاموشی سے دعا کا۔ ابھی تمہاری محبت کو تمہاری قسمت بننے کا وقت نہیں آیا ہے۔ اور تم..... بین نیازی ابھی محبت کے حصول کو بھول کر باقی معاملات پر توجہ دو۔“  
”بین بیٹا! سو رہے ہو کیا؟“ ابھی نجانے یہ تکرار اور کتنی طویل ہوئی کہ ان کے کندھے کو ہلا کر پوچھا گیا تو بین نیازی نے آنکھیں کھول دیں۔  
”نہیں دادو! جاگ رہا ہوں۔“ وہ دونوں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بولا۔

”اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں۔ اب تو فکر ہونے لگی تھی کہ بول کیوں نہیں رہے۔“ سفینہ منتظرانہ انداز میں بولیں۔ بین نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور پھر خود کو سرزنش کرنے لگا۔ ایسی کیفیت اس پر بھی بھی طاری ہوئی تھی۔ ہر طرف سے بے گانگی، لاپتہ اور بے زاریت، اس کے حواسوں کو چھین لیتی تھی اور سامنے والا یا تو مشکوک نظر دے اس کی ذہنی حالات کو دیکھتا یا پھر فکر مند سے..... لیکن بین نیازی اگلے چند منٹوں میں نارمل ہو چکا ہوتا تھا۔ ابھی بھی وہ نجانے کتنی دیر سے جس کیفیت میں مبتلا تھا، سفینہ کی ایک آواز..... جب اس کی ساعت سے نکلرائی تو وہ اٹھ بیٹھا اور محض کچھ ہی بل میں حال میں لوٹ آیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟ خیریت ہے؟“ بین نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔  
”ہاں خیریت ہے، آج عفاف سے بات ہوئی تھی۔“ بین نے بی وی کا ریوٹ اٹھا کر بی وی آن کیا تو سفینہ بولنے لگیں۔



”اچھا تو..... خیریت سے ہے وہ؟“ مبین نے نظریں ابائی وی اسکرین کی طرف مرکوز کر کے پوچھا۔

”ہاں خیریت سے ہے، بہت ہی پیاری بچی ہے۔ بہت خیال کرتی ہے جب بھی بات ہو تو ایسی محبت سے پیش آتی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایسا شیریں لہجہ ہے کہ بے اختیار مسکرائے پر مجبور کر دیتی ہے۔“ عروش کی ہدایت کے عین مطابق سفینہ عفاف کی اچھائیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگی تھیں۔

”آپ مجھے عفاف کی تعریفیں سنانے کے لیے جگہ رہی تھیں؟“ مبین نے ایک نظر ان کو دیکھ کر سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”ارے نہیں بیٹا، جگا تو اس لیے رہی تھی کہ تم مجھے ماریٹ لے چلو۔ کچھ چیزیں لینی ہیں اور یہ بھی کہ کافی دیر سے چائے نہیں پی ہے۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور عفاف کا بھی پیغام تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو۔“ سفینہ ہولے سے ہنس کر اسے بتانے لگی تھیں تو عفاف کے پیغام کے ذکر پر مبین نیازی ٹھنک کر رہ گئے۔

”کیوں؟ خیریت تو ہے ناں۔ عفاف نے رابطے کا کیوں کہا؟“ مبین پوچھنے بنا نہ رہ سکا۔

”ہاں میرے خیال میں خیریت ہی ہے شاید.....“ سفینہ نے جان بوجھ کر آفیشل کام کا حوالہ نہ دیا تھا حالانکہ عفاف کی تاکید تھی لیکن عروش کا کہنا ماننا پڑا اور آدھا اور اچھا پیغام پہنچا دیا۔

”یہ ہے اس کا نمبر۔“ سفینہ نے اپنی ذاتی ڈائری (جہاں وہ نمبر لکھا کرتی تھیں) مبین کے سامنے کی تو مبین عفاف کے نام کے ساتھ لکھا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کرنے لگا۔

”عفاف.....“ زیر لب اس نام کو دہرایا گیا اور ایک مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کیا۔

”دادو آپ کھانا لے آئیں، میں فریش ہو کر آتا ہوں پھر ماریٹ چلیں گے۔“ دوسرے پل وہ

سر جھٹک کر سفینہ کی جانب متوجہ ہوا تھا اور قدم باہر کی جانب بڑھا دیے جبکہ سفینہ نے اس کے چہرے پر ابھرنی مسکراہٹ کو گہری اور ذمہ داری نظر سے دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ لال گلاب کے پھولوں کا گلستہ پکڑے کھڑی انتظار کی کوفت کو با مشکل برداشت کر رہی تھی۔

نمبر لال گلاب کے پھولوں کا گلستہ بہت خوب صورت تھا، صرف چھ گلاب، چند ایک ادھ کلی کلیاں اور چند گلابوں کی تازگی جو بن پر تھی۔ اس نے مسکرائی نظروں سے ان کو دیکھا تو دل میں ایک عجیب سی لطافت محسوس کی۔

”محبت..... کتنا ٹھنک ہوتا ہے یہ سفر۔ لیکن پھر بھی ایک چاشنی ہمہ وقت اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”میں نے کب سوچا تھا کہ میں بھی کبھی اس جذبے کی اسیر ہو جاؤں گی اور اپنے سے پندرہ سال بڑی عمر کے انسان سے ایسی محبت ہو جائے گی کہ میں.....“

”ہیلو..... ریڈی؟“ ابھی وہ نظریں ہاتھ میں پکڑے گلابوں پر جماتے خود کلامی میں مصروف تھی کہ آواز پر اس کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹا۔

”نیں ریڈی.....“ دوسرے پل وہ ساری سوچوں کو جھٹک کر آگے بڑھی تھی۔

”السلام علیکم!“ وہ پرمسرت لہجے میں کہتے ہوئے گاڑی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

”علیک السلام! بیٹھو گاڑی میں۔ مجھے گیراج میں تھوڑا سا کام ہے۔ تمہیں پہلے اس لیے پک کر رہا ہوں کہ پھر ادھر نہیں آنا پڑے گا۔“ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تو مانی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو دل آویز نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔ دل ایک عجیب لے پر دھڑکا تھا۔ بنا کچھ کہے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بہت پیارے پھول ہیں، کس کے لیے

ہیں؟“ مانی نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑے گلابوں کو دیکھ کر پوچھا۔

”آپ کے لیے۔“ یہ کہتے ہی اس نے وہ پھول ڈرائیونگ کرتے مانی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”میں بہت کریزی اسٹوڈنٹ ہوں ناں بہت محنت کرنی پڑتی ہے آپ کو۔ تو میں نے سوچا، آپ کا شکریہ ادا کروں۔“ دل آویز کا نہ صرف لہجہ بلکہ اس کے ہر ایک لفظ سے محبت ٹپک رہی تھی اور ہلکی سی شرارت کا بھی شائبہ موجود تھا۔ مانی نے پھر اس کی طرف دیکھا نہ ہی ہاتھ بڑھا کر پھولوں کو پکڑا، وہ منتظر تھی لیکن..... مانی کا گیراج آ گیا اور وہ معذرت کر کے باہر نکل گیا۔

”اب تمہارے لیسن کا وقت شروع ہوا ہے، اس لیے اب تم ڈرائیونگ کرو۔“ دل آویز گاڑی میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ مانی دس منٹ میں ہی واپس آ گیا اور اس سے مخاطب ہوا تو دل آویز اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکی تھی۔ ڈیش بورڈ پر پھول رکھے تھے جواب مانی کے بالکل سامنے تھے۔

دل آویز اب ڈرائیونگ شروع کر چکی تھی۔ ایک دم دل آویز نے بریک لگائے اور ڈیش بورڈ پر رکھا پلے مانی کی گود میں آگرا تھا۔ دل آویز ہلکھلا کر ہنسی اور مانی نے لب بھینچ لیے۔

”یہ پھول آپ کے لیے ہیں، ان کو معلوم ہے کہ ان کا اصلی حق دار کون ہے۔“ دل آویز نے سامنے ٹریفک لائٹس کو بدلتے دیکھتے ہوئے بریک پر پاؤں رکھا اور شوخ انداز میں مانی کو کہنے لگی۔

”تمہاری ڈرائیونگ اب بہت اچھی ہو گئی ہے، تم نے ٹیسٹ بک کروایا؟“ مانی نے اس کی ہر اک شوخی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

”ٹیسٹ نہیں بک ہو رہا ہے، بہت ٹیسٹ ڈیٹ مل رہی ہے۔“ دل آویز نے مانی کو آگاہ کیا۔

”تم بک کرو، ساتھ میں نوٹ لکھ دو کہ کنکلیشن میں تم سے رابطہ کیا جائے۔ جب بھی کوئی

ٹیسٹ کینسل ہوا تم کو جگہ مل جائے گی۔“ مانی اب بے انتہا سنجیدگی سے اس سے مخاطب تھا۔

”دیکھ..... دیکھ کر.....“ دل آویز نے شیشے سے دیکھا کہ ایک گاڑی اس کو اور ٹینک کر رہی ہے تو ایک لحنت نبھانے لگا ہوا کہ دل آویز نے اپنی گاڑی کی اسپنڈ بڑھا دی تاکہ دوسری گاڑی کو جگہ نہ مل سکے، اور ٹینک کرنے کے لیے، تو مانی نے تیزی سے اس کو وارن کیا کہ وہ اس وقت ایک خطرناک موڑ پر ہے اور اپنی طرف والے بریک پیڈل کو دبا کے اور اسٹیرنگ وٹیل پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کو معمولی سا بائیں جانب کیا اور ٹینک کرنے والی گاڑی کو گزر جانے دیا اور دل آویز کو ڈانٹنے لگا۔

”آئی ایم سوری۔“ حسب معمول وہ ایک بار پھر معذرت کرنے لگی۔

”تمہیں احساس ہونا چاہیے کہ تمہاری غلطی بڑی تھی، درگزر نہیں ہو سکتی۔“ مانی نے سپاٹ انداز میں کہا۔

دل آویز نے بنا اس کے کہے گاڑی کو ایک سائڈ روڈ کی طرف موڑ دیا تھا اور ایک جگہ گاڑی پارک کر دی تھی۔

”آپ کی آنکھیں اتنی بڑی تو نہیں پھرتی چھوٹی سی غلطی آپ کو اتنی بڑی کیسے لگتی ہے۔“ دل آویز، گاڑی کا انجن آف کر کے مانی کی طرف مڑ کر شریر انداز میں اس کی طرف دیکھ کر اس سے دریافت کرنے لگی تو مانی نے نظریں اٹھا کر اس کے ایک الگ انداز کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”ویسے آپ کی پر سنائی بہت ڈھنگ ہے اور ایسے سنجیدہ چہرہ لیے، مانتے پر گھور ڈالے چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو بڑا بڑا سمجھ کر ایسے غصے سے دیکھتا۔ مجھے تو ذرا بھی ڈر نہیں لگتا آپ سے۔“ دل آویز کا پل بھر رک کر الہیز انداز میں کہنا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے بات بدلی ہے، مانی نے گہرا سانس خارج کیا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔ میرا مقصد اپنے اسٹوڈنٹ کو ڈرانا نہیں ہے،

لیکن غلطی پر ٹوکنا بڑا ہوتا ہے، سمجھنا پڑتا ہے۔“ مانی اس کے خاص انداز کو نظر انداز کر کے سرسری لب و لہجے میں کہنے لگا تھا دل آویز نے لب بھینچ لیا۔

”کیا آپ غلطیاں معاف نہیں کرتے؟“ دل آویز نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”غلطیاں معاف نہ کرتا، ہوتا تو تمہیں ایک سال اور تین مہینے سے سکھانہ رہا ہوتا۔“ چھ مہینے میں میرے اسٹوڈنٹ ڈرائیونگ پاس کر لیتے ہیں۔ تم ریگولر ایک سال اور تین مہینے سے بنا کوئی لیسنس مس کیے ڈرائیونگ سیکھ رہی ہو لیکن اگر اب بھی ایسی غلطیاں کرو گی تو غصے میں آنا تو میرا حق بنتا ہے۔“ مانی ہلکے ہلکے انداز میں کہنے لگا۔

”آپ نے ہی کہا تھا کہ ہر کسی میں سیکھنے کی صلاحیت الگ لیول پر ہوتی ہے، شاید میری صلاحیت کا لیول کچھ زیادہ ڈاؤن ہے۔“ دل آویز نے اپنا ہی مذاق اڑایا تھا۔

”تم ٹیسٹ بک کروا دینا اور اب گاڑی چلاؤ کرو۔ لیکن ذرا احتیاط سے کہ یہ اسٹریٹ روڈ کالی بڑی ہے۔“ مانی مدح می مسکراہٹ کو ہونٹوں پر آنے سے روکے روڈ پر چلتی ٹریفک کو دیکھ کر اس سے بولا تو دل آویز کو گاڑی کا انجن اشارت کرتے ہی بنی۔

”آپ کو معلوم ہے ریڈروز کا کیا مطلب ہوتا ہے۔“ دل آویز نے مانی کی طرف دیکھا جس کی زانو پر سرخ گلابوں کا گل دستہ رکھا تھا اور یقیناً پھولوں کا مانی کی گود میں ہونا ایک بے اختیارانہ عمل تھا۔ جس کو دل آویز نے بہت محبت بھری نظروں سے دیکھ کر سوال کیا تھا۔

مانی نے اس کی طرف دیکھا تھا، کندھے اچکا کر ہٹا کچھ بولے لالعلی کا اظہار کیا تو دل آویز نے ایک نظر مانی کو دیکھا۔ ایک نظر..... بہت سے راز کھولتی ہے وہ ایک نظر..... بہت سے رنگوں سے مزین وہ ایک نظر..... بہت معنی خیز تھی وہ ایک نظر.....

وہ اب ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھی لیکن

ڈانٹوں تلے دبے ہونٹ پر کھلتی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ اب یہ لب بھینچنے تو دل کی بات کہیں گے اور مانی مسلسل خاموش تھا۔ اس نے اصرار نہیں کیا تھا، سرخ گلابوں کا مطلب جاننے کی ضد نہیں کی تھی۔ دل میں چور تھا تب ہی تو حقیقت کا سامنا کرنے سے اجتناب برتنا جا رہا تھا۔ محبت پر وہ پوشی کی ساری کوششوں کو رد کر دیتی ہے۔

”سرخ پھول محبت کی علامت ہے۔ جب کبھی لفظ اظہار نہ کر سکیں تو سرخ گلاب وہ سارے جذبے عیاں کر دیتا ہے جو زبان سے نہیں کہے جاسکتے۔“ یہ لمحے برسوں سے دل آویز کے دل میں چپتی محبت کو لفظوں میں ڈھل جانے کے تھے۔

مانی نے آنکھیں سے رخ موز کر دل آویز کو دیکھا۔ وہ گاڑی پارک کر چکی تھی، لیسنس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ مانی کو چونک جانا چاہیے تھا، دل آویز پچھلے ایک سال اور تین مہینے سے جو جذبے ڈھکے چھپے انداز میں مانی پر عیاں کر رہی تھی اب کھلے عام صاف شفاف انداز میں کہہ رہی تھی۔ لیکن اس کا انداز حسب معمول نہایت پرسکون تھا۔

”آپ سے محبت ہے مجھے۔“ دل آویز یوں گویا ہوئی جیسے کسی جرم کا اقرار کر رہی ہے۔ یوں بولی گویا مانی کوئی نا سمجھ بچہ ہے جس کی سمجھ میں اس کے انداز نہ آتے تھے۔

”نجانے کب سے، نہیں معلوم کہ کتنے دن گزر گئے۔ نہیں جانتی کہ کتنی راتیں یوں ہی کاٹ دیں لیکن یہ سچ ہے کہ آپ میرے لیے بہت خاص ہیں۔“ دل آویز انتہائی مدہم آواز میں اقرار محبت کرنے لگی۔ وہ سب کہہ رہی تھی جو صرف سوچا کرتی تھی۔ مانی نے اپنی روش نہ بدلی۔ ان ہی خاموشیوں اور ساپٹ انداز میں بیٹھا تھا۔ دل آویز اس کی طرف دیکھ نہ رہی تھی لیکن اس کی سنجیدگی محسوس کر کے اس نے اس کی طرف دیکھا۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا تو دل آویز حسب عادت بھر بولی۔

”تم اپنا پروردگار بل لائنس مجھے دو۔ میں تمہارا ٹیسٹ بک کر ادوں گا۔ تم اب ٹیسٹ کے لیے ریڈی ہو۔“ اس کی ہر اک بات کو، ہر اک جذبے کو نظر انداز کر کے وہ جب بولا تو قیظ نہ.....

دل آویز نے بے حد جب سے اس کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اک سایہ لہرایا اور دوسرے بل بیک سیٹ پر رکھا ایک اٹھایا اور والٹ سے لائنس نکال کر مانی کے ہاتھ پر رکھا اور دوسرے لمحے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”کسی کی باتیں چھپ چھپ کر سننا اخلاقی جرم ہے۔“

”اور یوں سر عام کسی کی باتیں کرنا کیا یہ جرم نہیں ہے۔“ عفاف نے چند ایک باتوں کے بعد فون بند کر دیا تھا تو اب عروش تیوریاں چڑھاتے عدی سے مخاطب ہوئی لیکن اس کا وہ بدو جواب اس کو شیشا گیا۔

”جی نہیں، یہ لڑکیوں کی باتیں ہیں۔“

”لڑکیوں کی باتوں میں لڑکے کی برائی ہوتی ہے کیا۔“ عدی حیران ہی تو ہوا تھا۔

”نہیں تو..... اور بائے وا دے، صرف عدی..... ہم آپ کی کوئی برائی نہیں کر رہے تھے۔“ عروش اپنی بات پر ڈٹ کر بولی۔

”کسی کو تک چڑھا کہنا اس کے ذکر پر مذہب سورتا، واہ واہ مس عروش نیازی! کیا اخلاقی ہیں آپ کے۔“ عدی کو اس کا بار بار صرف عدی کہنا اب سچ معنوں میں زچ کرنے لگا تھا۔ اس لیے سارے اخلاقیات کو بھول کر اس پر طنز کرنے لگا تو عروش نے زبان و دانتوں تلے دبا لی۔

”تو اس میں برائی کیا ہے یہ تو حقیقت ہے۔“ عروش اب بے نیازی سے بولی۔

”میری بہن سے میری شکایتیں لگا کر اب زیادہ ٹھیکیداری بننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ عدی جھنجھلایا تھا۔ اس کا اشارہ اس کے لا پرواہ انداز کی

طرف تھا۔ عروش اپنی ہنسی نہ روک سکی تو رخ موز گئی، تو عدی اس کو گھور کر رہ گیا۔

”دیکھو مجھے یہ بالکل بھی پسند نہیں ہے کہ میں بات کر رہا ہوں اور کوئی منہ موڑے۔“ عدی بارعب آواز میں بولا۔

”اوکے بولیں، میں سمجھی تھی آپ کی بات ختم ہوئی ہے۔“ عروش ہنسی کو ضبط کرتی سرخ چہرہ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اونہہ.....“ عدی نے ناگواری سے اسے دیکھا اور دوسرے بل پلٹا اور چکن سے باہر نکل گیا۔

”ہاہاہا..... بالکل انسان۔“ عروش دل کھول کر ہنسی اور ایک بار پھر عدی کو لقب دیا۔

☆☆☆

”بابا جانی! آپ تو مجھے بھول ہی گئے ہیں۔“ اس کا شکایتی انداز احسن ندیم کی سماعت سے ٹکرایا۔

”بیٹیاں تو بابا کی جان ہوتی ہیں اور ہم اپنی جان کو کیسے فراموش کر سکتے ہیں؟“ احسن ندیم نے پدرزادہ محبت سے پُر لہجے میں جواب دیا۔

”تو اتنے دن ہو گئے آپ نے نہ تو میٹج کیا نہ کال۔“ عفاف مذہب سے رکر کہنے لگی۔

”اتنے دن ہو گئے؟“ احسن ندیم جو صوفہ پر نیم دراز تھے یک دم اٹھ بیٹھے۔

”پاکستان میں دن کتنے گھنٹے کا ہوتا ہے؟“ احسن ندیم نے اس سے پوچھا۔

”دن تو بارہ گھنٹے کا ہی ہوتا ہے لیکن رات کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے ناں تو چوبیس گھنٹے کے بعد دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔“ عفاف کا زروٹھا لہجہ احسن ندیم کو مسکراتے پر مجبور کر گیا۔

”اچھا تو اس کا مطلب ہوا کہ چوبیس گھنٹے ہو گئے ہمارا رابطہ نہیں ہوا۔“ احسن ندیم نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

”بابا جانی اب آپ مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”نہیں بیٹا! بس تمہیں یاد کرتا ہوں بہت، ویسے بیٹا ایک ضروری بات بھی کرنی ہے تم سے۔“

اس لیے میں چاہتا تھا کہ تم یو کے آ جاؤ۔“ احسن ندیم نے سہولت سے اپنی خواہش اس کے سامنے رکھی۔  
”کون سی ضروری بات بابا جانی!“ وہ ہنسی تو تھی لیکن پھر بھی پوچھنا بھی ضروری تھا۔  
”بیٹا تمہاری مٹی نے بہت دفعہ تم سے بات کی تو ہے، لیکن تم نے ہر دفعہ ٹال منول سے جواب دیا ہے۔ بیٹا تم ہماری زندگی ہو لیکن ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی۔ میں نے عدی سے زیادہ تمہیں سپورٹ کیا ہے، بیٹیوں کو رخصت کرنا نہایت ضروری بھی ہوتا ہے اور فرض بھی اور یہی مناسب عمر بھی ہے۔ تمہارا یو کے آنا اگر فی الحال ممکن نہیں، کیوں کہ انسٹی ٹیوٹ کی ذمہ داری بھی لے لی ہے اور اپنی جاب بھی تو میں ایسا کرتا ہوں پاکستان کا چکر لگاتے ہوں۔“ احسن ندیم کی باتیں عفاف نہایت خاموشی سے سن رہی تھیں۔

”ہاں بابا جانی! آپ پاکستان آ جائیں۔“ عفاف جو ان کی باتوں سے پریشان ہو رہی تھی ایک دم پر جوش انداز میں بولی۔  
”ہاں ٹھیک ہے، تم بھی سوچ لو اس بارے میں۔ ہم نے تمہاری بات مانی تھی، تمہیں جاب کے لیے پاکستان جانا تھا، کچھ کرنا تھا ہم نے ساتھ دیا تو بیٹا اب۔۔۔۔۔“

”جی بابا جانی! آپ نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا تھا اور اب آپ کی ہی وجہ سے میری جاب ماشاء اللہ بہت اچھی ہے اور ان شاء اللہ آگے بھی اچھا ہوگا۔“ عفاف، احسن ندیم کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولی تو احسن ندیم کا سر ایک بار پھر فخر سے بلند ہو گیا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عروش ڈرائنگ روم کے باہر کھڑی تھی کہ آواز پر یک دم بوکھلا گئی۔

”آئی آئی آپ کو ہی ڈھونڈ رہی تھی۔“ اس نے ایک دم بات پتائی تھی ورنہ وہ ایک اخلاقی جرم کی مرتکب ہو چکی تھی۔ احسن ندیم کی باتیں جو عفاف سے کر رہے تھے سن چکی تھیں اور جان تھی کہ عفاف

کے لیے اب جلد از جلد رخصتی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔  
”کیوں بیٹا! خیریت؟“ شمن اس کو ہمراہ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔  
”وہ آئی! کھانا تیار ہے ناں تو پوچھنا تھا کہ کب تک کھانا ہے۔“ عروش نے اطلاع دی۔  
”عدی کہیں باہر گیا ہے تو وہ آئے تو پھر کھاتے ہیں۔“ شمن احسن ندیم کے برابر بیٹھے ہوئے ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے آئی میں اپنے روم میں جا رہی ہوں۔ جب کھانا کھانا ہوا تو مجھے بتا دیجیے گا میں کھانا لگا دوں گی۔“ عروش جلد از جلد سفینہ سے بات کرنا چاہ رہی تھی کہ ان کو بتا سکے۔ عفاف کی شادی کا ذکر چھٹہ ہوا ہے اور انہیں مبین کے لیے بات کرنی ہے۔ خوش مزاجی سے کہہ کر شمن کے اثبات میں سر ہلاتے ہی وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

اتوار کا دن اس کے لیے مصروف ترین دن ہوتا تھا۔ ڈھیر سارے کام کرنے ہوتے تھے۔ سب سے پہلے اس نے دھونے والے کپڑوں کو الگ کیا۔ وہ کپڑے جو ہاتھ سے دھونے تھے، وہ الگ رکھے اور کچھ کو ڈرائی کلین کروانا تھا وہ الگ کیے اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

ہاتھ سے دھونے والے کپڑوں کو دھو کر پھیلا دیا اور اب بچن میں کام کرنا تھا۔ ابھی چند برتن سینے تھے کہ کافی کی طلب نے ہاتھ روک دیے، وہ سارے کام چھوڑ کر اپنی طلب کو پورا کرنے لگی۔

کافی بنا کر وہ بچن سے باہر نکلی۔ اس کا ہمیشہ سے طریقہ کار تھا کہ کافی یا چائے وہ آرام سے پیٹھ کر پیا کرتی تھی۔ اس دوران وہ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ کافی کا کپ لیے وہ صوف پر جا بیٹھی تو چار چر پر لگا موبائل بچ اٹھا۔ اس نے کافی کا سپ لیا اور موبائل کا لیس کا بٹن پیش کر کے موبائل کان سے لگا لیا۔

”السلام علیکم!“ سلام پر اس نے دوسرے پل موبائل کان سے ہٹا کر نمبر کو دیکھا۔ جانا پچھانا انداز

اس کو ایک بار پھر غصہ دلانے لگا۔  
”وعلیکم السلام!“ اس نے سپاٹ انداز میں سلام کا جواب دیا۔  
”آپ کا پیغام مل گیا تھا لیکن مصروف رہا، اس لیے دو دن سے رابطہ نہیں کر سکا۔ سب خیریت ہے؟“

”پیغام دینے والے نے یقیناً پیغام کی نوعیت سے بھی آگاہ کیا ہوگا؟“ اس کا انداز دو ٹوک تھا۔  
”نہیں۔ آپ کے نمبر کے ساتھ بس اتنا کہا گیا تھا کہ آپ نے کہا ہے کہ میں رابطہ کروں۔“ مبین نیازی نے وہی کہا جو سفینہ نے کہا تھا لیکن عفاف بے یقین تھی۔

”میں نے داؤد سے کہا تھا کہ آڈیشنل کام کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔ میرے پاس آپ کا کاٹیکٹ نمبر نہیں تھا تو آپ خود مجھ سے رابطہ کریں۔“ عفاف نے تیز لہجے میں اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کی۔

”ویل۔۔۔۔۔ آپ داؤد سے میرا نمبر لے کر خود مجھ سے رابطہ کر لیتیں تو زیادہ بہتر رہتا اور آپ کو اس پل اپنے آپ کو سچا بھی ثابت نہ کرنا پڑتا۔“ مبین نیازی ہلکے ہلکے انداز میں اس سے مخاطب تھا۔  
”کیوں؟“ عفاف تنک مزاجی سے بولی۔  
”آپ کی آسانی کے لیے کہہ رہا ہوں۔“

مبین نیازی اپنے مخصوص انداز میں بولا۔  
”خیر مسٹر نیازی! میں نے۔۔۔۔۔“

”آپ کو اتنا قابل ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مجھے مبین کہہ سکتی ہیں۔“ جانے کیوں مبین نے ایک بار پھر اسے مسٹر نیازی کہہ کر پکارنے سے روکا۔  
”آڈیشنل میسرز کان فارلر پینڈل نہیں کیا جاتا مسٹر نیازی!“ عفاف نے سنجیدگی سے کہا تو مبین نیازی لب بچ کر رہ گیا۔

”امید کرتی ہوں کہ بدھ کو دس بجے سے لے کر چار بجے تک آپ فری ہوں گے۔“ ملاقات کا ارادہ ہے کیا؟“ مبین نیازی کا

لہجہ مسکرایا تھا۔

”جواب کے لیے انٹرویو کا وقت ہے۔“ عفاف دانت پیس کر بولی۔  
”ہاں تو ملاقات ہی ہوئی ناں؟“ وہ اپنی شرارت پر قائم تھا۔  
”مسٹر نیازی!“

”آئی ایم سوری۔“ اس سے پہلے کہ عفاف اس کو مزید سرزنش کرنی، مبین نے معذرت کر لی۔  
”میں پوری کوشش کروں گا کہ۔۔۔۔۔“

”مسٹر نیازی! کوشش نہیں، یو ہیو ٹو بی دیر ان ٹائم (آپ کو وہاں وقت پر پہنچنا ہے)۔ میرے پاس انٹرویو کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور ہم نے امید داروں کو انٹرویو کا ل کر دی ہے۔“ عفاف اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔

”مس عفاف! آپ شاید بھول رہی ہیں کہ میں آپ کا پاس ہوں۔“ مبین نیازی اس کے انداز پر حیران ہوا تھا۔

”مسٹر نیازی! شاید آپ بھی بھول رہے کہ میں انسٹی ٹیوٹ میں پائٹرن ہوں۔“ عفاف نے یاد دہانی کرائی۔

”بائے داؤدے، آپ کی اس حد تک کے دلچسپی کی وجہ؟“ مبین نیازی کے لیے اس کا رویہ حیران کن تھا۔

”مجھے یہ ذمہ داری دی گئی ہے مسٹر نیازی! عروش سے وعدہ کیا تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کی سادھ میری وجہ سے بھی متاثر نہیں ہوگی۔“ عفاف نے نیک نیتی سے کہا تو مبین اس کے غلوں سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

”ٹھیک ہے، کل انٹرویو کے لیے میں آپ ساتھ ہوں گا۔“ مبین نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔ ”صبح اگر آپ ذرا جلدی آفس پہنچ جائیں تو پلاننگ کر لیں گے۔“ ابھی تو کافی لیٹ ہے آپ کے لیے تو مناسب بھی نہیں ہے گھر سے نکلتا۔“ مبین کا انداز کینٹرنگ تھا۔

”نہیں، اس سے صرف ایک ہی بار ملاقات ہوئی ہے، ہاں فون پر رابطہ ہے لیکن فون پر کوئی بات

”اچھا پہلے مبین سے تو بات ہو، یہ نہ ہو، وہ بگڑی  
راضی نہ ہو۔“ سفینہ نے اسے کہا۔

”اور اگر بھی کرنی پڑ جائے تو؟“ دونوں بازو  
 بندھے عدی نے سوال کیا تو وہ سٹپٹا گئی۔  
 ”ایسی نوبت کبھی نہیں آئے گی۔“ عروش نے

”ہمارے درمیان سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن  
وہ قطعاً نہیں۔“ عردش نے دانت پیس کر اسے کہا۔



”سب کچھ؟“ عدی نے فقط دو لفظوں کو پکڑا تھا اور سب کچھ کی وضاحت مانگی تھی۔  
”بدنیز، جاہل.....“ عروش نے من ہی من اسے مزید القاب سے نوازا۔  
”دشمنی نفرت.....“ وہ فقط دو لفظ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”جب ہر ملاقات میں باتوں میں تکی ہو، لہجے جذبات سے عاری اور بے مروت ہوں۔ کوئی بھی بات چائے کی منٹھاس سے شروع تو ہو جائے لیکن ختم کافی کی کڑواہٹ پر ہو تو ایسے میں کوئی بھی عہد باندھنا دوستی جیسے پاکیزہ جذبے کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔“ عروش نے کافی کا گھونٹ لیا اور اپنی طرف سے اس کو لا جواب کرنا چاہا۔

”تم عہد باندھو میرا وعدہ ہے کہ کوئی نا انصافی نہیں ہونے دوں گا۔“ عدی ہولے سے ہنس کر بولا تو اس کا لہجہ ہی نہیں الفاظ بھی ذمہ تھے۔ عروش نے جھینپ کر اسے دیکھا، اگلے لمحے کافی کا کپ دھو کر رکھنے کے بجائے بچا ہوا ایک گھونٹ اس پر اچھال کر باہر نکل گئی اور وہ اپنی نئی شرٹ پر کافی کے داغ کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔

”ایک عہد تو باندھنا ہی ہوگا تمہیں عروش نیازی! چاہے دوستی کا ہو یا محبت کا۔ جسٹ ویٹ.....“ زیر لب بڑبڑایا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”آپ کا امپریشن میری نظر میں کچھ اتنا اچھا نہیں ہے مسٹر نیازی! برائے مہربانی اس کو مزید خراب نہ کریں ورنہ میرے لیے آپ کے ساتھ انٹیمیٹی ٹیٹ کے لیے کام کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔“ پچھلے ایک گھنٹے سے عفاف، مبین نیازی کے انتظار میں اس کے آفس میں جلے پاؤں کی ٹکی کی مانند گھوم رہی تھی۔

”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں

ضروری بات کہنی ہو، کوئی وعدہ نبھانا ہو

اسے آواز دینی ہو، اسے واپس بلانا ہو

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں.....

مبین نے ہنستے ہوئے اس کے تیوروں سے مظلوم ہوتے ہوئے منیر نیازی کی غزل کا قطعہ پڑھا تو عفاف نے آگ برساتی نگاہوں کو اس پر مرکوز کیا۔

”آئی ایم سوری۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی اس لیے لیٹ ہو گیا ہوں۔“ مبین نیازی کا انداز ہر طرح کی فکر سے نا پید تھا اور عفاف کو اس کا یہی لاپرواہ انداز ہی دانت کچکپکانے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ اتنی جتنی ہوئی تھی کہ اس اوکے بھی نہ کھا اور مبین نیازی فائل میں لگے پیپرز نکال کر اب اس کے سامنے بیٹھا انٹرویوز کے اہم سوالات کو اس سے وٹسکس کرنے لگا تھا۔

ساڑھے دس بجے پہلا انٹرویو تھا۔ درمیان میں ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد شام کے پانچ بجے وہ فائدہ سمجھتے تھے اور طے کر لیا تھا کہ کون سے تین لوگوں کو جاب کے لیے اپائنٹمنٹ لیٹر بھیجنا ہے۔ مبین نیازی اب عفاف کو ساری تفصیل سمجھا رہا تھا اور کچھ جلدی میں بھی تھا کیوں کہ کچھ بجے اس کی اپنی ایک انتہائی اہم میٹنگ بھی چوکی طرح بھی نینسل نہ ہوئی ہاں تاخیر سے ہو گئی تھی۔ اب وہ جلدی جلدی عفاف کو سمجھا کر نکلتا جا رہا تھا۔

”مس عفاف! مجھے ابھی جانا ہے، سو پلیز آپ یہ پیپرز ریڈی کر کے ہی جانا۔ باقی تفصیلات ہم کل وٹسکس کر لیں گے۔“ مبین نے اسے مزید ہدایات دیں اور وہاں سے نکل گیا۔

عفاف کے لیے مبین نیازی کا رویہ سمجھنا ایک انتہائی کٹھن کام تھا۔ اگر مبین نیازی غصے والا ہے تو اس کے ساتھ اس کا رویہ ایسا کیوں نہ تھا؟ مبین کا اس کے ساتھ فلٹر کا بھی انداز نہ تھا۔ دوستانہ بھی نہ تھا لیکن جانے کیوں اس کا انداز دینا بھی نہ تھا جیسا عروش نے کہا تھا، دوسرے لفظوں میں ڈراپ تھا۔

”لالہ گھر کی لڑکیوں کے لیے بہت پڑھ لکھو ہیں۔“ عروش نے کہا تھا۔  
”تو کیا مسٹر نیازی مجھے گھر کی لڑکی سمجھ رہا ہے

ہے؟“ وہ بڑبڑاتی اور دوسرے لمحہ اس نے طائرانہ نگاہ اس کے آفس میں ڈالی جو قرینے سے سیٹ ہوا تھا۔ اس کی میز پر چیزیں جس انداز سے براجمان تھیں وہ مبین نیازی کی نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ عفاف اپنی کرسی سے اٹھ کر مبین کی کرسی کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

ایک طرف نوٹ بک دیکھی تھی، بلا ارادہ ہی اس کے ہاتھ بڑھے اور دوسرے پل اس نے نوٹ بک کو کھول لی۔

یہ پل اس کے لیے انتہائی حیرت کے تھے۔ دل کے اسٹیکر پورے صفحے پر چپکائے گئے تھے۔ ”دل آویزا“ عفاف نے ایک اسٹیکر پر لکھے لفظ کو بخور دیکھا تھا۔

”لگتا ہے کسی لڑکی کی ڈائری ہے۔“ وہ زیر لب ہنسی تھی۔ پھر یک دم چونگی اور اس ایک لفظ کو بخور دیکھا۔

”اتنا بڑا آفس ہے لیکن ایک پین تک نہیں رکھا ہوا۔“ وہ چیخ پر بیٹھ گئی تھی اور کام کرنے لگی تھی لیکن ہر جگہ دیکھنے کے بعد بھی اسے پین نہ ملا۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ ہنسی رہی۔ تقی دیگر زری لیکن وہ کوئی پیپر ورک نہ کر سکی۔ اس پر ایک عجیب سی یاسیت طاری ہونے لگی تھی۔ ٹھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔

”کچھ لمحات بہت عجیب ہوتے ہیں، بہت طاقت ور بھی۔ ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور ہم ان کی گرفت سے خود کو کبھی بھی آزاد نہیں کر سکتے۔ اگر میں مگر یہ جیتی ہوئی ناں مسٹر نیازی تو اس وقت یہ آفس دھواں دھواں ہو چکا ہوتا لیکن..... اب پتا چلا کہ لڑکے اتنے سگریٹ کیوں پیٹے ہیں۔“ عفاف اس پل خود اپنے آپ کو سمجھ نہ پا رہی تھی، دونوں ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کیا اور بڑبڑاتی۔

”اگر میری مدد کی ضرورت پڑی تو کال یا میٹج کر لیجیے گا۔“ مبین نیازی نے جاتے جاتے کہا تو

تھا۔ ”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس نے اس کی آفر کو رد کیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ کو وہ اب سمجھ رہی تھی۔

”مسٹر نیازی! اتنا ایٹنی ٹیوڈ؟“ اس نے اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن کال ریسیو نہ کی گئی۔

وہ اپنا بیگ اپنے آفس رکھ کر آئی تھی ورنہ فقط ایک پین کے لیے اس کی ضرورت اسے سمجھی نہ پڑتی۔ اس کے کال ریسیو نہ کرنے پر عفاف بہت چڑی تھی، وہ بات بات پر جھنجھلا رہی تھی۔

”مسٹر نیازی! مجھے آپ کا وہ قیمتی، ہیروں سے جڑا اکلوتا پین چاہیے تاکہ میں پیپر ورک مکمل کر کے گھر جاسکوں۔ آپ اب بتانا پسند فرمائیں گے کہ کہاں چھپا کر گئے ہیں۔“

اس نے بیج ٹائپ کیا، ہر ایک لفظ کو طعنے میں ڈبو کر لکھا گیا تھا۔

”اااا.....“ میسج ملتے ہی مبین نیازی ہنسا تھا۔ ”پڑنی ناں ضرورت؟ میرا اکلوتا، لاؤلا، ہیروں سے جڑا پین راکٹنگ ٹیبل کی تیسری دراز میں ہے۔ آرام سے، ذرا احتیاط سے نکالنا۔ میری پرسل چیزوں کو کوئی چھیڑے مجھے گوارہ نہیں۔“ مبین نیازی نے جلدی جلدی تیج کار پیلہ کیا اور اس کی بجلی کا اندازہ اس کی اسپینک مس فیک سے ہو رہا تھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی کی پرسلو میں بنا اجازت دخل اندازی کا اور دوسرے بھی آپ کے پرسل دراز میں ہوگا ہی کیا؟ چند آفیشل فائلز، مگر یہ کی ادھ کھلی ڈبی اور ایک لڑکی کی تصویر۔“ عفاف نے جیسے مرجھیں چہاتے ہوئے ٹائپ کر کے سینڈ کا بٹن دبایا اور دراز کھول کر پین کو تلاش کرنے لگی۔

”آپ کی دوسری دونوں باتوں سے میں اتفاق نہیں کرتا لیکن بہر حال یہ بحث پھر کسی وقت کے لیے چھوڑتے ہیں۔“ مبین نیازی نے اس کے میسج کو بھر پور انجوائے کیا تھا۔

”ہائے۔“ بالفاظ کہے، عفاف نے تین حرف لکھ بیٹھے تھے تو مبین نیازی زیر لب مسکراتے ہوئے اپنا لام کرنے لگ گیا اور عفاف کو بھی تین ل ل گیا تھا تو وہ بھی کام میں مگن ہو گئی تھی۔ کچھ لمبے بعد آفس کا دروازہ کھلا اور آنے والے نے اسے حیرت سے دو چار کر دیا۔

مبین نیازی نے اس کے حیرت کدہ چہرے کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے معذرت کا اشارہ کیا۔ جبکہ وہ اس وقت اس کی آمد کی منتظر تھی نہ کوئی توقع تھی۔ ”آپ یہاں؟“ عفاف اس سے پوچھنے بنانہ رہی جو ایک فائل کو اٹھائے بیٹھا تھا۔

”ابھی بیننگ ختم ہوئی ہے تو میں نے سوچا۔ دیکھتا جاؤں آفس میں کوئی چیز چوری وغیرہ تو نہیں ہوئی۔“ اس سے پہلے کہ مبین نیازی کچھ کہتا عفاف نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”نہیں، خیر اب ایسی بات تو نہیں۔“ مدہم مسکان کے ساتھ مبین نے اس کے شک کی ٹی کی۔ ”ایسی ہوئی بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ آفس دوسرے لفظوں میں کسی کباڑ خانے سے کم نہیں۔ ایک ایکسٹرا پین تک تو یہاں موجود نہیں۔“ عفاف نے استہزائیہ لہجے میں کہا لیکن مبین نیازی کچھ نہ بولا اور خاموشی سے فائلز کو اسٹڈی کرنے لگا۔

”مسٹر نیازی! کیا آپ نے اپنے آپ کو کبھی ڈانٹا ہے؟“ وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی یا شاید اپنے آپ کو ڈانٹ ہی رہی تھی کہ اکثر وہ لائسنس باتوں پر اپنے آپ کو سرزنش کرتی رہتی ہے، اس کی طرف نگاہ اٹھی تو اس کو متوجہ پا کر بے دھیالی میں پوچھا۔

”ڈانٹا.....؟ میں دو، تین دفعہ اپنے آپ کو قتل بھی کر چکا ہوں۔“ مبین نیازی نے مستہم لہجے میں کہا تو عفاف نے مسکین نظروں سے اسے دیکھ کر رخ موڑ لیا۔

”میں چھوڑ دیتا ہوں آپ کو؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو مبین نیازی نے فائل کو بند کر کے اسے آفر کی۔ جس کو اس نے نادانستہ بنا کسی ہیل و جت

کے منظور کر لیا۔ ”اپنے آفس سے اپنی چیزیں لے کر آئیں۔“ عفاف نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ادھر بڑھی اور مبین نیازی چند پیپرز کو فائل میں لگا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

تقریباً دس منٹ تک وہ اس کے ہمراہ جانے کے لیے تیار کی۔

”کچھ لوگ یوں ہی اچھے لگتے ہیں، یوں ہی دل پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ ان کے اچھا لگنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، قبضہ چھڑالینا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن ان سے دور ہونا لائق ہو جانا، ناممکن سا لگنے لگتا ہے۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی، بہت اچھی، قبضہ جمایا اس نے یہاں۔“ مبین نیازی نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ عفاف نے بے انتہا حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ متوجہ نہ تھا۔ بس نظریں سڑک پر جمائے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

”ایسا تو نہیں ہوتا، کسی کے اچھا لگنے کی وجہ ہوتی ہے۔ ہمیں نظر آتی ہے وہ وجہ تب ہی تو ان کے قبضہ جمالینے پر ہم واہل نہیں جاتے۔ یہاں کوئی ٹکرا نہیں ہوئی۔“ عفاف نے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔ مبین نیازی نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ لب بلیج کر رخ موڑ گئی۔

”آپ کا امپریشن بہت الگ تھا لیکن آپ خود بہت الگ ہیں۔“ عروش نے جب بھی آپ کا ذکر کیا، آپ ایک جلا دلالہ کے روپ میں میرے ذہن میں ابھرے لیکن آپ اس کے بالکل برعکس ہیں اور یہ تضاد میرے لیے الجھن کا باعث ہے۔“ عفاف اس سے پوچھنے بنانہ نہ سکی۔

”میں..... ہم ویسے نہیں ہوتے جیسے زندگی ہمیں بنا دیتی ہے۔“ مبین نیازی کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر بات شروع کی۔ ”میں بہت نرم طبیعت کا ہوں۔ بس حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں بدل گیا۔ نرمی کی ساتھ ساتھ ایک چڑچڑاہٹ بھی میری طبیعت میں آگیا۔ عروش اور دادو کو بہت دکھ دیا، لیکن اب

کو سس کرنا ہوں کہ پہلے جیسا ہو جاؤں۔“ مبین نیازی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ عفاف کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہ تھا، وہ سمجھ چکی تھی کہ مبین نیازی کے بدلاؤ کی وجہ محبت تھی۔ باقی کا پانچ دس منٹ کا راستہ خاموشی سے گزرا۔ نہ مبین نیازی نے عفاف سے کوئی بات کی، نہ عفاف نے کچھ کہہ کر اپنا مناسب سمجھا۔

”مجھے ہم بہت شدت سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں، کسی کا ساتھ مانگتے ہیں، کسی کی محبت مانگتے ہیں۔ اس وقت کوئی اور بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا ہوتا ہے، شاید ہمارا ساتھ مانگ رہا ہوتا ہے یا شاید ہماری محبت؟ لیکن دعا اسی کی قبول ہوتی ہے جس کے حق میں وہ بہتر ہوتی ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے۔ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔“ اس کا اپارٹمنٹ آگیا تھا، دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور رک گئی مگر اس کی طرف دیکھا۔

”ہمارے پاس کچھ بھی جان لینے کا اختیار نہیں ہے، لی پوزیٹو۔“ عفاف مسکرا کر بولی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ مبین نیازی سکتے ہی سی کیفیت میں بیٹھا رہ گیا، گہرا سانس لیا اور گاڑی کو مبین میٹشن کی جانب بڑھا دیا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے؟ بڑے چپ چاپ بیٹھے ہو کوئی بات دل پر لگی ہے؟ یا دل لگا بیٹھے“ ”دل لگی، دل پر جا لگی ہے۔“ عروش نے کم صم بیٹھے عروشی سے دریافت کیا تو اس کا برجستہ جواب اس کو مسکرانے پر مجبور کر گیا۔

اس کی یونیورسٹی شروع ہو چکی تھی اور ریگولر کلاسز کے باعث آج بہت دن کے بعد عروشی کا سامنا ہوا۔ وہ بھی اس حالت میں کہ سینک دم میں نیم دراز، نگاہیں نیوی کی اسکرین پر مرکوز کیے، وہ گہری سوچ میں گم تھا۔

”خیریت؟“ اس نے کافی کا کپ میز پر رکھا اور نیچے رکھا مبین سیدھا کر کے اس پر بیٹھی اور اس

سے استفسار کرنے لگی۔ اس کے انداز میں چپیں ملاقات کی بحث کا شاہد تک نہ تھا۔ ”ہاں خیریت، ہائے دادے جھینکس فار دا کافی۔“ بیک دم عروشی سیدھا ہو کر بیٹھا اور کافی کا کپ اٹھا لیا۔ مقصد اس کو تیش دلانا تھا۔ ”کافی چور۔“ اس نے بنا کسی مزاحمت کے اس کو ایک لقب دے ڈالا، جس کو اس نے نہایت فراخ دل سے قبول کیا تھا۔

”ویسے ایک بات تو طے ہے۔“ عروشی نے کافی کا سب لیتے ہوئے کہا۔ عروش نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مستقبل میں کافی مزے دار پینے کو ملا کرے گی۔“ عروشی نے شرارتی و ذومنی مسکراہٹ کے ساتھ عروش کو دیکھ کر کہا۔

”میں کوئی مستقبل یہاں ڈیرے جمانے نہیں آئی ہوں۔“ عروش نے قدرے ناگوار لہجے میں کہا تھا۔

”کیوں، یہاں مستقل رہنے میں کیا حرج ہے؟“ عروشی نے کافی پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ انداز دوستانہ تھا، عروش نے متعجب نظروں سے پر ڈالی۔

”یہاں میرا انسٹی ٹیوٹ ہے، لالہ ہیں، دادو ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر تو میں یہاں نہیں آ سکتی ناں۔“ عروش نے کہا۔

”اس کا مطلب تم کبھی شادی نہیں کرو گی؟“ عروشی کے براہ راست سوال پر عروش نے شٹا کر اسے دیکھا۔

”ایسے بندے سے کر دل گی جو گھر بھائی بن کر رہے گا۔“ عروش گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”میری سفارش کر دو بابا جانی اور می سے۔“ عروشی نے کہا تو عروش نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے نیویارک جانا ہے۔“ عروشی منہ بسور کر بولا۔

”تو جاؤ ناں، آپ کون سا چھوٹے ہیں جو آپ اکیلے نہیں جاسکتے۔“ عروش ہولے سے اُسی تو عدی نے اسے گھورا۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ میں چھوٹا ہوں اور اکیلے نہیں جاسکتا۔ بابا جانی پاکستان جا رہے ہیں تو می اکیلی ہوں گی۔“ عدی نے ایک بار پھر منہ لٹکا کر کہا۔

”اکیلی کیوں ہوں گی؟ میں بھی تو ہوں ناں۔“ عروش بے نیازی سے بولی۔

”ویسے انگل اور آئی دو نوں کیوں نہیں جاتے؟ آپ نیویارک چلے جاؤ۔“ دوسرے پلے عروش نے حل پیش کیا۔

”اور گھر میں؟“ عدی کو اس کا آئیڈیا پسند آیا تھا۔

”میں تو ویسے بھی دن بھر یونیورسٹی میں ہوتی ہوں۔ رات کو سوتا ہی ہوتا ہے تو کوئی مسئلہ نہیں۔“ عروش مسکرائی۔

”مطلب ہم پورا گھر تمہارے حوالے کر کے خود چلے جائیں۔“ عدی نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”میں کوئی ڈاکو نہیں ہوں، جو پیچھے سے گھر کا صفایا کر کے فرار ہو جاؤں گی۔“ عروش یک دم حیکمے لہجے میں بولی۔

”کیا معلوم..... ہم نے تو یہی سنا ہے کہ خوب صورت لڑکیاں چوری کرنے میں ماہر ہوتی ہیں۔“ عدی کے ذہنی جملوں میں اب اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”مسٹر صرف عدی! میں چور نہیں ہوں، اگر اعتبار نہیں کرنا تو نہ کریں لیکن الزام تو نہ لگائیں۔“ عروش چڑکربولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک تو میری کافی پی گئی اور پھر میرے مشورے پر مجھے ہی مشکوک بنایا جا رہا ہے۔“ وہ باہر کی طرف قدم بڑھاتی بڑبڑاتی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ عدی کے الفاظ پر وہ رک

گئی تھی۔

”میں نیکسٹ ویک تک نیویارک جا رہا ہوں۔ بابا جانی اور می کو راضی کرنا ہے۔“ عدی جابنے کیوں اسے بتا رہا تھا، وہ بھی نہیں۔

”اوکے، ڈونٹ وری۔ انگل اگر پاکستان جائیں گے تو میں پوری کوشش کروں گی آئی کا خیال رکھ سکوں۔“ اس کی معذرت پر عروش نے بھی لہجے کے حیکمے پن کو زائل کر دیا تھا۔

”ہاں، بس بابا جانی مان جائیں تو.....“ عدی نے کافی کا خالی اس کی طرف بڑھایا تو اس نے منہ بسور کر اسے دیکھا اور تھام لیا۔

”تو ہماری دوستی ہوئی؟“ عدی نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ عروش نے ہٹ سے نہ کر دی۔

”مطلب؟“ وہ چیخا تھا۔

”مطلب یہ صرف عدی کہ ہماری دوستی ہے، نہ دشمنی۔ جتنا تعلق ہے اتنا کافی ہے۔“ عروش شریر لہجے میں بولی۔

”تعلق ہمیشہ ایک سانس میں رہتا، بگڑ جاتا ہے یا پھر سنور جاتا ہے۔“ عدی نے اسے نظروں کے حصار میں لے کر کہا۔

”ہاں شاید.....“ عروش نے اس کی بات کی تائید کی تھی۔

”تو.....؟“ وہ مزید کچھ نہ بولی تو عدی نے پوچھا۔

”جتنا تعلق ہے اتنا کافی ہے۔“ عروش کو اس کے لہجے میں جتنا اصرار چو نکار رہا تھا، اسی کتر اس نے بات کو مختصر کیا۔

”کافی تو میں بی چکا ہوں۔ اب بس ایک ہی خواہش ہے۔“ دروازہ کھولنے کے لیے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ رکھا تھا۔

”کہہ“ ”صرف عدی“ کے درمیان ایک لفظ کا اضافہ ہو جائے۔“ عدی نے مسکراہٹ دبا کر کہا اور اس کے دائیں جانب سے آگے بڑھ کر دروازے

لے پاس جا رکا۔ عروش نے بڑھا ہوا ہاتھ سینا تھا، وہ لدم پیچھے ہوئی اور متعجب و متغیر نظروں سے اسے دیکھا۔

”میرا.....“ اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھ کر بنا اس کا ری ایکشن جانے وہ باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ عروش حیرانی سے اس کی خواہش کو سوچنے لگی۔

”میرا..... کیا فضول بات ہے؟“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور پھر سر جھٹک کر چین کی جانب بڑھی کہ کافی کا پ رکھنا تھا۔

”صرف عدی میں ایک لفظ کا اضافہ.....“ ”میرا.....“ وہ مسلسل سوچ رہی تھی۔

”صرف میرا عدی.....“ وہ دہرا رہی تھی۔ غظلوں کو جب ترتیب دیا تو دوسرے پلے دل پر ہاتھ رکھا۔ یک دم دھڑکنوں میں ایک انتشار پیدا ہوا تھا، ایک بل چل چکی تھی۔

”بدترین..... بے شرم..... رکنا تو بتاتی اس کو۔“ دوسرے پلے اس نے خود کو ڈپٹا اور دانت پیس کر اس سے مخاطب ہوئی۔

”بتاتی کیسے عروش نیازی، تمہیں تو سمجھ ہی نہ آئی تھی۔“ اگلے لمحے اس نے اپنے ہی سر پر چپٹ اری اور پھر ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی میں ایک اصرار چھپا تھا، ایک خرابی، انا بھی اور ہاں بھی۔

☆☆☆

وہ ہر دم ہنسنے والی، چپکنے والی..... دوسری کو لگ کر نے والی دل آویز۔ ایک جو کن بن چکی تھی، بے گانہ پن، بے ربط باتیں، حالت زار سے بیہیت، بے سارے تجھے محبت کی دین تھے۔

”جھپٹتے، مسلسل انتظار کا کرب سہتا ایک نازک دما دم دل آویز کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ وہ ہر کر رہی تھی لیکن مانی.....“ ”کیا مانی اتنے سنگ ل ہیں؟ میری محبت اتنی بے مول ہے کیا کہ اس کو نی بے وردی۔“ بے رحمی سے نظر انداز کر دیا جائے؟ بڑبڑاتی رہا۔ مانی..... جسٹ ولس..... مجھے کچھ

کہنے تو دیں۔ مجھے ایک موقع تو دیں۔ محبت میرے اختیار میں نہیں ہے مانی پلیز..... مجھے ایک اختیار دے دیں۔“

”نجانے کتنی کا لڑ، کتنے میسجز..... مانی کو ویسے جاسکے تھے۔ اب تو ان کا لڑ اور میسجز کی گنتی بھی حدیں پھلانگ چکی تھی۔“

کرب، بے بسی، سنگ دلی، انتظار اگر یہ سب محبت کی میراث ہیں تو دل آویز مالا مال تھی۔ سات ہفتے تک مانی کی جانب سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔ وہ مقررہ وقت پر اس کا انتظار کرتے کرتے اب تھک چکی تھی۔

وہ جو ایک ہفتہ یا مشکل گزارتی تھی، کبھی ایسا بھی کیا کہ ہفتے میں دو لیسز لیے لیکن اب وہ جس اذیت میں دو چاروں گزار رہی تھی، وہ ہی جانتی تھی۔ اس نے پھر اس کے نام پر کلک کیا، ایک بار پھر کانگ کا بٹن دبا دیا۔

”مانی.....!“ اس طرف سے موبائل آن ہو گیا تھا لیکن مسلسل خاموشی تھی۔

”لیس اسٹیلنگ!“ سپاٹ لہجہ اسے کرچی کرچی کر گیا تھا۔

”میں دل آویز۔“ اس کی سوچیں بے ربط ہو چکی تھیں۔

”مجھے معلوم ہے، بولو۔“ مانی کا انداز نہایت دو ٹوک تھا۔

”مجھے کہنے دیں کہ مجھے آپ سے بے پناہ محبت ہے۔ میں جانتی ہوں آپ اس کو محبت نہیں سمجھتے۔ کسی کے کہنے سے محبت نہیں ہوتی، دل نہ ہو، مرضی نہ ہو کوئی کام تو ڈھنگ سے ہوتا نہیں۔ محبت تو بس ہو جاتی ہے، کسی سے بھی، کبھی بھی، کبھی بھی۔“ وہ بول رہی تھی، جانتی نہیں تھی کہ کیا کہہ رہی ہے۔ لفظ بے ربط تھے، آنسو خساروں پر بہہ رہے تھے اور مانی، اپنی ازلی خاموشی اور سفاکی کے عروج پر تھے۔ ”کچھ ٹیلیں ایسی ہوتی ہیں، جن کو اکھاڑ پھینکو پھر بھی وہ آگ آتی ہیں اور کچھ جگ ایسے بھی ہوتے

ہیں جن کو ہم بہت محبت سے بولتے ہیں۔ اچھی زمین کو دیکھ بھال کر ان بیجوں کو مٹی تلے دباتے ہیں لیکن وہ نہیں اگتے۔ محبت بھی ایک ایسا ہی بیج ہے، زبردستی نہیں اگتا، نہ ہی اکھاڑ کر پھینکنے سے وہ میٹ جاتی ہے۔ مانی کی خاموشی اسے ریزہ ریزہ کر رہی تھی۔

”اچھا پھر.....“ کھنکھناتے دو لفظوں میں جو چہن چہن وہ اس کے اندر تک اتر گئی۔

”مجھے ایک بار آپ کا سامنا کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں سب بتانا چاہتی ہوں۔“ اس کا جی چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر اپنی محبت کا ماتم کرے۔ ملنے کا کہنا اس کی مجبوری تھی، مانی نے گہرا سانس لیا۔ اب تو دل آویز بھی خاموش تھی۔

”اوکے۔“ اس کے ایک لفظ نے اسے زندگی کی نوید سنائی تھی۔

”کل میں فری ہوں، کل دو بجے ملاقات ہوگی۔“ مانی نے وقت طے کیا اور نوٹوں بند کر دیا۔

دل آویز آنسو کو صاف کرتے ہوئے مسکرائی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں پنہاں درد نے اس کی مسکان کا گلہ گھونٹا تھا۔

لیکن اس نے مانی سے ملنا تو تھا ہی، اپنی صفائی تو دینی ہی تھی۔ اس کی ناراضی، اس کی بے گامگی کو کسی طرح ختم کرنا تو تھا ہی۔ مقررہ وقت پر وہ اس کا انتظار کر رہی تھی..... لیکن.....!!!

☆☆☆

”بابا جانی! آج؟“ اس کی پر جوش چپکٹی آواز نے احسن ندیم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”ہاں بیٹا سچ میں۔ تم سے ملنے کا بہت دل کر رہا ہے۔“ احسن ندیم عفاف کو اپنے پاکستان جانے کی اطلاع دے رہے تھے۔

”اور می؟ کیا وہ نہیں آ رہی ہیں؟“ عفاف نے ان سے پوچھا۔

”نہیں بیٹا! عدی نے کوئی پردہ گرام ہٹا لیا ہے نیو یارک جانے کا اور عروش بھی گھر میں آگئی ہوگی۔ ہماری پاس رہتی ہے تو بیٹا ہماری ذمہ داری ہے۔ اس

لیے تمہاری می نہیں آ رہی ہیں۔ میں بھی مرنے دن کے لیے آ رہا ہوں۔“ سبھی کچھ لوگوں نے، تمہاری زندگی کا بھی فیصلہ اب ہو جانا چاہا۔ احسن ندیم نے عفاف کو اپنی پاکستان آمد کی بتائی۔

”جی بابا جانی جو آپ کو مناسب لگتا ہے اختیار آپ کے پاس ہی ہے۔“ عفاف نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ گہرا سانس لیا اور مکمل لڑائی برداری کا ثبوت دیا۔

”جھینک ہو بیٹا! تم سے اسی طرح کے رسالوں کی توقع تھی۔“ احسن ندیم واقعی خوش ہوئے تھے۔

”مجھے خوشی ہے بابا جانی کہ میں آپ کی توقعات پر پوری اتر رہی ہوں۔“

”بابی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔“ احسن نے کہا۔

”بابا جانی ایک بات کرنی تھی۔“ اس نے پہلے کہ احسن ندیم کال بند کرتے، عفاف نے کہا۔

”ہاں، شیور بولو۔“

”آپ کو عروش کیسی لگی ہے؟“ عفاف عدی کی خواہش کو ذہن میں رکھ کر پوچھا۔

”بہت پیاری بیٹی ہے، ہنس کھ اور ملنا۔“ احسن ندیم نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔

”ممی سے صلاح مشورہ کر کے عروش کو ہمارے لیے منتخب کر لیں اور اب پاکستان آ رہے ہیں۔“ داد اور مسٹر نیازی سے بات کر لیں۔ بابی نے معاملات ان لوگوں کے ساتھ مل کر طے کر لیے۔

عفاف اس موقع کو گونا گونا نہیں چاہتی تھی۔ جاتی عدی کو عروش پسند ہے۔ تو بہن ہونے کا جو کرتے ہوئے عفاف سارا راستہ ہموار کرنے کی

”ہاں بیٹا! ہم نے بھی عدی کی دلچسپی میں کی ہے۔ چلو میں آتا ہوں ناں تو پھر بات کر گے۔“ احسن ندیم نے بھی رضا مندی ظاہر کر لی۔

عفاف کے اندر اطمینان پھیل گیا۔

☆☆☆

محبت اور انتظار..... محبت میں انتظار..... انتظار..... انتظار..... اور محبت..... کیا محبت نے مجھے صرف انتظار ہی داں کیا ہے؟

دل آویز مقررہ وقت پر..... مقررہ جگہ پر مانی کا انتظار کر رہی تھی۔ گزرتا ہر لمبے سے بے جان گھر ہا تھا، دل آویز برسوں سے وہاں کھڑی انتظار کی سولی پر لٹک رہی تھی۔ کچھ لمبے، کچھ پل بہت بھاری ہوتے ہیں، ان کا بوجھ اٹھانا جان جانے کا سا لگتا ہے۔

آخر کار ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی، اپنے خیالوں میں اتنی غوطی کہ چونگی بھی نہیں۔ چند لمحوں بعد گاڑی کا دروازہ کھول کر مانی باہر نکلا تو دل آویز نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹنگی باندھے وہ اسے دیکھے جا رہی تھی، دل زور سے دھڑک کر اپنی نازل رفتار میں واپس آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک حیرانی تھی، نگاہیں ساکت تھیں۔

”دل آویز!“ مانی جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس کی پکار پر دل آویز دھیمے سے مسکرا کر اس کی طرف بڑھی۔ اس نے ارادہ کر رکھا تھا، وہ کوئی بے وقوفی نہیں کرے گی، اپنے آپ کو نارمل رکھے گی۔

”السلام علیکم!“ وہ دروازہ کھولے کھڑا تھا، دل آویز نے اسے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!“ مانی اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں بولا۔ سر تا پیر اسے دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ شرمندہ، ہاتھوں کی انگلیوں کو مروٹی، اس کے چہرے پر ایک اضطراب جھلک رہا تھا جسے مانی نے بآسانی دیکھ لیا تھا۔

”تم ڈرائیو کر دو۔“ مانی گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھا کر بولا۔ دل آویز نے اسے دیکھا۔

”ڈرائیو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس انکار کا کوئی جواز موجود نہ تھا۔ اس نے چابیاں تھام کر ڈرائیو کی سیٹ سنبھالی، انٹیشن میں چابی گھما کر گاڑی اشارت کی۔

دل آویز نے کن انگیوں سے مانی کو دیکھا۔ وہ

منظر تھی کہ مانی اسے بتائے گا کہ کہاں جاتا ہے۔ لیکن شاید بھول گئی تھی کہ سات مہینے پہلے والا وقت اب پلٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ حقیقت جو مانی کے سامنے آچکی تھی وہ اب کسی صورت پر وہ پوشی کے زمرے میں نہیں رہی تھی۔ مانی کا رابطہ نہ کرنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ غم میں ہے۔ حقیقت جان لینے کے بعد اس کو برا بھلا کہے گا لیکن اس وقت اس کی موجودگی میں اس کی خاموشی، مانی کے غم کو نہیں ایک لائق اور سفاکی کو ظاہر کر رہی تھی۔ دل آویز کے لیے یہ گھڑیاں انتہائی سکھن تھیں۔ سچ کو دبا کر گیسر پیچ کیا، اسٹیلیٹر پر پاؤں رکھا، انڈیٹور بھی آن کیا لیکن ساری جتن ہمت ناپید ہو چکی تھی۔

”آرام سے گاڑی کو آگے بڑھاؤ، لیکن پہلے اچھی طرح دیکھ لو۔ روڈ ورک کی وجہ سے احتیاط کی ضرورت ہے۔“ مانی کو یقیناً اس پر ترس آیا تھا۔

”گاڑی کو ایسی جگہ لے کر جاؤ جہاں خاموشی ہو۔“ مانی نے کہا۔

”اور کتنی خاموشی چاہیے۔“ دل آویز دل ہی دل میں بولی۔ اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کو اپنی من پسند جگہ لے آئی۔ جاڑے کے موسم میں، خزاں کے عروج پر دل آویز کی یہ پسندیدہ ترین جگہ تھی۔

فلورنس پارک کی حدیں، اس وقت فلورنس پارک میں اکا دکا لوگ موجود تھے۔ اس لیے خاموشی تھی، موسم بھی ایرا لود تھا۔ چند ایک گاڑیاں روڈ کے سائڈ میں پارک تھیں۔ دل آویز نے گاڑی پارک کی، مانی نے ذرا سا جھک کر ونڈ دے باہر کے مناظر ملاحظہ کیے۔ اب وہ اپنی سابقہ مخصوص خاموشی کے ہمراہ اپنی ہی سیٹ پر آرام سے بیٹھا رہ گیا تھا۔

”آئی..... آئی ایم سوری.....“ جب خاموشیاں حد سے سوا ہونے لگیں تو دل آویز کو وحشت ہونے لگی۔ یوں محسوس ہوا دل کا ایک گلوٹ ٹوٹ کر کسی گہری کھائی میں جا گرا ہوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دل آویز کو اس خاموشی کو توڑنا پڑا۔

”کس بات کی معذرت؟“ مانی انتہائی کراخت



لجھ میں اس سے استفسار کر رہا تھا۔ دل آدیز فقط اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

”مجھے..... شاید..... میں.....“ دل آدیز کے لفظ کھنکھاتے تھے۔

”جھوٹ..... جھوٹ..... دھوکا..... ادو دعوے محبت کے؟“ مانی کے لہجے سے آگ بر سر رہی تھی۔

”نن..... نہیں..... جھوٹ..... نہیں..... محبت ہے۔“ دل آدیز بوکھلائی تھی۔

”دل آدیز! ڈیڑھ سال تک تم.....“ مانی نے قہر آلود نظر اس پر ڈال کر نگاہ پھیری تھی۔ ”تم نے مجھے بے وقوف بنایا ہے دل آدیز! تم نے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آپ کو بھی بے وقوف بنایا ہے۔ یہ سب کر کے تم کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھیں دل آدیز؟“ مانی نے اس کا لائنسنس اس کے سامنے کیا۔

”نہیں..... نہیں..... بے وقوف نہیں بنایا۔“ اس کے سفاکانہ انداز پر وہ تڑپ اٹھی۔

”تم نے جھوٹ بول کر اپنا پیسہ اور میرا وقت ضائع کیا ہے دل آدیز! کیا ہے یہ سب؟ کیوں ہے؟“ مانی کے لب دلچے کی کرشمی اس کے اوسان خطا کر رہی تھی۔

”میں نے جھوٹ نہیں بولا۔“ وہ مدہم آواز میں بولی۔

”تو یہ کیا ہے؟ تمہارے پاس فل لائنسنس موجود ہے اور تم..... میری قابلیت کو چیلنج کیا تم نے۔ میری محنت کو مٹی میں ردل دیا۔“

”نن..... نہیں..... ما..... مانی..... آئی سوڑ ایسا نہیں ہے۔“

”کیا ہے یہ پھر؟“ مانی نے دل آدیز کا لائنسنس اس کے سامنے کیا تھا۔

”محبت.....“ وہ زیر لب بولی۔

”شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ..... محبت کا نام بھی لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ مانی نے انتہائی تڑش لب دلچے سے اس کی بات کاٹی تھی۔ دل آدیز نے سہم کر اسے دیکھا۔

”میرے پاس کوئی رستہ نہیں تھا۔“ دل آدیز نے آواز میں پھر بولنے لگی تھی۔

”میں ٹیسٹ پاس کر چکی تھی، آپ کو اکثر دھوکا دیتی تھی، آپ کے ساتھ دقت گزارنے کا بھی رستہ نظر آیا تا کہ میں آپ سے ڈرائیونگ شروع کر دوں۔“ دل آدیز نے آنسوؤں کو ہونے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ ”میں نے آپ کا دل نہیں اڑایا۔“

دل آدیز کے سامنے اس وقت جو مانی تھا وہ اس کے لیے قطعی ایک انجان انسان تھا۔ انتہائی کرخت، سپاٹ، حد سے زیادہ ردو۔ اتنے رد عمل کی وہ توقع نہ کر رہی تھی۔ اس کے اس برتاؤ سے اس کی ساری ہمت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اس انداز، اس کے الفاظ یہاں تک کہ اس کی محبت بے ربط ہو چکی تھی۔

”تم نے جھوٹ بول کر میرا وقت ضائع کیا ہے۔ میں نے اتنی محنت کسی پر نہ کی۔ اپنے سارے ہنر کو تم پر آزمایا اور تم..... یہ دھوکا ہے دل آدیز! محبت نہیں۔“ جب جب اس نے کہا ”یہ محبت نہیں“ دل آدیز کو اپنی سانس رکی محسوس ہوئی، وہ لرز کر جاتی۔

”آپ کا تو وقت ضائع نہیں ہوا ناں۔“ اس نے اس کے اعتراض کو جھٹلایا تھا۔

”آپ کی محنت بھی ضائع نہیں ہوئی ہے۔ میں نے آپ سے بہت زیادہ سیکھا ہے، یوں سمجھ لیں آپ سے میں نے صرف ڈرائیونگ نہیں، زندگی سیکھی ہے۔ آپ صرف ڈرائیونگ نہیں سکھاتے ہیں۔“ دل آدیز کے لہجے میں اصرار تھا، بے بسی تھی۔

پریقین دلانے کی کوششیں بھی تھیں۔

مانی نے اس کو دیکھا۔ اپنی سپاٹ، کرخت نظروں سے۔ دل آدیز کی دھڑکنیں اب رگ رگ چلنے لگی تھیں۔

”مانی..... میں.....“

”تم نے اپنا ڈرائیونگ لائنسنس مجھ سے

بھاپایا۔ میری ہر ٹیکنیک کو رد کیا تم نے، ٹانگ کیا تم نے۔“

”محبت کی میں نے بس.....“ مانی نے پھر وہ ہی اعتراض کیا تو دل آدیز چیخ اٹھی۔ اسی لمحے تیز ہوا کے جھونکے سے سڑک پر پھڑپھڑے پتوں میں بھی ہل چل ہوئی تھی۔ گہرے بادل بھی برسنے لگے تھے، پارک میں موجود چند لوگ بھی وہاں سے نکل رہے تھے۔

دو دشمنانگہ ہوں نے گہری نظر سے دل آدیز کو دیکھا تھا۔ بارش کی رفتار میں اضافہ ہوا تھا، دنڈ اسکرین کے دھندلا جانے کے باعث وہ نگاہیں دل آدیز کے تاثرات کو، اس کی آنکھوں سے بہتے درد کو دیکھ نہ سکی تھیں۔

”اونہہ..... ربش.....“ مانی نے متفرنگا ہوں سے اسے دیکھ کر رخ موڑا تھا۔ دل آدیز نے انتہائی دکھ سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ..... چند لمحوں کے لیے میرے جھوٹ کو فراموش کر سکتے ہیں کیا؟ میں چاہتی تو اب بھی اپنا لائنسنس آپ سے چھپائے رکھتی مانی! میں نے خود وہ آپ کے ہاتھ پر رکھا تھا۔“

”کیا یہ آسان ہے کہ میں اس دھوکے کو فراموش کر دوں؟“ مانی غریبا تھا۔

”یہ محبت بھی آسان نہیں ہے لیکن میں قائم ہوں اس پر۔“ دل آدیز نے لبوں کو کاٹ کر کہا تھا۔

دو ڈھائی سالہ محبت اور سات ہفتوں کا کرب ناک انتظار۔ لا حاصل ٹھہرا ہوا جارہا تھا۔ دل ابھولہاں ہوا جارہا تھا۔ نظروں میں اپیل رزم اور منظور محبت کی درخواستیں پھڑپھڑا رہی تھیں اور مانی، سفاکی اور پتھر دل کا ٹکڑی ٹوٹنے پر تیار تھا۔

”میرے جذبات نے، میرے دل میں آپ کی محبت نے یہ قدم اٹھوایا تھا مانی! میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ اگر بولا بھی ہے تو آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوا، میں نے ہر اک لائنسنس کی بے منت کی ہے۔“ دل آدیز نے اسے محبت کا یقین دلاتے ہوئے حساب

کتاب کی بات کی تھی۔ مانی نے یک لخت اس کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اپنے والدین کو بھی دھوکا دیا ہے۔“ مانی کی بات پر ول آدیز کی محبت لڑکھڑانے لگی تھی۔

”ہاں دیا ہے دھوکا..... سب کو دیا ہے۔ خود کو، اپنے پیرنس کو، آپ کو۔ لیکن محبت..... میری محبت شفاف ہے۔“ دل آدیز ہڈیالی انداز میں چلائی تھی۔

”تم ابھی چھوٹی ہو دل آدیز! یہ محبت نہیں ہے۔“ مانی سفاکی اور کرشمی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

اب قدرے نرم لہجے میں اس سے کہنے لگا۔ دل آدیز نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ مانی نے ایک دم اس کی طرف سے نظروں کو پھیرا تھا۔

”میں نے دھوکا نہیں دیا ہے۔ آپ کا ساتھ چاہیے مجھے، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے بہت شدت سے چاہا ہے، آپ یہ نہ دیکھیں کہ میں نے ڈرائیونگ لائنسنس کے ہونے کے باوجود آپ سے ڈیڑھ سال تک ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ میری محبت ہے، جس کے لیے میں نے اس حد کو توڑا ہے۔“ دل آدیز کا لہجہ اس کا ہر اک لفظ متوں سے بھر پور تھا۔ مانی نے متغیر نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”پندرہ سال کے فرق کو میں کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتا ہوں اور نہ ہی تم اس فرق کو مٹا سکتی ہو۔ یہ محبت نہیں محض ایک خیالی پلاؤ ہے جو کبھی بھی ”دم“ تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔“ مانی چند لمحے پہلے جس سفاکی سے باہر نکلا تھا، ایک بار پھر اسی حصار میں مقید ہو گیا تو دل آدیز نے تڑپ کر اسے دیکھا۔

”آپ ایک بار سوچیں تو سہی، میری محبت کو محسوس تو کر رہی ہیں.....“ وہ ہاتھ جوڑے باقاعدہ گڑبگڑانے لگی تھی۔

”بے وقوفیاں تمہاری عمر کا حصہ ہیں۔“ مانی نے غصیلے لہجے میں ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔

”محبت کے بدلے محبت کی بھجک نہ مانگو۔ یہ تمہاری سو کا لڈ محبت کی تو ہیں ہے۔“ مانی نجائے

کیوں اس قدر پتھر دل تھا۔ ایک دم ہی دل آدیز اس  
ہدائی کیفیت سے نکل آئی تھی، اب وہ خاموشیوں  
کے حصار میں دھنسی جا رہی تھی۔

”میرے نزدیک محبت کے صرف دو اصول  
ہیں، جس سے محبت ہے اس کے لیے ساری حدیں  
توڑ دو۔ مٹ جاؤ اس کی جاہت میں اور اگر وہ اس  
بے انتہا محبت کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تو..... مثلاً وہ  
محبت کو دل سے کھرچ کر نکال دو۔ محبت کے بدلے  
محبت کی کبھی بھیک نہ مانگو۔“ مانی نے اس کی طرف  
دیکھ کر ایک ایک لفظ کو تمام تمام کر بیان کیا تھا۔

”محبت کو کھرچ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے  
محبت کی ساری حدیں توڑ دیں۔“ دل آدیز یاسیت  
بھرے لہجے میں امید طلب نظروں سے اسے دیکھنے  
لگی تھی۔

”نواب مثلاً وہ تم وہ نہیں جو مجھے چاہیے۔“ مانی  
نے بار بار ماری جانے والی ٹھوکر ایک بار پھر ماری  
تھی۔ دل آدیز کی آنسوؤں میں ردائی آئی تھی، لیکن  
اسے ترس نہ آیا تھا۔

”متنوں کو رانگاں کر دیا، محبت کی گہرائی پر مٹی  
ڈال دی۔ آنسوؤں کو بے مول کر دیا اور اب  
برداشت نے دم توڑ دیا تھا۔“

دل آدیز نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل  
گئی۔ ہر طرف بھرے خزاں کے منظر جو بھی پہلے دل  
کش لگا کرتے تھے۔ دیرانی میں ڈھل گئے، تیز بارش  
میں بھاگتی ہوئی، درختوں کو چوں کو، بارش کے پانی کو  
روندی ہوئی وہ آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اپنے پیچ  
جانے کا احساس نہیں تھا اس کو، وہ بھاگ رہی تھی۔  
ہر طرف سے بے گانہ تھی، ہر طرف سے انجان۔ ان  
شناسا نگاہوں کے حصار میں تھی۔ مبین نیازی نے  
متغیر و متعجب نظروں سے اس کا تعاقب کیا تھا لیکن  
جان نہ سکا تھا کہ وہ اس طرح اتنی تیز بارش میں  
بھاگتی ہوئی کہاں گئی ہے۔ بے تحاشا سوال دل میں  
لیے مبین نیازی نے اس کو نظروں سے اوجھل ہوتے  
ہوتے دیکھا تھا۔ وہ آج تک ان سوالوں کے

جوابات کھوج رہا تھا لیکن تاحال ناکامی کا سامنا کر رہا  
☆ ☆ ☆  
عفاف نے جیسے ہی اسٹی ٹیوٹ کے آگے  
میں قدم رکھا مبین نیازی وہاں موجود تھا اس کی ٹوٹی  
طنز یہ آواز میں ادا کیے گئے جملے نے اس کے قدم  
روک لیے تھے۔

”الحمد للہ، آپ کو بھی احساس ہوا کے وقت پر  
کہیں جایا جاسکتا ہے۔“ عفاف نے بھی لہجے کو  
کرخٹ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ مبین  
نیازی نے حیران نگاہیں اس پر مرکوز کیں، لیکن وہ  
رہی بھر بھی متوجہ نہ تھی۔

”مبین کا ارادہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا بھی نہ  
تھا لیکن نہ جانے کیوں مبین اس کی طرف متوجہ  
ہو جاتا تھا۔ شعوری یا لا شعوری طور پر عفاف اسے  
متوجہ کر رہی دیتی تھی۔“

”مبین نیازی چاہنے کے باوجود عفاف سے  
زیادہ بات نہ کر پاتا تھا۔ عفاف اسے کسی تفصیل بات  
کا موع نہ دیتی تھی، جو بات بھی ہوتی تھی اسٹی  
ٹیوٹ کے حوالے سے ہی ہوتی تھی۔“

”تقریباً اگلے ڈیڑھ گھنٹے تک وہ دونوں ساتھ  
رہے، جو اسٹاف اپائنٹ کیا تھا ان کے ساتھ  
معاہدات طے پا چکے تھے۔ جو بھی فارمیٹز تھیں پوری  
ہو چکی تھیں۔“

”آپ۔۔۔ شاید آج مبین مینشن کو رد و قی بخشنے  
کا ارادہ رکھتی ہیں۔“ سارے کام ختم کر کے عفاف  
بنا کچھ کہے، بنا کسی ضرورت یا الوداعی کلمات کے  
آفس سے باہر جانے لگی تو مبین نے اسے روکا۔

”جی ہاں، کافی دن سے داد سے ملاقات نہیں  
ہوئی ہے۔“ عفاف نے سرسری انداز میں جواب  
دیا۔ اس نے پہلے ہی دادی کو فون کر کے کہہ دیا تھا۔

”چلیں میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔“ مبین  
نیازی نے اسے کہا۔

”بہت شکریہ، میں پہلے اپنے گھر جاؤں گی۔  
بابا جانی کو کال کرنی ہے، وہ کل پاکستان آ رہے

ہیں۔“ عفاف نے سہولت سے انکار کرتے ہوئے  
اسے احسن ندیم کی پاکستان آمد سے آگاہ کیا۔  
”خیریت؟“ اگلے پاکستان کیوں آ رہے  
ہیں؟“ مبین نے قدم اس کی جانب بڑھاتے  
ہوئے اس سے پوچھا۔ عفاف نے اسے دیکھا، ایک  
رخ نظر اور مبین حیران ہی تو ہوا تھا۔

”مجھ سے ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔“  
عفاف نے کہا اور اس سے پہلے کہ مبین نیازی مزید  
کوئی سوال پوچھتا وہ آفس سے باہر نکل گئی اور مبین  
نیازی گہرا سانس لے کر رہ گیا پھر وہ بھی چابیاں اٹھا  
کر باہر نکل گیا۔ مبین نیازی گھر پہنچا تو سفینہ کو اپنا  
منتظر پایا۔

”تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ سفینہ  
نے آج سے پہلے مبین سے اس انداز میں بات نہ  
کی تھی۔ یوں اچکا چانا، باتوں کو تول تول کر منہ سے  
نکالنا، یقیناً لمبیر معاملہ ہی ہے۔

”جی دادو! آپ کہیں، میں سن رہا ہوں۔“  
مبین اب مکمل طور پر ان کی طرف متوجہ تھا۔

”خیریت دادو؟ ایسی کیا بات ہے جو آپ  
شش و پنج میں مبتلا ہو رہی ہیں؟“ مبین کا انداز گفتگو  
لیے ہوئے تھا۔

”بیٹا! اب مبین مینشن کو ایک بھڑکی ضرورت  
ہے، جو تمہاری بھی دیکھ بھال کر سکے اور باقی سب  
بھی سنبھال سکے۔“ سفینہ نے بالا خروہ بات کہہ ہی  
دی جس کے لیے کتنی دیر سے مشکل کا شکار ہو رہی  
تھیں۔

”یہ بیٹھے بیٹھے بھڑکی ضرورت کیسے  
پڑے گی؟“ مبین اب قطعی لائق کا مظاہرہ کرنے لگا  
تھا۔

”بیٹھے بیٹھے نہیں پڑی، کافی عرصے سے  
تھیں تو اپنے اور کاموں سے ہی فرصت نہیں  
ملتی کہ کبھی اپنی زندگی کے بارے میں بھی کچھ سوچو۔“  
سفینہ نے اسے گھر کا تھا لیکن مبین نیازی رہی بھر بھی  
متوجہ نہ رہا تھا۔

”نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ میں محبت کو یوں اتنی  
جلدی ہار نہیں سکتا۔“ مبین نے دل میں سوچا لیکن  
دادی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

”دیکھو بیٹا! اب تو لوگ بھی باتیں بنانے لگے  
ہیں۔“ سفینہ کی سنجیدہ اور ایسوشل بلیک میلنگ قسم کی  
آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو مبین نیازی کو اپنی  
اندرونی تکرار کو پس پشت ڈال کر ان کی طرف دیکھنا  
پڑا۔

”دادو لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانے کا  
ہے۔“ وہ قدرے بے زار لہجے میں ان کو دیکھ کر  
بولا۔

”کچھ بھی ہو بیٹا! لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ  
تم کوئی فیصلہ کرو۔ میں نے اور عروش نے عفاف کو  
تمہارے لیے پسند کیا ہے۔“ مبین نیازی نے کچھ  
کہنے کے لیے لب داکیے ہی تھے کہ سفینہ کی اگلی بات  
نے اسے حیران کر دیا تھا۔ ”کل اس کا باپ آ رہا ہے  
تو میں ان سے بات کر دوں گی۔ تمہارے پاس چند  
دن ہیں، سوچ لو لیکن یاد رکھنا ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔“  
سفینہ نے عروش کی ہدایت کے عین مطابق دو  
ٹوک بات کی تھی جبکہ مبین نیازی عفاف کا نام سن کر  
ہولنوں کی طرح اس لمحے ان کو دیکھنے لگا تھا۔

”اتنے دن سے تم اس کے ساتھ کام کر رہے  
ہو، یقیناً اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیسی لڑکی ہے۔ بہت  
عرصے سے عروش بھی اس کو جانتی ہے۔ میری بھی  
جب جب ملاقات ہوئی ہے اس نے متاثر کیا ہے۔“  
سفینہ نے ایک بار پھر عفاف کی تعریفوں کے پل  
باندھنے شروع کیے تھے۔

”دادو! یہ ممکن نہیں ہے۔ عفاف ہی نہیں مانے  
گی اور میں.....“

”تمہیں عفاف کی فکر کی ضرورت نہیں ہے اس  
کو راضی کرنا اس کے والدین کا کام ہے۔ تمہیں میں  
نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے، اس گھر میں عفاف ہی آئے  
گی اور اس کے باپ کے آتے ہی میں ان سے  
رشتے کی بات کرنے والی ہوں۔“ عروش کی ہدایت

کے مطابق سفینہ نے رعب وار آواز میں مبین کو اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔

”دادو! آپ نا انصافی کر رہی ہیں۔“ مبین کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

”تم اسے جو بھی سمجھو، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ سفینہ کے توانداز ہی بدلے ہوئے تھے۔

”دادو! پہلے آپ عفاف سے بات کر لیں۔“ مبین نیازی کی کچھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

”مجھیں کہا تو ہے کہ عفاف کی فکر نہ کرو۔“ وہ ماتھے پر ہل ڈال کر بولیں۔

”لیکن اگر اس سے زبردستی ہاں کر دائی گئی تو زندگی تو میری برباد ہو جی ناں۔“ ان کو وہاں سے اٹھتا۔

دیکھ کر مبین نے احتجاج کیا۔

”اچھا، ابھی آئے گی ناں تو اس سے پوچھ لوں گی۔“ سفینہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کہا اور اس کو وہی ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئیں اور مبین نیازی کے چاروں طرف جیسے سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

”یک دم ہی بے انتہا بے چینیوں نے اس کے دل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔“

”کیا ایک اور کوشش کرنا، اسے محبت کا یقین دلانا ممکن ہو سکتا ہے؟ مبین نیازی ایک بار پھر منت کرنے میں کوئی حرج ہے کیا؟“

”بھی بھئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بار بار پلٹ کر دیکھنے سے بھی چیزیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، شاید اس محبت کی عمر اتنی ہی تھی اور انجام ایک ”شادی“ ہے؟“

”تو ہتھیار ڈال رہے ہو مبین نیازی؟“

اب کوئی بھی جواب نہ تھا، مبین نیازی کے پاس، فقط خاموشی۔ ایک گہری چپ اور محبت.....

جانے کتنا وقت گزرا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس کی چپکتی آواز نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو توڑا تھا۔ مبین نیازی کی نگاہیں اب اس پر جمی تھیں۔

”آر یو اد کے مسٹر نیازی؟“ عفاف کو تشویش

لاحق ہوئی لیکن اس نے پلکیں نہ جھپکیں، نہ جواب دیا۔

”مسٹر نیازی!“ تنکنگی باندھے اس پر نگاہوں کی بے باکی اب اس کو تا گوار گزرنے لگی تھی۔ وہ قدرے اوچی آواز میں اس کو پکارنے لگی۔ یہی آواز اس کو حواس میں لانے میں کامیاب ہوئی۔

مبین نے چونک کر پلکیں جھپکیں، ایک گہری، سرد آہ بھری اور بنا کچھ کہے وہاں سے چلا گیا اور عفاف کے لیے اس کا یہ برتاؤ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

”کیا ہوا بیٹا! کہاں جا رہی ہو؟“ عفاف کے بڑھتے قدموں کو سفینہ کی آواز نے روکا تھا۔ اس نے انہیں دیکھا اور اگلے لمحے اپنا ارادہ بدل کر ان کی جانب بڑھی۔

”السلام علیکم دادو! کسی ہیں آپ؟“ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے عفاف نے قدرے بٹاش لہجے میں ان سے پوچھا تو سفینہ نے مسکرا کر اسے گلے لگا لیا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟ کافی انتظار کروایا تم نے تو.....“ سفینہ کے ہمراہ وہ صوفہ پر براجان ہو چکی تھی۔

”دادو! کل بابا جان پہنچ رہے ہیں ناں تو می سے بات ہو رہی تھی۔ عدی نے آج شام نیویارک جانا ہے تو بس اس لیے دیر ہو گئی۔“ عفاف نے سفینہ کو ساری تفصیل بتائی۔ انداز مدہم اور قدرے کھویا سا تھا۔

”تو بیٹا! تمہاری مہمی بھی آ جاتی ساتھ۔“ سفینہ نے اس سے کہا۔

”جی دادو! وہ بھی آئیں گی لیکن کچھ عرصے بعد۔“ عفاف نے ابھی مدہم آواز میں کہا تھا۔ وہ ابھی تک مبین نیازی اس غیر متوقع رویہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ اس کو کیا رد عمل ظاہر کرنا چاہیے۔

جب سے عروش یو گئی ہے، عفاف کی مبین

بازی کے ساتھ ملاقاتوں میں اضافہ ہوا ہے تب سے آج تک کی ساری ملاقاتیں اس کی ذہن کی اکریں پر چل رہی ہیں۔

ایک انجمن تھی، کچھ راز تھے۔ خاموشی باتیں کرتی تھی لیکن آواز سماعت سے گرانے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی تھی اور وہ مزید الجھ کر رہ جاتی تھی۔

وہ جو نہیں ہم دیکھتے تھے وہ جو نہیں ہم چاہتے تھے وہ جو تم سے ہوتے تھے روبرو وہ جو نہیں مانگتے تھے ہر سو وہ اب کہیں نہیں

وہ اب ہی لمحے خاک ہوئے مبین نیازی وہاں سے نکلا تو پلٹ کر بھی نہ دیکھا، اب اپنی مخصوص جگہ (اسٹری روم) میں روکنگ چیئر پر بیٹھا اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ نگاہوں کی بے باکی پر نادم ہو رہا تھا۔ سفینہ کے حکم بھرے انداز میں فیصلہ سنانے کا اثر تھا جس نے اس کو عفاف کے سامنے بے اختیاری پر مجبور کیا تھا۔

مبین نیازی ایک انجمن اور شدید بے چینی کا شکار رہا تھا۔

عفاف رویہ ایسا تھا کہ اس کو ایک بار پھر ٹھکرائے جانے کا زخم برداشت کرنا تھا۔

لمحے بیتے جا رہے تھے، اس کو خبر نہ تھی۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عفاف ابھی تک مبین مینشن میں ہے یا چلی گئی ہے۔

گھڑی کی ٹک ٹک میں اضافہ ہو رہا تھا، پل گزرتے جا رہے تھے اور مبین نیازی پل پل سلگ رہا تھا۔

”محبت..... المیہ یہ بھی ہے کہ ہم صرف اپنی محبت کی گہرائی ناپ سکتے ہیں۔ کسی دوسرے کی تڑپ، محبت، بے قراری، درد کل ہمیں اندازہ نہیں ہوتا۔ ہمیں صرف اپنی محبت خالص لگتی ہے۔

صرف اپنی محبت سمجھ میں آتی ہے۔ صرف اپنی محبت خاص لگتی ہے۔

صرف اپنے جذبات پر خلوص لگتے ہیں۔ صرف اپنی دھڑکنوں کو سیراب کرنے کی فکر ہوتی ہے۔

دل آویز کو اپنی محبت خالص لگتی تھی، خاص لگتی تھی۔ صرف اپنی تڑپ کا احساس تھا اسے، صرف اپنے انتظار کا درد تھا اسے۔

مبین نیازی کو بھی اپنی محبت خاص لگتی تھی۔ خالص لگتی ہے، صرف اپنے رت جگہوں کا حساب ازیر تھا۔ صرف اپنی محبت کی گہرائی کا اندازہ تھا۔

دونوں کے حصے میں لگتی تھی۔ محبت کس کے حصے میں ملن سکتی ہے؟ کس کے حصے میں فقط انتظار..... یہ فیصلہ ابھی ہوا نہ تھا۔

وقت رک رک کر چل رہا تھا لیکن بے کلیوں اور بے چینیوں میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کبھی یہ آرزو کہ وہ جو مانگے وہ مل جائے اسے کبھی یہ دوسرے

کر.....

اس نے میرے سوا کچھ مانگا تو نہیں اس نے مدہم آواز میں یہ نظم پڑھی۔ اس لمحے اس نے پھیلے ہاتھوں کو چہرے پر پھیر کر انتہائی حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کیا مانگا؟“ اس کو متوجہ پا کر عدی نے مدہم مسکراہٹ کے ساتھ دھمے لہجے میں پوچھا۔

”سب کی خیر۔“ عروش جانے نماز کو تہ کرتے ہوئے جواب دینے لگی تھی۔

”اور میرے لیے؟“ الفاظ عام تھے لیکن لہجہ خاص۔ فقط تین لفظوں میں ہزاروں سوال پوشیدہ تھے۔ محبت جہاں تک رہی تھی۔ عروش نے شپٹا کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ کے لیے بھی۔“ مختصر جواب کے بعد اس نے رخ موڑا تھا۔

”بس؟“ ایک لفظ میں بہت سے افروز پنہاں تھے، آنکھوں کے سوال کو بخوبی پڑھ لیا تھا۔

میرا لہجہ، میری باتیں بہت ہی عام ہیں لیکن میں جذبہ پاک رکھتا ہوں، محبت خاص رکھتا ہوں عدی نے مسکراہٹ دبا کر آنکھوں میں توس قزح کے رنگوں کو سمو کر اسے دیکھ کر شعر پڑھا۔ تو کمرے کے اس کونے میں اس کی ہنسی کی جھنکار گونجنے لگی۔ عدی نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا تو عروش نے دائیں ہاتھ سے منہ دبا کر اپنی ہنسی کو روکنا چاہا۔

”اوں..... ہوں..... مت روکو۔ اسی چپکتی آواز نے تو میرے ایمان کو ڈگمگایا تھا۔“ عدی کا لہجہ ایک استحقاق سے بھر پور تھا۔

”استغفار..... کیسے کفر بول رہے ہیں۔“ عروش نے اسے تنبیہ کیا۔

”مجھے لفظوں کے ہیر پھیر سے الجھن ہوتی ہے۔ صاف گو انسان ہوں اس لیے دو ٹوک بات کروں گا۔“ عدی نے دونوں ہاتھوں کو جینز کی پائنتس میں ڈالا۔ اپنی محبت کے رنگوں سے مزین لگا ہوں کو اس پر مرکوز کیا اور بولنا شروع کیا۔ عروش نے پہلو بدلا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے کہیں نہ جاؤ۔ اس کے لیے میں تم سے اجازت نہیں لے رہا، یہ میرا فیصلہ ہے۔“ عدی نے دھونس جمائی۔ عروش نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کے فیصلے کی پابند نہیں ہوں۔“ عروش نے رعب جمانا چاہا۔

”کون سا فیصلہ؟“ عدی نے دونوں بازو کو سینے پر باندھا لیکن اس پر سے نظروں کو ہٹائے بغیر کہا۔

”بس؟“ ایک لفظ میں بہت سے افروز پنہاں تھے، آنکھوں کے سوال کو بخوبی پڑھ لیا تھا۔

”ہم..... اوکے۔ تمہاری منظوری میرے لیے ضروری ہے۔ جب دل کا معاملہ میرے حق میں فیصلہ دے تو ویر نہ کرنا۔“ عدی نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ عروش نے متعجب نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ہمارا مان؟“ وہ پلٹا تو عروش نے سوال کیا۔

”ہاں۔“ عدی نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

ایک گہری نظر اس پر جمائی اور کبھی لہجے میں کہا تو عروش کی نظریں جھک گئیں۔

”جب دل میرے لیے گواہی دے تو آ جانا۔“

عدی نے نہایت پرشوق نظروں سے اس کی جھکی پلکوں کو دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ایمان پھر ڈگمگایا لیکن ضبط کے بندھن مضبوط تھے۔

”پاگل.....“ وہ زیر لب بولا۔ عروش نے ایک نکت نظر میں اٹھائیں اور دھیرے سے مسکرا دی۔

”گواہی مل گئی اب انتظار باقی ہے۔“ عدی نے قدرے شوق لہجے میں کہا۔ ایک قدم اس کی طرف بڑھایا لیکن عروش وہ قدم پیچھے ہٹ کر اسے گہری مسکراہٹ کے ساتھ وہاں اسے نکل گیا تو عروش نے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام اور گہرا سانس خارج کیا۔

”صرف میرا عدی۔“ دل نے سرگوشی کی اور اس کے چہرے پر بے شمار رنگ انڈیل دیے۔

☆☆☆

”احسن ندیم نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے۔“ مبین نیازی سفینہ کی اطلاع پر چونکا تھا، ایک دم ان کی طرف دیکھا۔

لوٹی ذکر نہیں کیا۔“ سفینہ صوفے پر بیٹھے ہوئے گویا ادیس تو مبین نیازی نے پہلو بدلا۔

احسن ندیم پاکستان آ چکے تھے۔ دونوں فیملیر کی ملاقات بھی نہایت خوش گووار رہی تھی اور مبین نیازی نے بھی حتی الامکان کوشش کی تھی کہ احسن ندیم کو کوئی شکایت نہ ہو، مہمان نوازی نبھاتے ہوئے انہوں نے احسن ندیم کو مبین مینشن میں رہنے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ جس کو انہوں نے نہایت سہولت سے منع کر دیا تھا۔

”بھئی ہم تو اپنی بیٹی کے پاس ہی رہیں گے۔ اتنے سالوں بعد یہ موقع ملا ہے۔“ احسن ندیم محبت پاش نظروں سے عفاف کو دیکھ کر بولے تھے۔

”تو عفاف آپ بھی آ جائیں۔“ مبین نیازی بلا ارادہ بولا تھا۔ جہاں اس کے الفاظ پر عفاف نے ہٹپٹا کر اسے دیکھا تھا وہاں سفینہ بھی چونکی تھیں۔

”نہیں، بابا جانی کو کچھ میٹنگز بھی کرنی ہے اور ایسے ہی آپ لوگ بھی ڈسٹرب ہوں گے۔“ عفاف نے بھی وجہ سے لہجے میں منع کر دیا۔

”آپ دونوں کون سا چھوٹے بچے ہو جو ڈنگے، تنگ کرو گے اور ہم ڈسٹرب ہو جائیں گے۔ بہر حال جو آپ لوگوں کو مناسب لگے۔“ مبین نیازی نے ہسکرا کر کہا اور مبین مینشن میں ان کی آمد کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا لیکن مبین مینشن کا رہن کہن، سفینہ کی بردباری اور مبین نیازی کا اعلا اخلاق احسن ندیم کو گرویدہ بنا کر گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! جتنے دن یہاں ہوں، ان شاء اللہ ملاقات ہوتی رہا کرے گی۔“ رخصت لیتے وقت احسن ندیم نے خوش مزاجی سے کہا تھا۔

اور پھر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور موقع دیکھتے ہی سفینہ نے احسن ندیم سے عفاف کو مانگ لیا اور اب مبین نیازی سے اسی بات کہہ رہی تھیں۔

”اگر آپ پہلے عفاف سے پوچھ لیں تو زیادہ مناسب رہتا۔“ مبین نیازی نے اپنے لڑکھڑاتے لہجے پر قابو پاتے ہوئے سفینہ سے کہا تھا۔

”احسن ندیم نے عروش کا رشتہ مانگا ہے، اپنے بیٹے کے لیے۔“ مبین نیازی اس نئی اطلاع پر بے تحاشا حیران ہوا تھا۔

”عدی کے لیے؟“ انہوں نے کنفرم کیا تو سفینہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ادلے بدلے کی شادی۔“ مبین نیازی زیر لب بولا اور سفینہ کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر ایک پریشانی جھلک رہی تھی۔

”ہمارے ہاں آج تک وٹیرسٹ نہیں ہوا۔ اگر احسن ندیم پہلے بات کرتے تو میں بھی بھی عفاف کو تمہارے لیے نہ مانتی۔“ سفینہ نے کہا تو مبین نیازی نے انہیں دیکھا، فقط ایک نظر۔ دل ایک انداز سے دھڑکا تھا۔ ایک خاص ادارے چلا تھا لیکن وہ اس لمحے ان دھڑکنوں کی اضطرابی کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔

اب ایک انتظار..... ایک اور کرب ناک انتظار..... اس کی اضطرابیت میں اضافہ کر کے، سینہ تانے ان کے سامنے براجمان تھا اور اسے ان اذیت ناک لمحوں کو کاٹنا تھا۔ لیکن کیسے؟ جب لمحوں کی طوالت صدیوں بر محیط ہو جائے تو ان کو کیسے گزرا جاتا ہے مبین نیازی کو علم نہ تھا۔

☆☆☆

”بابا جانی!“ عفاف ہاتھ مروڑتی ان کے ساتھ براجمان تھی۔

”بیٹا! یہی مناسب وقت ہے۔“ احسن ندیم نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی اضطرابی کیفیت بار بار پہلو بدلنا اس کی دلی کیفیت کی بھرپور عکاسی کرتا، احسن ندیم کی نگاہوں سے کسی طور چھپا نہ رہ سکا تھا۔

”جی بابا جانی! میں سمجھتی ہوں۔“ وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی تھی۔

”میں نے عدی کے لیے عروش کی بات کی ہے۔ ماں جی نے سوچنے کا وقت مانگا ہے لیکن انہوں نے بھی مبین کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔“



احسن ندیم کی اطلاع پر عفاف پر جیسے کوئی بم آگرا ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔  
”اور سچ کہوں تو مبین نیازی مجھے پسند آیا ہے۔“  
مبین نیازی کے نام نے ان کی اطلاع کی صداقت پر مہر ثبت کی تھی۔

سنجیدہ مزاجی اور ہنس کھ پر سنائی کا مالک ہے۔ اپنے کام کے معاملے میں بہت ایمان دار بھی ہے۔ فیملی بھی ہے اور بزنس بھی۔ ہر لحاظ سے وہ مجھے مناسب لگ رہا ہے، باقی بیجا جب ہم کسی کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہتے ہیں، اپنی زندگی اس کے ساتھ شیئر کرنے لگتے ہیں تو بہت سارے معاملات میں اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ ”احسن ندیم نے ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ انداز سمجھانے کا نہیں بتانے کا تھا۔

سمجھا یا تو اسے جاتا ہے جو نا سمجھ ہو۔ جو ہر معاملے کو سمجھتا ہو، جس کو اچھائی برائی کی تمیز ہو، انہیں تو صرف بتایا جاتا ہے۔ فیصلہ خود ہی کرتے ہیں۔  
”آپ کا فیصلہ مجھے منظور ہوگا بابا جانی! اچا ہے وہ فیصلہ مبین نیازی کے حق میں ہو یا کسی بھی اور کے۔“ عفاف نے احسن ندیم کی طرف دیکھا تھا تو اس نے مسکرا کر سر جھکا دیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ میرا فیصلہ مبین نیازی کے حق میں ہی ہوگا لیکن بہر حال اس کے لیے چند مزید ملاقاتیں درکار تو ہیں ہی اور تھوڑی سی چھان بین بھی۔“ احسن ندیم نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا، مطلب کے اس کی زندگی کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔  
”مبین نیازی۔“ عفاف غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے زیر لب بولی۔ گہری سانس لی اور اپنے آپ کو ایک کڑے امتحان کے لیے تیار کرنے لگی۔

☆☆☆

توقعات کا بھرم رکھنا پڑتا ہے، فیصلوں کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ دعا کے لیے اٹھائے گئے ہاتھوں پر یقین بھی رکھنا پڑتا ہے۔  
اور جب بھرم کا سر پھل دیا جائے۔ فیصلے، محبت

کے خلاف ہونے لگیں، دعا، عرش سے کھرا کر لپٹا لگے۔

اپنی خواہشوں کا گلہ بھی گھونٹا پڑے۔  
زندگی آسان نہیں ہوتی ہے اور مہذب؟  
”آسانیاں“ تو محبت کی ڈکٹری کے کسی صفحے پر بھی درج نہیں ہیں۔

”تم اس محبت کو یہیں دفن کر دو اور چلی جاؤ یہاں سے۔“

”اس کے لیے میرے وجود کو بھی مٹا ہوگا، مجھے بھی دفن ہونا پڑے گا۔“

ایک خاموشی سی تھی جو اس کے اندر اترتی چلی جا رہی تھی۔ دل کو گھڑوں میں گھرتا ہوا وہ محسوس کر رہی تھی۔

تین منٹے گزر چکے تھے اور ابھی تک دل آویز کے کانوں میں مانی کا سفاکانہ لہجہ، نشتر چھوٹے الفاظ کی کوچ کم نہ ہوئی تھی۔ دل کے پختے کی آوازیں تو اتر سے آ رہی تھیں۔

”میری محبت کیا اتنی معمولی ہے؟“  
”کیا میری محبت میں اتنی بھی پیش نہیں کر مانی کے دل کو گرما سکتی؟ پکھلا سکتی؟ میرے وجود کو مٹا ہوگا۔ دفن ہونا ہوگا۔“ وہ ہاری بھی۔ ٹوٹ چکی تھی، بھر رہی تھی لیکن سینے والا کہیں نہ تھا، کوئی نہ تھا۔ جو تھا اس کے وجود سے دل آویز بے خبر تھی۔

آنکھیں خشک ہونے کا نام نہ لے رہی تھیں مسلسل بہتا گرم سیال اب اس کی آنکھوں کو جلا چلا تھا لیکن وہ تو جیسے اپنی دمن بن چکی تھی۔

”دفن کر دو محبت کو اور چلی جاؤ یہاں سے۔“  
”میرے وجود کو بھی مٹا ہوگا، مجھے بھی دفن ہونا پڑے گا۔“

مسلل ہوتی باز محبت اس کو بہکا رہی تھی، اس کو محبت کے ساتھ ساتھ خود کو بھی دفن کرنے پر اکسار رہی تھی۔

اور پھر اس کا وجود بے جان ہونے لگا۔ آنکھوں نے کھلے رہنے سے انکار کر دیا۔ وہ پانی جو

پچھلے تین ہفتوں سے کسی طرح خشک نہ ہو رہا تھا، اس نے بھی اب بہنے سے انکار کر دیا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کا بے جا وجود، خاموشی اور دیرانی..... کمرے کا دروازہ کھلا، روشنی نے منظر کو صاف کیا۔ آنے والے نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، اگلے پہل نظر اس دہرے ہوتے ہوئے وجود پر ایک کر رہ گئی۔ وہ دہوانہ دار اس کی طرف لپکتے لگے۔ اگلے لمبے وہ ایسولینس کو کال ملا رہے تھے۔

تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے جس مشکل سے نمبر ملایا جا رہا ہے اس کا اندازہ ان کے سینے سے شرابور چہرے، اڑتی رنگت سے بخوبی ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت بڑا نقصان ہو چکا ہے، جیسے وہ اس کو کھو چکے ہیں۔

”دل آویز..... دل آویز..... آنکھیں کھولو..... دل آویز..... کیا ہو گیا تمہیں؟ تمہاری نبض کیوں نہیں چل رہی؟“ ان کا ہاتھ کی پوروں نے اس کی کلائی کو تھما تھا۔ ”تم سانس کیوں نہیں لے رہی ہو.....؟“ وہ اس کو جھنجھوڑ کر حواس باختہ ہو رہے تھے، چلا رہے تھے۔

پکارا مسلسل تھی۔ ”دل آویز..... دل آویز.....“  
”لیکن جواب عذارو۔“  
☆☆☆

”ماشاء اللہ بیٹا! بہت شکریہ۔ اب مبین مینشن کی رونقوں میں بھی اضافہ ہوگا۔“

”ہاں ان شاء اللہ..... لیکن آپ اب ہماری درخواست بھی منظور کر لیں تاکہ ہمارے گھر سے جانے والی رونق کا کچھ ازالہ ہو سکے۔“ احسن ندیم نے سفینہ کو عفاف کی رضا مندی کی خبر سنائی تھی اور اس لیے ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

”ہاں، اگر عدی بیٹا اور نحن سے ملاقات ہو جاتی تو ہمارے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔“ سفینہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ تو عدی کے نیو یارک سے واپس آتے ہی آ جائیں گے۔ عرش کو بھی چٹخیاں ہوں گی

تو سب آ جائیں گے۔“ احسن ندیم نے کہا تو سفینہ نے طمانت بھر اسانس خارج کیا اور رضا مندی ظاہر کر کے فون بند کر دیا اور دوسرے پہل مٹھائی کا آرڈر دینے لگیں۔

مبین نیازی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سامنے ٹیبل پر مٹھائیوں کے ٹوکڑے رکھے ان کی حیرتوں میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھے۔

”خیریت دادو؟ یہ اتنی مٹھائی کہاں سے آئی؟“ مبین نے سفینہ کی مصروفیت کو دیکھا۔

”تم کہاں تھے؟ کتنی کالز کی ہیں لیکن اٹھا ہی نہیں رہے تھے۔“ سفینہ نے اس سے پوچھا۔

”ہاں دادو! ڈرائیونگ کر رہا تھا، اس لیے نہیں اٹھا سکا تھا۔ لیکن خیریت؟“ مبین اپنے مخصوص صوفہ پر بیٹھتے ہوئے ان سے ایک بار پھر ان مٹھائیوں کی بابت پوچھنے لگا۔

”آج احسن ندیم کا فون آیا تھا۔ اس نے تمہیں عفاف کے لیے منظور کر لیا ہے۔“ سفینہ نے اچھائی پر مسرت لہجہ میں بتایا لیکن مبین نیازی کی یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی محبت اس کے سر پر آگری ہو۔ جیسے کسی نے اس کے بالکل باس بم پھوڑا ہو۔

اپنی سماعتوں پر شہہ ہوا تھا لیکن یہ مٹھائیاں، سفینہ کی خوشی اس بات کی گواہ تھی کہ جو انہوں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔

مبین نیازی اتنا شاکد تھا کہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکا، اس کے چہرے کے تغیر و تبدل پر سفینہ نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)





”تو نے راشن میں سے پیسے مارے ہیں حرام خور؟“ وہ پلٹ کر فریادی۔  
 ”نہیں چاچی۔“ وہ سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔  
 ”دس روپے کم کیوں ہیں پھر؟“  
 ”فضل چاچا نے اس مہینے چاول اور گھی کے پیسے بڑھا دیے ہیں۔“ وہ اپنی جگہ چورسا بن گیا۔  
 ”میں پوچھوں گی فضل سے جا کر، اگر یہ جھوٹ ہوا تو تیرا حشر بڑا کر دوں گی۔“ وہ اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے چلی گئی۔ وہ جھاڑواٹھا کر صحن کی صفائی کرنے لگا۔ ہوا کے ساتھ بہت گرد آئے لگی تھی۔  
 بڑی یاری تھی کریم کی اس کے باپ سے۔ اپنے ماں باپ کی موت کے وقت وہ گیارہ سال کا تھا۔  
 ”ہمارے چھ آٹھ بچوں کی دو وقت کی روٹی پوری نہیں ہوتی، اس کا پیٹ کہاں سے بھریں گے۔“ خاندان والوں نے اس کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لیا۔  
 کریم اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آیا گویا دوستی کا فرض ادا کیا ہو اور فرض کو قرض سے بدل دیا۔ وہ قرض جو بعد میں اسماعیل کو چکا تھا۔ انہم اکلونی بنی تھی اس کی، اس کے پیاسے کے بعد اسماعیل نے اس کے بڑھاپے کا سہارا بن جانا تھا۔

”آج سے یہ ہی تیری ماں ہے۔“ کریم نے صدیقہ سے اسے ملوایا۔  
 ”ایسے جوان لوگڑے کی ماں نہیں بن سکتی میں۔“ پھر وہ اس کی صدیقہ چاچی بن گئی۔  
 کریم نے اس کے لیے صحن میں چار پانی ڈال دی۔ دو کمرے کے گھر میں اس کے لیے اتنی ہی جگہ تھی۔ وہ اس طرح سے کہ صحن پر پہلے ٹین کی چادر ڈالی تھی مگر برسوں پہلے تیز آندھی اڑا کر لے گئی۔ دو وقت کی روٹی پیٹ بھر کر مل جانے کو عید کے دن کی طرح سمجھنے والے، ٹین کی چادر ڈالنے کے پیسے کہاں سے لاتے۔ پھر وہ کمر اٹھلا تن بن گیا۔ خون جمادے والی سردی ہو یا پسینے میں نہلا دینے والی گرمی۔ اسماعیل کا ٹھکانا دہی صحن کا کوہنہ تھا۔

وقت گزرنے لگا۔ کریم کی انہم پہلی جماعت سے چوتھی جماعت میں آگئی اور اسماعیل چوتھی جماعت سے آگے نہیں پڑھ سکا، اس کا دل نہیں لگتا تھا پڑھائی میں مگر پھر بھی اس کی بہت اہمیت تھی۔ کریم اسے اپنے ساتھ کام پر لے جاتا تھا اور صدیقہ اسے گھر پر روکنا چاہتی تھی۔ وہ کبھی کریم کے ساتھ سبزی کا ٹھیلہ لے کر گلی کی پھرتا، کبھی گھر میں چاچی کے حکم کے مطابق سارے کام کرتا۔ ہاتھ باندھے سر جھکائے سارے گھر میں پھرتا وہ کسی غلام کی مانند لگتا تھا، بے دام غلام۔

☆ ☆ ☆  
 ”ٹو اپنے لیے زردہ لینے آیا ہے؟“ جیلہ خالہ کے بڑے لڑکے نے نیاز کی تھیلی اسے بھائی۔ اس مٹی کے پتلے کی بھی خواہش ہو سکتی ہے۔ حیرت سی حیرت۔  
 ”اماں! بیٹھا کھانے کا بہت دل کر رہا ہے، بنا دو!“ انہم منت کر رہی تھی۔  
 ”تیرے باپ کی فیکٹریاں چل رہی ہیں جو تیرے لیے زردے کی دیکیں چڑھاؤں میں۔“ صدیقہ بگڑی۔  
 ”تھوڑے سے بنا دو۔“

”نہیں بنا سکتی، جادو ہی یہاں سے۔“  
 اور وہ برتن مانجنے کی تار پھینک کر محلے کی جیلہ خالہ کے دروازے کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”سہیلے۔“ کچن میں روٹی انہم کو اس نے زردے کی تھیلی پڑائی۔  
 ”ٹو کہاں سے لایا؟“  
 ”کھالے، چوری کر کے نہیں لایا، جیلہ خالہ کے گھر ناز بنی تھی۔“  
 انہم نے پہلی بار اس کی بھرپور آواز کو سنا اور نہ وہ تو اماں کے سامنے منمناتا ہی رہتا تھا۔  
 پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اس کی اہمیت اور بڑھ گئی، انہم بیٹھے کی شوقین تھی۔ گڑ کی ڈلی، گڑیا کے بال، موتی چور کے لڈو۔۔۔۔۔ وہ فرمائش کرتی اور وہ پوری کر دیتا۔ انہم پہلی بار بیٹھے کے اتنے ذائقے چکھ رہی تھی۔ چکھ تو وہ بھی پہلی بار ہاتھ، نئے رشتے کی مناس کو۔  
 ”تو مجھے اسماعیل بھائی کہا کر۔“ چند دن میں اس نے رشتے کا تعین ہو گیا۔

☆ ☆ ☆  
 وہ صحن میں چادر ڈالے لینا تھا۔ چار پانی کا پاپا تو شروع سے ہی لٹوٹا تھا، اتنا جھوٹی تھی وہ کہ جب بھی اس پر لینا تو لگتا تھا زمین پر آن پڑے گا۔  
 ”مہمانوں کے لیے رکھی تھی چار پانی، ٹو نے تو ڈال دی لیل۔“  
 اس نے پایا جڑوا لیا مگر چار پانی پر دوبارہ کبھی نہیں سویا۔  
 ”تو کب تک ان کی مفت میں خدمت کرتا رہے گا؟“ فضل دین نے اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھمائی۔ بڑا خدا ترس بندہ تھا وہ۔  
 دیوار سے دیوار ملتی تھی کریم اور فضل دین کی، چھوٹے سے گھروں میں باتیں گھر تک نہیں رہتی تھیں۔  
 ”وہ مجھے مفت میں پال رہے ہیں چاچا! میں ان کے کئی کام کر رہا ہوں تو کیا برائی ہے؟“ وہ ناشتا لینے دکان آیا تھا۔



”کئی۔۔۔۔۔ ان کے سارے کام ٹو ہی کرتا ہے۔ چلا جا یہاں سے، کوئی ہنر سیکھ کر اپنا کام شروع کر دے۔“  
 ”ایسے ہی کام نہیں ملتا چاچا! جہاں بھی جاؤں گا لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرنی پڑیں گی، اس سے بہتر ہے کہ اپنے محسنوں کی بی بی کر لوں۔“  
 ”دیکھ اسماعیل!“ فضل دین نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے منہ سے سسکی نکلی۔  
 ”دروازے سے نکل آ گیا تھا اندھیرے میں، کندھا سوچ گیا۔“  
 ”لوہے کے بنے دروازے ہیں نا کریم کے گھر میں؟“ فضل دین طنز بولا۔ ”صدیقہ نے پھر مارا ہے تجھے؟“ فضل دین کے لہجے میں ترس ہی ترس

تھا۔

اسماعیل کی آنکھوں میں پھٹی رات کا منظر لہرایا۔  
”دور دروٹی کھا گیا حرام خور! تو اس قابل ہے ہی نہیں کہ تجھے ساتھ بٹھا کر کھلایا جائے۔“ صدیقہ نے سامنے پڑا ٹوا سے دے مارا۔  
”نیند میں تھا اس لیے لگ گئی۔“  
”ساری زندگی ظلم برداشت کرتا رہے گا ان بد ذاتوں کا؟“  
”چاچی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ چائے چھوڑ کر چلا آیا۔

☆.....☆

”میری سہیلیاں کاچ کی رنگ برنگ چوڑیاں پہنتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر میرا بھی جی لچا ہوتا ہے۔“ انم کی فرمائش اسے انوکھی لگی۔  
”درجن بھر لادے مجھے سبز رنگ کی۔“ وہ بے دام غلام بھلا انکار کیسے کرتا۔  
”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ صدیقہ نے اسماعیل کو چوڑیاں دیتے دیکھا۔  
”ادھر دے مجھے۔“ اس نے انم کی کمر کے پیچھے کیے ہاتھوں سے چوڑیاں بھپٹ کر لی۔  
”اماں میں نے اسماعیل بھلا.....“  
”کیونے! تجھے شرم نہیں آتی۔ اپنی گھر کی عزت پر نظر رکھتا ہے۔“ صدیقہ کی دھاڑ پر اس گھر کے درو دیوار بل گئے۔  
”چاچی.....! اس الزام پر اس کی آنکھیں پھٹ گئی۔  
”عشق و عاشقی کرے گا تو؟ میری بیٹی سے؟“ وہ بانس کا ڈنڈا لے کر اس پر پٹیل پڑی۔  
”تو غلط سمجھ رہی ہے اماں! اسماعیل بھائی ہے میرا۔“ اس نے صدیقہ کا ہاتھ پکڑا۔  
”پندے ہٹ بے حیا، اسے بھائی بول کر اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈال رہی ہے۔“ صدیقہ کے دھکے پر انم کا سر دیوار سے جا لگرایا۔  
”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑنے والی۔“ صدیقہ

وحشی بنی اسے مار رہی تھی۔

”بھائی! تو چپ کیوں ہے؟ بتا اماں کو سچ۔“ وہ ہاتھ سے اپنا زخم دبائے چلائی۔  
وہ منہ ٹانگوں میں دیے مار کھاتا رہا تھا۔ پہلے کبھی چاچی کو جواب نہیں دیا، تو آج آواز نکالنے کی ہمت کہاں سے لانا۔  
”اوئے چھوڑ اسے بد بخت!“ کریم نے اسے دور کیا۔ صدیقہ اسے مار مار کر ہانپنے لگی۔  
وہ لنگڑااتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر کچن میں گھس آیا۔  
”عقل گھاس چرنے لگی ہے تیری؟ کیوں ایسے جنگیوں کی طرح مار رہی ہے؟“  
”احسان فراموش نکلا ہے یہ۔“  
کریم صدیقہ کو کمرے میں لے گیا۔ باہر خاموشی چھا گئی۔  
وہ گھٹنوں میں سر دیے میٹھا رہا، سر سے نکلے خون کو استین سے رگڑ کر صاف کیا۔  
”اپنا سامان اٹھا، مجھ سے پیسے لے اور بس پکڑ کر چلا جا اس شہر سے۔ بہت بڑی زمین ہے اللہ کی، تیرے لیے کچھ نہ کچھ رکھا ہوگا اس نے۔“ آج صبح ہی فضل دین نے اسے نئی راہ دکھائی تھی۔  
اس نے اپنی نیل دیکل کر کو دیوار سے ٹکایا تو درو کی ایک لہر دوڑ گئی۔ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، صبح سو دے کے بٹایا پیسے اس نے چاچی کو واپس نہیں کیے تھے۔ آنسو کو خون سے غم کھیل سے صاف کیا۔ محسن میں آکر اپنے چند جوڑوں کی پوٹی باندھی، چاچا اور چاچی کا کمرہ ہنوز بند تھا۔ انم دیوار سے لگی بیٹھی اسے لنگڑی باندھے دیکھ رہی تھی مگر نہ جی نہ منہ سے کوئی آواز نکالی اور وہ دروازہ پار کر گیا۔ اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔  
اس کے چلے جانے کا سب کو بہت دکھ تھا۔ ان کا بے دام غلام، مستقبل کا سہارا ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ انم نے ساتویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی، اسے زندگی کے پڑھائے سبق سمجھ میں نہیں آتے تھے،

کلاس کے سبق کیسے یاد کرتی۔

”کیا فرق پڑتا اگر اس کی انم سے شادی ہو جاتی، اپنی بچی گھر میں ہی رہ جاتی۔ اگر تو اس وقت عقل کی اندھی نہ بنتی تو سب سچ رہتا۔“ کریم کا قلق ہی ختم نہ ہوتا تھا۔  
”ہاں تا کہ میری بیٹی دو درو بے جوڑ کر رکھے میں اپنی زندگی ختم کر دیتی۔“ وہ اڑ جاتی۔ ”میں اس کی شادی بڑے آدمی سے کر دوں گی۔“  
اور سولہ سال کا ہوتے ہی سانولی سلونی سی انم کے لیے بڑے آدمی کا رشتہ آ گیا۔  
”لڑکے کی اپنی چلتی ہوئی پرچون کی دکان ہے۔“ کریم نے تصدیق کر دی۔  
صدیقہ نے خوشی خوشی اس کے پیادہ کی تیاری شروع کر دی، غریبوں کی تیاری ہوتی ہی نکلتی ہے۔ چند جوڑے اور برتن..... ایک مہینے میں اس کی شادی جیل سے ہو گئی۔  
☆.....☆  
”جیل کھوکھے کی جگہ دکان لیتا چاہتا ہے۔ اس کا دوست دلوار ہا ہے مگر پیسے کم پڑ رہے ہیں، کہہ رہا ہے کہ زور سچ دوں۔“ شادی کے چھ مہینے بعد انم جیل کا پہلا مطالبہ لیے آئی تھی۔  
”اس کی تو اپنی دکان ہے نا پہلے سے؟“ صدیقہ کو یہ مطالبہ عجیب لگا۔  
”نہیں! پان کا کھوکھا ہے، خوب کمائی ہو جاتی ہے مگر خرچے بڑھ گئے ہیں اب۔“  
”تیرے سرال دالوں نے جھوٹ بولا ہم سے، تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“  
”پہلے پتا چل جاتا تھے تو تو نے ہمیشہ کی طرح اس رشتے سے بھی منہ کر دینا تھا۔“ کریم سکون سے میں بولا، وہ کام پر کم جانے لگا تھا۔  
”جھوٹ تو نے بولا؟“ وہ شاک میں تھی۔  
”ہاں! میری ہڈیوں میں اتنا دم نہیں تھا اب کہ کبھی گلی سبزی کا ٹھیلہ لے کر پھر دوں، تین لوگوں کی روٹی کمانا بوجھ ہو گیا تھا۔ تجھے یہ بات سمجھ ہی نہیں آتی تھی

کہ تیری معمولی بیٹی کے لیے کوئی شہزادہ نہیں آنے والا۔“  
”تو نے مجھے کانوں کے چھلے دیے تھے وہ سچ دوں جیل کی دکان کے لیے؟“ انم کو کسی چیز سے فرق نہیں پڑتا تھا۔  
”وہ واحد زور رہی تو بے تیرے پاس، وہ سچ دے گی تو کیا بچے گا پھر؟“  
”ہاں سچ دے، دکان نہیں تھی تو کیا ہوا، اب ہو جائے گی۔ تیری ماں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔“  
پھر زور پک گیا، جیل کا دوست رقم ہڑپ کر رو پکڑ گیا۔  
”دکان کی کے چکر میں کھوکھا بھی ہاتھ سے گیا۔“ صدیقہ کو بہت صدمہ تھا۔  
☆.....☆  
”کیسے بے دردی سے مارا ہے میری بچی کو۔“ صدیقہ روٹی جاتی اور اس کے سر سے بہتے خون کو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی۔  
”ایسی ہی حالت کر دی تھی تو۔“ اسماعیل کی بھی۔“ انم کی آواز ٹھنڈی تھی، کسی بھی درد سے عاری۔  
کریم بیمار رہنے لگا تھا، صدیقہ کے بار بار بلانے پر بھی انم کم آتی تھی۔ صدیقہ ملنے لگی تو نشے میں دھت جیل دروازے پر اسے دھکا مارتے ہوئے چلا گیا۔  
اندراہولہاں انم کو دیکھ کر اس کی چیخ ہی نکل گئی۔  
”بد بخت! میری بیٹی نے کیا بگاڑا تھا جو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔“ وہ چلائی۔  
”تیری بیٹی نخوس ہے، اس کے آتے ہی میرا بیٹا کنگال ہو گیا۔“ جیل کی ماں تن کر کھڑی تھی، گویا وہ بھی اس ظلم میں شامل تھا۔  
صدیقہ اسے گھر لے آئی۔  
”میں واپس نہیں بھیجنے والی تھی، جب تک یہاں آکر معافی نہ مانگ لے۔“ وہ اس کے زخم پر مرہم لگاتے ہوئے کہتی۔

## ام ہانی بھولا جو فرض



”وہ مجھے معاف کر دے گا نا؟“ وہ انہم سے پٹ گئی۔  
”اللہ یا بندہ؟“  
”وہ لوں.....“

”بندے سے معافی مانگتو تو اللہ بھی معاف  
کر دے گا مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ واپس آئے گا اب۔“  
”وہ ضرور آئے گا۔“  
صدیقہ اپنے انتظار کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتی۔  
”چاچی.....!“ برسوں بعد کسی نے اسے ایسے  
پکارا تھا۔

”اسامیل!“ وہ اس تک لڑکھڑاتی سنجلتی بچی۔  
”مجھے یقین تھا تو آئے گا۔“  
”مجھے واپس آنا ہی تھا، میں احسان فراموش نہیں  
تھا چاچی۔“ اس کی آواز میں کتنا اعتماد تھا۔  
”تیری زندگی برباد کر دی میں نے۔“

”تو نے میری زندگی آباد کر دی، تو نے میرے  
اندر اتنی برداشت پیدا کروادی کہ مالک کی لعنت و  
ملامت بھی بُری نہ لگی، نہ ردھی سوچی پر بھی شکوہ کیا۔  
سالوں اس کے پاس شاگرد بن کر کام سیکھتا رہا اور  
آج میرا اپنا گاڑیاں ٹھیک کرنے کا کیراج ہے۔“ وہ  
پرانے اسامیل جیسا بالکل نہیں لگ رہا تھا۔  
”تو تو بڑا آدمی بن گیا ہے۔“ انہم کے لبوں کو  
مسکراہٹ نے چھوا۔ اس گھر نے سالوں بعد یہ منظر  
دیکھا تھا۔

”اللہ کا احسان ہے۔ اس گھر سے جاتے ہوئے  
چاچی کے ہاتھ سو روپے لے کر بھاگا تھا، وہ فرض  
واپس کرنے آیا ہوں۔“  
”مجھے معاف کر دے، میری انہم کو اپنا لے۔“  
صدیقہ اس کے پیروں پر پڑ گئی۔

”تیری بیٹی اتنی بے وقعت نہیں چاچی کہ تو بیروں  
میں پڑ کر اس کی خوشیوں کی بھگ مانتے۔ میرے  
لیے اعزاز ہوگا اگر تو فخر سے یہ میرا میری جھولی میں  
ڈالے۔“ وہ انہیں گلے لگائے کھڑا تھا۔  
خوشیاں ان کے گھر میں رقصاں تھیں۔ گرہ کھل گئی  
تھی۔ ☆☆

معافی تلافی کی نوبت ہی کسے آتی۔ جیل نے تو  
پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ خبر ملی تو اس کی دوسری شادی کی  
اور انہم کو طلاق کی۔

”سنا ہے انہم بھی ماں کی طرح بڑی زبان درازی  
کرتی تھی جیل سے جیسی طلاق ہوگئی۔“  
”اس کی دوسری بیوی بہت پیسہ لائی ہے اپنے  
ساتھ۔“

کریم کی موت پر محلے والے بھانت بھانت کی  
بولیاں بول رہے تھے۔  
چند دن کی بات تھی، جس روکھی سوکھی پر گزارا  
ہو رہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ فضل دین کی بیوی نے انہم کو  
گھر دین میں صفائی کا کام لگوا دیا۔ زندگی کی گاڑی پھر  
سے کھکنے لگی۔

☆.....☆  
ماہ و سال گزرنے لگے۔ پرانے گھروں کی جگہ  
نئے گھر بن گئے مگر صدیقہ کے گھر میں تو وقت سرک  
بھی نہیں رہا تھا۔ گھر میں دو زندہ نفوس کے ہوتے  
ہوئے بھی ہر وقت موت کا سنا سنا جھایا رہتا۔  
”کریم کو گئے اتنے سال بیت گئے۔ تو کب تک  
اس کا غم منائی رہے گی؟ انہم بیس سے اوپر کی ہونے  
والی ہے، اس کا کچھ سوچ، اگر تجھے کچھ ہو گیا تو اس  
غریب کا کیا ہوگا۔“ فضل دین کی بیوی روز اس کی  
دل جوئی کرنے آتی تھی۔

”لگتا ہے کہ کوئی گرہ ہی بندھ گئی ہے، کھلتی ہی  
نہیں۔“ وہ بڑبڑاتی رہتی۔  
وہ بیمار رہنے لگی تھی مگر بیماری کی کوئی تشخیص ہی نہ  
ہوتی تھی، نہ چین ملتا تھا نہ سکون۔ سارا دن ٹوٹی  
چار پائی پر پڑی رہتی۔

”نرسین باجی کہہ رہی تھیں کوئی ہمارے ساتھ نہ  
کرتا ہے تو دل میں گرہ بندھ جاتی ہے اور جب ہم  
کسی کے ساتھ نہ آکر جیتے ہیں تو.....“ انہم برتن  
اٹھاتے ہوئے بول رہی تھی۔ ”ہماری زندگی میں گرہ  
بن جاتی ہے۔“  
صدیقہ کے لیے جیسے پوری دنیا ٹھہر گئی۔



دروازے پہ پیل ہوئی تو نماز کے لیے جاتی ایٹل نے کھڑی پہ وقت دیکھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس کا منہ فوراً پھول کر کیا ہو گیا۔ اس وقت عقیلہ باجی کے سوا بھلا کون آ سکتا تھا۔ اسکول سے بچوں کو ساتھ لیے بیٹیں آگئی ہوں گی۔ یہ ان کا ہر ہفتے میں لگائے جانے والا دوسرا چکر تھا جس کے بنا وہ رہ نہیں سکتی تھیں۔ اس نے تو اس دن سالن بھی نہیں بنایا تھا کہ ایک دن پہلے کا سالن اس کے کھانے کے لیے موجود تھا اور ایسی فونی پہ گئی ہوئی تھیں، ان کی واپسی رات میں ہی ممکن تھی۔ اب وہ باجی کو کیا اور کہاں سے کھلائے گی جو بنا پتائے کبھی بھی نازل ہو جاتی تھیں۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ دروازے تک پہنچی اور کنڈی کھول دی۔ باہر اس کی توقع کے عین مطابق عقیلہ باجی گود میں اشعر اور انٹی تھا جسے جل کو لیے کھڑی تھیں۔ جل نے اپنا اور اشعر کا بیک بھی تھام رکھا تھا۔ اسے بڑے بٹائی، بچوں سمیت اندر داخل ہوئیں۔

”تو بہ یار کتنی گری ہے۔“ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے بڑے کمرے کا رخ کیا اور فوراً اسے اسی کا بٹن آن کر دیا۔ ”جلدی سے ٹھنڈا سا شربت تو پلا دو۔ بچے اسکول سے آتے ہی شربت پیتے ہیں۔“ اور بچے کب کیا کرتے ہیں تو اسے یوں بھی ازر تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے بھی گنوا رہی تھیں۔

ایٹل نے ٹھنڈے شربت سے جگ بھر کر گلاس سمیت باجی اور بچوں کے سامنے رکھا جواب اس کے بیڈ پہ بر اجمان ہو چکے تھے اور اسے اب اپنے لیے نیچے میسرٹس بچھانا تھا۔ کمرے میں ان کے آتے ہی جا بجا سامان بھر چکا تھا۔ کہیں بچوں کا تبدیل کیا گیا یونی فارم پڑا تھا، کہیں بیک، کہیں جوتے تو کہیں باجی کا سامان اور اس کے کمرے کی ہر چیز الگ، جواب اپنی جگہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ پہنچ چکی تھی۔ اس کا منہ بننا ہی تھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ چپ چاپ بھر اسامان بھرا رہنے دیا کہ اٹھانے کا فائدہ ہی کیا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر سے وہی حالت ہی تو ہو جانا تھی۔ اس کی طبیعت رات سے ناساز تھی اسی لیے وہ اسکول نہیں جا سکی تھی۔ صبح ہی اس نے

سارے کمرے کی سیٹنگ کی تھی اور اب پہلے سے بھی زیادہ ابتر حالت پیش کر رہا تھا۔ اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ سارا پچھلا دا بھر سے سیٹے۔ وہ نماز کے لیے چلی گئی۔ نماز پڑھ کر لوٹی تو باجی دیے ہی لپٹی تھیں۔

”ابھی روٹی بناؤ گی تو ہم تینوں کے لیے دو روٹی بنا دینا۔“ ظاہر تھا اسے ہی روٹی بنانا تھی کہ وہ تو سیکے آ کر بل تک پانی بھی پی لیتیں تو یوں گنوا تیں کہ جیسے پانی کولر سے نہیں، کنویں سے نکال کر پیا ہو۔

”روٹی تو میں بنا دوں لیکن سالن کا کیا کروں۔ ایک ہی بندے کے کھانے کا سالن فرخ میں پڑا ہے۔“

”توانڈے بنا دو۔ اس میں کیا ہے۔“

”ہے تو کچھ نہیں مگر آتے آنے سے پہلے بتا دیتیں تو زیادہ اچھا ہوتا کہ میں کچھ بنا ہی دیتی۔“ اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بس پھر تو عقیلہ باجی کو جو آگ لگی۔ فوراً سے بولنے لگیں۔

”ہاں بندہ اپنے پیسے آتے ہوئے بھی سو سو بار سو جا کرے تاکہ جائے بائیں۔ لوگوں کی بیٹیاں کتنے کتنے دن آ کر رہتی ہیں، میں تو بیٹے میں ایک یا دو بار چند گھنٹے کے لیے آتی ہوں تو بھی ہلکتی ہوں تم لوگوں کو۔“

ایٹل انہیں کھولتا اور بولتا ہوا چھوڑ کر چکن میں چلی آئی کیونکہ ان سے بحث کرنا بے کار تھا اگر وہ کسی بہرے کے کان میں سرگوشیاں کر لیتی تو وہ بھی سن کر سمجھ جاتا۔ اب وہ شام تک تو کیا اگلے دن تک یونہی اس پہ بولتی رہیں گی کہ وہ بد اخلاق ہے، ان کا آنا اسے ناگوار لگتا ہے، اس گھر کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے حکومت کرتی ہے۔

☆☆☆

تو بات یہ تھی کہ عقیلہ باجی یوں تو اپنے سارے کاموں میں بڑی ماہر اور کھڑ تھیں لیکن بس اپنے گھر کی حد تک۔ اپنے میکے میں وہ پول پھو پڑیں جاتیں جیسے صفائی ستھرائی کے فریب سے کبھی بھی ان کا زور نہ ہوا ہو، جیسے کھانا پکانا جس پر چا کا نام ہے وہ جانتی ہی نہ ہوں۔ وہ جب بھی آتیں اپنے ساتھ گھر کی تباہی لاتیں۔ جو کھایا، چدھر کھایا برتن ادھر ہی پڑا رہے دیا۔ ساتھ ساتھ ایٹل کو حکم جاری کہ یہ یوں کر دروازہ پر ایسے کر دو۔ کام کاج میں

ماں بہن کا کبھی ہاتھ نہیں پٹاتی تھیں بھلے کتنی ہی مجبوری بن جاتی۔ بچے جیسے جیسے چیزیں بھراتے جاتے اور کبھی جو عقیلہ باجی کو تو قیٹ ہوئی ہو کہ انہیں سمیٹ دیں۔ ان کے جانے کے بعد سارے گھر کا نقشہ ایٹل اور امی کو مل کر درست کرنا پڑتا۔ پھر ہر کام میں ٹانگ اڑانا کہ یہ کام ایسے کیوں کیا گیا ہے، یہ چیزیں یہاں کیوں رکھ دی، فلاں کام کرنے سے پہلے ان سے اور ان کے شوہر سے کیوں مشورہ نہ کیا گیا، فلاں کام کے وقت انہیں کیوں ساتھ نہ لے جایا گیا۔

وہ اسی پہ ہی اکتفا نہیں کرتی تھیں، ایٹل کی الماری سنہ کھول کر اپنی مرضی کے جوتے نکالے، جیولری نکالی، میک اپ نکالا، بغیر اجازت لیے اور یہ جاہ جا۔ وہ بھاری بھر جسامت کی مالک تھیں، ایٹل اور ان کی جسمانی ساخت میں فرق تھا ورنہ تو وہ اس کے کپڑے ہی لے جاتیں۔ اپنے بھدے پاؤں اس کے نازک جوتے میں جب پھنسا تیں تو اس کا ہر جوتا کھل جاتا اور پہننے پہ پاؤں بے نکلتا ہی رہتا۔ ایٹل جب انہیں کھڑی کھڑی سنانے کا سوچتی تب تب مشال اسے روک دیتی۔

”شادی شدہ بہن ہیں۔ یوں باتیں سنانا اچھا نہیں لگتا۔“

”یا تو وہ خود کو صہمان سمجھیں اور گھر کی ہر چیز پہ حق سمجھنا، ہر بات میں ٹانگ اڑانا بند کریں۔ یا پھر بہن سمجھتی ہیں تو بہنوں کی طرح آئیں اور اس گھر کو اپنا سمجھتے ہوئے کم از کم اور نہیں تو اپنے بچوں کے کام کو نبھانا جایا کریں۔ امی سے کام کر دانے کے بجائے ان کا کام کر جایا کریں۔ لیکن وہ دونوں صورتوں میں سے کسی ایک پہ بھی عمل نہیں کرتیں۔ جہاں اپنا مفاد دکھا بیٹی بن گئیں اور جہاں فائدہ نظر آیا تو صہمان۔“

”اب کیا سمجھایا جائے انہیں.....!“

”سمجھتی سب ہیں بس کرتی نہیں ہیں۔ اپنے گھر کو تو ایسے سنا سنا کر رکھا ہوا ہے۔ کبھی جو کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے۔ بس سارا گنڈ، چاٹا ادھر آ کر یاد آتا ہے۔ تم بھی تو اب شادی شدہ ہو۔ کبھی کبھار آتی

ہو پھر بھی اتنے کام کرواتی ہو۔“

مشال جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد ہمیشہ چھوٹی بہن کو سمجھاتی ہی رہی تھی کہ باجی کی حرکتوں کو نظر انداز کر دیا کرے لیکن دل سے وہ بھی اسی بات کی قائل تھی کہ ان کی حرکتیں کبھی کبھار نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہوتی تھیں۔

”اچھا اس بار میں آؤں گی تو ان کے سامنے کام کروں گی۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں احساس ہو جائے اور وہ اپنا رویہ درست کر لیں۔“ لیکن ایٹل کو ایسی کوئی امید نہیں تھی۔ اس کی یہ بہن کچھ زیادہ ہی خوش گمان تھی۔

☆☆☆

اگلی بار مشال میکے رہنے کے لیے آئی تو عقیلہ باجی بھی اس کے آنے کا سن کر آگئیں۔ یوں تو مشال کا سسرال اسی شہر میں تھا لیکن وہ مہینے میں ایک آدھ بار ہی رہنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ عقیلہ باجی تو سسرال کے ساتھ رہتی نہ تھیں اس لیے آئے دن بن بلائے، بہن بنائے آؤ گئیں۔

مشال جواب کی بار قریباً پڑھ ماہ بعد میکے آ رہی تھی آتے ہی کاموں میں لگ گئی، کھانے میں بیٹھا بنا کے رکھ دیا، امی مٹر پلاؤ بن رہی تھیں تو اس نے آلو کے ٹکس ساتھ میں بنانے شروع کر دیے۔ صبح کے بڑے سارے برتن دھوئے اور سیٹے۔ امی کو اس کے آنے سے بڑی تسلی ہو جاتی تھی کہ ایٹل تو نوکری کی غرض سے اسکول گئی ہوئی اور دوپہر میں لوٹی تھی۔

رات تک وہ امی کے ساتھ بے شمار کام کروا چکی تھی۔ عقیلہ باجی دیکھ کر کبھی ایسی بنی رہیں کہ جیسے کچھ نظر نہ آتا ہو۔ رات میں صمیر بھائی عقیلہ باجی کو آ کر لے گئے تھے۔ اور وہ رات وہیں رگ گئی تھی۔

”اب بتاؤ کوئی فرق پڑا باجی کو۔ کسی ڈھیٹ بنی بیٹی رہیں اور تمہیں لگا تھا کہ انہیں شرم آئے گی۔ احساس ہوگا مگر ایسا کوئی جذبہ انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا۔“ مشال خاموش رہی تھی۔ ایٹل اپنی جگہ ٹھیک تھی۔

☆☆☆



## دنیاوی اور اخروی زندگی

☆ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خریدی ہے دنیاوی زندگی آخرت کے بدلے۔ لہذا نہ تو کسی کی جائے کی ان کے عذاب میں اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔ (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۸۶)

☆ جو شخص ہے طلب گار آخرت کی کھیتی کا اضافہ کریں گے ہم اس کے لیے، اس کی کھیتی میں اور جو ہے چاہنے والا دنیا کی کھیتی کا دیتے ہیں ہم اسے اسی میں سے اور نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ۔ (سورۃ الشوریٰ آیت نمبر ۲۰)

☆ اللہ فراخی دیتا ہے رزق میں جسے چاہے اور نپا چلا دیتا ہے (جسے چاہے) اور ممکن ہیں یہ دنیاوی زندگی میں اور نہیں ہے دنیاوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر ایک حق فائدہ (سورۃ المرعد آیت نمبر ۲۶)



حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جس قوم میں غاشی کو ایسا فروغ ہوتا ہے کہ کھلم کھلا بے حیائی ہونے لگے تو ان میں طاعون کی وبا پھوٹتی ہے، اور ایسے ایسے درد پیدا ہوتے ہیں جو ان کے اسلاف میں نہیں تھے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، اسے قحط اور سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور ان کے حکمران ان پر ظلم توڑتے ہیں اور جو قوم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتی اس پر آسمان سے بارش بند کر دی جاتی ہے اور اگر چوپائے نہ ہوں تو ان پر بھی بارش نہ ہو، اور جو قوم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑتی ہے، اللہ تعالیٰ غیروں میں سے اس پر دشمن مسلط کر دیتا ہے جو ان کے ہاتھ کی پوٹی چھین لیتا ہے اور جب بھی کسی قوم کے حکام اللہ کی کتاب کے

آواز بھٹنے لگی۔

☆ ایٹل مجھے کیوں کچھ بتا نہ گی میں خود بھی دیکھتی رہی ہوں شادی سے پہلے بھی در بند میں تھی۔ ”ہاں تو میرا میکا ہے، گھڑی دو۔“ ی پل جاتی ہوں تو کیا ہو گیا۔ تم بھی تو جانی ہو، اس کی چیزیں استعمال کرتی ہو۔ تم یہ بھی وہ بولی ہے۔ مجھ سے ہی اسے شروع سے تکلیف ہے۔“

”آپ کو یہ نظر آ گیا کہ میں جاتی ہوں تو مجھ پر وہ کیوں نہیں بولتی لیکن یہ نہیں کہ میں وہاں جا کر امی اور اس کا کتنا ہاتھ پائی ہوں۔ اس کی کوئی چیز بناؤ مجھے استعمال نہیں کرتی۔ ابھی اس سے اپنا کوئی کام نہیں کر دیا۔ کسی کام میں مداخلت نہیں کی۔ کیڑے نہیں نکالے۔“

”ہاں تو کیا ہو گیا اگر یہ سب کر دیا۔ میرا بھی اس گھر یہ اس گھر کی چیز دوں یہ حق ہے۔ بیٹی ہوں میں بھی اس گھر کی۔“

”بیٹی ہیں تو بیٹی بن کر بھی دکھائیں نا باجی۔ حق جتنا آپ کو یاد رہتا ہے فرائض کیوں یاد نہیں رہتے؟ بیٹیاں بھلے بیابانی ہی کیوں نہ ہوں، ان کے فرائض ماں باپ کی طرف سے ختم تو نہیں ہو جاتے۔ ابھی امی کو مدد نہیں کی، ابھی کسی کام میں دلچسپی نہیں لی۔ بس گلے شکوے کرنا یاد رہتا ہے آپ کو۔ اگر آپ یہ سب کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں تو پھر آپ کی نند کا بھی حق ہے یہ سب کرنے کا اور آپ کو پھر کوئی حق نہیں ہے اس کے رونے، رونے کا۔“

عقیدہ باجی نے فون بند کر دیا تھا لیکن وہ باجی کی باتوں پر سوچ رہی تھی کہ ہر بندے سے اس کے فرائض کا سوال ہوتا ہے۔ لیکن اپنے فرائض پہ نظر ڈالنے کے بجائے ہم اپنے حقوق پہ نظر رکھتے ہیں اور دوسرے سے چاہتے ہیں کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے۔ کاش کہ یہ بات ہم سب کی سمجھ میں آ جائے کہ جو زیادتی ہم کسی کے ساتھ کرتے ہیں وہ ہمیں نہ کہیں سے پلٹ کر ہمارے پاس ہی لوٹ آتی ہے۔

☆☆

”ایک مصیبت بن جاتی ہے جب بھی آتی ہے۔ جہاں کھائے گی وہیں پلیٹ چھوڑ جائے گی، پانی پیے گی تو گلاس وہیں۔ میرے سے پوچھے بنا میرے دراز کھول کھول کر تلاشیاں لیتی ہے پھر جو چیز پسند آئے فوراً رکھ لے گی کہ بھابھی میں یہ لے رہی ہوں۔ اتنے اتنے دن آ کر رہتی ہے مگر بجال ہے کہ گھر کا کوئی کام کر دے الٹا میں ہی سارا وقت چیزیں سمیٹتی رہتی ہوں بھاگ بھاگ کر۔“ اس روز وہ مثال سے فون پر اپنی چھوٹی نند کے دکھڑے رد رہی تھیں جو ان کی طرف آئی ہوئی تھی۔

”تو آپ اسے پیار سے سمجھا دیا کریں۔“ ”سمجھتی سب ہے، جان کر کرتی ہے۔ بھائی کے گھر آئی ہوئی ہے تا تو بھابھی مل گئی نوکرائی وہ بھی مفت کی۔“ مثال نے ایک پل لگایا فیصلہ کرنے میں اور ہمت کر کے بول پڑی۔

”وہ تو چلیں بھائی کے گھر آئی ہوئی ہے، بھابھی کو نوکرائی سمجھتی ہے لیکن آپ تو ماں کی طرف جا کر بہن اور ماں کو نوکرائی سمجھتی ہیں۔“ ”کیا مطلب ہے؟ میں نے ایسا کیا کیا؟“ ”یک دم ان کا دل بوجھ بدل گیا۔“ ”آپ کو نہیں پتا کہ آپ امی کی طرف جا کر کیا کرتی ہیں؟ آپ بھی تو بجائے ان کا ہاتھ بٹانے کے ان کے کام بڑھا دیتی ہیں..... اور کچھ نہ سہی اپنے بچوں کی چیزیں ہی سمیٹ دیا کریں۔ بغیر پوچھے ایٹل کی چیزیں استعمال کے لیے لے جاتی ہیں اور ناقابل استعمال حالت میں لوٹاتی ہیں۔ جب آپ یہ سب کرتی ہیں اور آپ کو یہ سب جائز ہے تو جب یہی آپ کے ساتھ ہوتا ہے تو آپ مظلوم کیوں بن جاتی ہیں۔“ کچھ دیر پہلے جن باتوں پر وہ کسی کی شکایتیں کر رہی تھیں، وہی باتیں جب انہیں لوٹائی گئیں تو انہیں پتہ لگ گئے۔

”تمہیں ایٹل نے کہا ہے نا سب۔ اسے تو میں ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ہر وقت میرے اور میرے بچوں کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔“ غصے سے ان کی

مطابق فیصلہ نہیں کرتے اور اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام میں تردد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان خانہ جنگی پیدا کر دیتا ہے۔“ (ابوداؤد ماجہ، ترمذی ص ۲۱ ج ۳)

## خلفاء راشدین

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علم و تقویٰ کی دولت حاصل کرنے کے لیے بہت سی جماعتیں حاضر ہوئیں، ان میں ایک باوجاہت شخص بھی موجود تھا جس نے سر پر سفید عمامہ باندھا ہوا تھا۔

اس نے سوال کیا۔ ”اے امیر المؤمنین! ہم آپ رضی اللہ عنہ کو خطبہ میں یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ ”اے اللہ! ہماری بھی اسی طرح اصلاح فرما جس طرح آپ نے خلفاء راشدین کی اصلاح فرمائی، ذرا بتائیے وہ کون تھے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں، ارشاد فرمایا: وہ دونوں میرے حبیب، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم ہیں، جو ہدایات کے امام اور اسلام کے شیخ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی اقتداء کی جانی ہے۔ جو شخص ان کے اقتداء کرے گا محفوظ رہے گا اور جو ان کے نقش پا کی پیروی کرے گا اسے صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوگی اور جو شخص ان کو مضبوطی سے تھام لے وہ اللہ کے گردہ میں سے ہے۔ (تاریخ الخلفاء..... ص ۲۸۵)

## جواہر پارے

1- سمجھوتے میں زیر دستی کا عنصر ہوتا ہے۔ مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی سب کچھ جانتے ہوئے

سمجھوتا کرنا بڑا کرب ناک ہے مگر ماننے کے لیے جانا ضروری نہیں ہوتا۔

2- جو شخص زمین کا سفر کرتا ہے اس کے پاؤں میں آبلے پڑتے ہیں۔ اور جو آسمان کا سفر کرتا ہے اس کے دل میں آبلے پڑتے ہیں۔

3- بعض لوگوں کی زندگی میں اگر غم آجائیں تو قبوتوں میں شدت آجاتی ہے۔ کبھی شعوری طور پر کبھی لاشعوری طور پر۔

4- خوشی زیادہ ہو تو اسے سنبھالنا منہ زور گھوڑے کو سنبھالنے جیسا ہوتا ہے جو سب سے نہیں سنبھلتا۔

5- بڑا قد کے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے۔ سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہوتا ہے۔

فوزیہ ٹبرٹ..... مہجرات

### باپ کا بیٹے کے نام خط

پارے بیٹا!  
السلام علیکم۔

اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہارے ابو، امی اور بچہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رہتے رہے ہیں اور اب تمہارے پاس کاروبار بھی بہت سخت ہے تو چند مہینے اور انتظار کر لو۔ ہم نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ بیوی کے آتے ہی تمہیں ہم سب کی صحیح قدر معلوم ہو جائے گی۔

لفظ آپ کا غم گسار ابو

سمرت طارق..... مظفر آباد

### اتوال خواتین

”اپنی زندگی میں ایسے لوگوں کو شامل نہ کریں جو آپ کو نیچے کی طرف لے جانے کا سبب بن رہے ہوں۔ اپنے وجدان پر بھروسہ رکھیں..... اچھے تعلقات اچھا احساس دلاتے ہیں، وہ دردناک نہیں ہوتے۔“ (مشعل ادبانا)

”میں نے زندگی کے کئی سالوں سے یہی سیکھا

ہے کہ جب ذہن کسی بھی کام کے لیے تیار ہو جائے تو ذہن سے خوف خود بخود کم ہو جاتا ہے۔ جو کام ضرور کرنا ہوا ہے ڈر کے بغیر کرنا چاہیے۔“ (روز اپارکس)

”میں سمجھتی ہوں کہ جولوٹی خود بیسے کمانے اور ادا کرنے کے قابل ہو، اسے ایسے ہی خوش ہونا چاہیے جیسا کہ کوئی بھی شخص دنیا میں خوش ہوتا ہے۔ آزادی اور سلامتی کا احساس ہی بہت پیارا ہوتا ہے۔“ (سوہن بی انھونی)

”سوال یہ نہیں ہے کہ کون مجھے کام کرنے دے رہا ہے بلکہ یہ ہے کہ کون مجھے کام کرنے سے روک رہا ہے۔“ (آئین رائد)

سحر تبسم سحری..... مغل پورہ

### غلاف

کعبے کا غلاف اس لیے کہ پتا چلے: یہ کوئی عام گھر نہیں اللہ کا گھر ہے۔

قرآن یہ غلاف اس لیے کہ پتا چلے: یہ کوئی عام کتاب نہیں اللہ کی کتاب ہے۔

عورت کا حجاب اس لیے کہ پتا چلے: یہ کوئی عام عورت نہیں مسلمان عورت ہے۔ (تبسم بشر حسین۔ ڈنگلہ)

### سلطان باہو

اندر نکلے قل قل کردا عشق سکھایا کلمہ ہو چودا ملحق طے دے اندر قرآن کتابا علماں ہو کانے کپ کے قلم ہتاوں لکھ نہ سکنا قلماں ہو کلمہ ہیر پڑھایا یا ہو ذرا نہ رہیاں الماں ہو

### بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ طبیب کی غلطی ایک دو انسان ہی مارتی ہے لیکن حکمران کی غلطیاں پورے ملک و قوم کو برباد کر دیتی ہیں۔ (افلاطون)

☆ جو آدمی ارادہ کر سکتا ہے اس کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ (نظیر ن)

☆ میں ان سب لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری مدد نہیں کی آج انہی کی بدولت میں نے سب خود کیا۔ (آئن اسٹائن)

☆ تمہاری اصل ہستی تمہاری سوچ ہے، باقی تو صرف ہڈیاں اور خالی گوشت ہے۔ (مولانا جلال الدین رومی)

☆ اگر روزی کا انھار عقل مندی پر ہوتا تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔ (شیخ سعدی)

☆ کائنات چو ہدری کل..... مہجرات

### شکوہ

☆ آم، اسبا کیٹی، شربٹ اور خستہ پنیر کھانے کا مہذب طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہوا۔

☆ مہجرات اور رکھ رکھاؤ کی بھی کتنی اذیت ناک ذمہ داریاں ہوتی ہیں کہ انسان جو کرنا چاہے نہ کر سکے ضبط کر کے بیٹھا رہے (مستنصر حسین تارڑ)

☆ یہ نئی نسل نہایت ناخلف اور نالائق ہے بدراہی کی حرکتیں خود کرتی ہے اور ذمے دار والدین کو ٹھہرائی ہے۔ کار بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔ (ابن انشاء)

☆ ہر لڑکی کو کسی نہ کسی طرح یہ باور کرادو کہ وہ بے حد حسین ہے۔ اس کے بعد وہ بقیہ جھوٹ بھی بچ مان لے گی۔ (شفیق الرحمان)

☆ کہنے لگے یوٹی۔ ”یہ بتاؤ عورت کی کشش اور زمین کی کشش میں کیا فرق ہے؟“

عرض کی ”کچھ خاص نہیں، دونوں ہی آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔“

(صدف سمج..... کراچی)

### سلسلہ گفتار

کوفہ کے باشندوں نے خلیفہ مامون الرشید کے

پاس گورنر کی شکایت کی اور کہا کہ اس کا جالہ کر دیجیے۔ مامون نے حیران ہو کر کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں میرے گورنر دل میں اس سے زیادہ عادل اور راست باز کوئی نہیں۔“

اس پر ایک شخص بولا۔ ”امیر المؤمنین! اگر ہمارا گورنر واقعی ایسا ہے تو آپ کو اہل ملک کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے اس سے ہر شے کو مستفید کرنا چاہیے۔ اگر ایسا کریں گے، تب بھی کوفہ کے حصے میں اس کے تین سال سے زائد نہیں آئیں گے۔“ مامون اس بات پر ہنس پڑا اور حاکم کا جالہ کر دیا۔

اسی طرح ایک اور شخص مامون کو راستے میں ملا اور کہنے لگا۔ ”میں ایک عرب ہوں۔“

”یہ کوئی عجیب بات نہیں“ مامون نے کہا۔ ”میں حج کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ شخص بولا۔

”راستہ سامنے ہے، چلے جاؤ۔“ مامون نے جواب دیا۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پھر تو تمہیں بیچ کر بیس بیس دینا پڑے گا۔“ مامون نے کہا۔

اس پر اس شخص نے ہر جتہ کہا۔ ”میں آپ سے فتویٰ نہیں، ہدیہ لینے آیا ہوں۔“

مامون ہنس پڑا اور اسے انعام سے نوازا دیا۔ (شامشہاد..... کراچی)

### انکشاف

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے، کوئی رشہ بھانے کا نہ کوئی اور یہ دل میں تیرہ یا ارادہ ہے! کتنی دن سے مگر دل میں عجیب ابھمن سی رہتی ہے! نہ تم اس داستان کے سرسری کردار ہو کوئی نہ قصہ اتنا سادہ ہے! تعلق جو میں سمجھا تھا کہیں اس سے زیادہ ہے!

☆ ☆

# شام کی چائے

خالدہ جیلانی



عید اور پھر عید کے بعد کی مصروفیات کے بعد اب کہیں جا کر کچھ فراغت ملی ہوگی۔ تو کیوں نہ آج شام کی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا سا اہتمام کر لیا جائے۔ تو لیجیے، اہتمام کے لیے تراکیب حاضر ہیں۔ جھٹ جھٹ بنا میں اور اہل خانہ کے ساتھ مل کر بیٹھ خوب لطف اندوز ہوں۔

## چکن فچٹا رول

اشیاء:	دور درجن
چکن	دو عدد
نمک	دو عدد
سرخ مرچ	چار عدد
سفید زیرہ پاؤڈر	ایک کپ
لیموں کا رس	ایک کپ
شملہ مرچ	ایک کپ
ہری پیاز	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
پراٹھے	چار عدد
گارلک سوس	حسب ضرورت
مایونیز	آدھا کپ

ترکیب:  
چکن دو حصوں میں کاٹ لیں۔ پھر اس میں لیموں کا رس، نمک، سرخ مرچ اور زیرہ کس کر کے 30 منٹ کے لیے میری نیٹ کر لیں۔ ایک پیٹلی میں چکن فرائی کر دیں، جب براؤن ہو جائے، تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ اب پیاز، شملہ مرچ اور ٹماٹر (ان دونوں اجزاء کے بیج نکال دیں) لیمائی میں کاب لیں۔ جس پیالے میں چکن میری نیٹ کی تھی، اسی میں چکن، مایونیز ڈال کر اچھی طرح

## ویجی ٹیبل رول

دور درجن	دو عدد
گار	دو عدد
شملہ مرچ	چار عدد
ہری پیاز	ایک کپ
نوڈلز (پال لیں)	ایک کپ
بند گوبھی (کٹی ہوئی)	ایک کپ
کالی مرچ	ایک کپ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
سویا سوس	دو کھانے کے چمچے
کارن فلوور	دو کھانے کے چمچے
انڈے (صرف سفیدی)	دو عدد
پھیٹ لین)	دو عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:  
بند گوبھی، گار، شملہ مرچ اور پیاز باریک کاٹ کر فرائی کر کے الگ باؤل میں نکال لیں اور ان میں نمک، کالی مرچ اور نوڈلز ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ اب اس آمیزے کو رول پیٹوں میں بھر کر، کنارے انڈے کی سفیدی سے بند کر دیں۔ گرم تیل میں فرائی کر کے تازہ، خستہ رولز گھردالوں کو کھلائیں اور خود بھی کھائیں۔

☆☆

بشری مجنون



انوش البصار کی ڈائری میں تحریر۔  
بر باد دیوں کا سوگ منانا فضول تھا  
بر باد دیوں کا جشن منانا چلا گیا  
جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا  
جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا

غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں  
میں دل کو اس مقام پہ لاتا چلا گیا

سیدہ لوبا سجاد کی ڈائری میں تحریر۔  
مینر سبازی کی عزت  
عم کی بارش نے بھی تیرے نقش کو دھویا نہیں  
تو نے مجھے کھو دیا، میں نے تجھے کھو دیا نہیں

نیند کا ہلکا گلابی سا خمار آنکھوں میں تھا  
یوں لگا وہ شب کو دیر تک سویا نہیں

ہر طرف دیوار و در انداز میں آنکھوں کے ہجوم  
کہہ سکے جو دل کی حالت وہ لب کو یاد نہیں

جرم آدمی نے کیا اور نسل آدم کو سزا  
کاٹا ہوا زندگی بھر، میں نے جو لیا نہیں

جاننا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی مینر  
غم سے بھر ہو گیا، لیکن کبھی دیا نہیں

زندگی سے کسی سمجھوتے کے باوصف اب تک  
یاد آتا ہے کوئی مارنے، مرنے والا  
اس میں کو بھی تیرے کو بے یں گزار آئے ہیں  
زندگی میں وہ جو لمحہ مٹا سورتے والا

اس کا انداز سخن سب سے جدا تھا شاید  
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ ٹھنڈے والا

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں  
کوئی اس گھر میں نہیں رو سکتی کرنے والا

دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے  
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا

اس امید پر ہر شام بھلاتے ہیں چراغ  
ایک تار اہلے سر بام آ بھرنے والا

لیلیٰ لب نواز کی ڈائری میں تحریر۔  
ساحر لویا لوی کی عزت

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا  
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا



امن عالم کی ڈائری میں تحریر  
صوفی شہنشاہ کی نظم  
اپنی جاں نظر کروں، اپنی وفا پیش کروں  
قوم کے مرد مجاہد تجھے کیا پیش کروں

رباب راجپوت، کی ڈائری میں تحریر  
عبدالمصطفیٰ کی غزل  
کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں  
پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا

تو نے دشمن کو جلا ڈالا ہے شعلہ بن کے  
اُبھرا ہر گام پہ تو فتح کا نعرہ بن کے  
اس نجات کا تجھے کیا میں صلہ پیش کروں  
عمر بھر تجھ پہ خدا اپنی عنایت رکھے  
تیری جرات، تیری عظمت کو یاد رکھے  
جذبہ شوق شہادت کی دُعا پیش کروں  
دل میں پیدا کیا اک جذبہ تازہ تو نے  
میرے گیتوں کو نیا حوصلہ بخشا تو نے  
کیوں نہ تجھ کو اپنی گیتوں کی فواہش کروں  
اپنی جاں نظر کروں، اپنی وفا پیش کروں  
قوم کے مرد مجاہد تجھے کیا پیش کروں

کوئی رنگ تو دیرے چہرے کو  
پھر زخم اگر مہکاؤ تو کیا

جب ہم بھی نہ ہیکے پھر صاحب  
تم بادِ کلبا کہلاؤ تو کیا

اک آئینہ تھا سو ٹوٹ گیا  
اب خود سے اگر شرماؤ تو کیا

تم آس بندھانے والے تھے  
اب تم بھی ہمیں ٹھکراؤ تو کیا

دنیا بھی وہی اور تم بھی وہی  
پھر تم سے آس لگاؤ تو کیا

میں تنہا تھا میں تنہا ہوں  
تم آؤ تو کیا نہ آؤ تو کیا

جب دیکھنے والا کوئی نہیں  
تجھ جاؤ تو کیا کہناؤ تو کیا

اک وہ ہے یہ دنیا اس میں  
کچھ کھوؤ تو کیا اور پاؤ تو کیا

ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں  
جی جاؤ تو کیا مر جاؤ تو کیا

شہسفر فراز کی ڈائری میں تحریر  
فرحت عباس شاہ کی غزل  
گردِ ما بھی کوئی چیز ہے تو دعا کے حوالے کیا  
جا تجھے آج سے، تم نے اپنے خدا کے حوالے کیا

ایک مدت ہوئی ہم نے دنیا کی ہر اک ضد چھوڑ دی  
ایک مدت ہوئی ہم نے دل کو دھلکے حوالے کیا

اس طرح ہم نے تیری محنت زلزلے کے ہاتھوں میں  
جس طرح گل نے خوشبو کو بادِ مہلکے حوالے کیا

یہ میں ہی عجب زندگی میں اک  
ہم نے چپ چاپ ہاتھوں کو دمِ منک کے حوالے کیا

خون نے تیری یادیں سلگی ہوئی رات کو نیوڑی  
آنسوؤں نے ترا بد روگنی سولہ کے حوالے کیا

شہنشاہ شہان



مائمہ سحر فیصل آباد

ابھی سے تھکنے لگے ہاتھ میرے رفو کر کے  
ابھی تو جاگ میرے زخم کے پلے بھی نہیں  
خاکرن

زلزلے والوں سے چپ کر دینے کے دن نہیں ہیں  
اے کہنا داس ہونے کے دن نہیں ہیں  
میں جان سکتی ہوں وصل میں اصل بھید کیا ہے  
مگر حقیقت شناس ہونے کے دن نہیں ہیں

شگفتہ رانی اکوڑہ  
مجھے تھا زخم مگر پھر بھی بکھر گیا محسن  
وہ یزہ دیرہ تھا مگر اپنے اختیار میں تھا

مالیہ خان اسلام آباد  
ٹوٹ گئے نہ کسی روز وہ ادارہ مزاج  
کھول رکھتے ہیں اسی آس پہ درشام کے بعد  
تو ہے سوچ تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ

تو کسی روز میرے گھر میں آ کر شام کے بعد  
اساد کریم  
زرد چہروں کی کتابیں ہیں کتنی فضول  
ترجمے آن کے جہاں بھر کی کتابوں میں ملے

رضیہ، رضانہ شہر کوٹ  
دھوپ میں سایہ دلپاز سے ڈر جاتا ہوں  
اُس سے ملتا ہوں تو کچھ اور کچھ جاتا ہوں  
جس کی آنکھوں نے میرے غم سے نہیں رکھے ہیں

خود سے ملتا ہوں تو اُس شخص کے گھر جاتا ہوں  
سرت طارق اکوڑہ  
رفاقوں سے مرا ہوں مسافروں سے نہیں  
سفر وہی تھے مگر ہمسفر نہ تھے ایسے

شکید بہل حسن ملک وال  
نہ تھی تیرے غم کی سرداری  
دل میں یوں روز انقلاب آئے  
کر رہا تھا غم جہاں کا حساب  
آج غم یاد ہے حساب آئے

اشیلا  
عجبت میں ذرا سی بے دفائی مزدوری ہے  
وہی اچھا بھی لگتا ہے جو دے تو دے تباہ ہے  
یا سین ملک کراچی  
بہت بڑھ چلا ہیں سستا تو لیں گے بل دیوں  
اُلجھ گیا کہیں دامن تو کیوں چھڑائیں گے ہم  
صدف خان لاہور  
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے  
ٹوٹل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا  
انوش ایدار قائد اعظم روڈ  
چلا تو ہوں ایک منزل خوش خبر کی جانب  
عجیب نہیں یہ سفر بھی ہونا تمام میرا  
دلوں کو تاراج کرنے آ رہا تھا تمکنت سے  
پلٹ گیا عجب کو دیکھ کر خوش خرام میرا  
نور ناصر پورسہ والا  
ہم سادگی میں ٹھیک کیا گئے  
تم نے گرا ہوا ہی سمجھ لیا  
دعا شاہد کراچی  
پہلے شکوہ تھا یہاں رونق بازار نہیں  
اب جو بازار کھلے ہیں تو حزیں دار نہیں  
سب کے ہاتھوں میں یہاں نہ ہر کمال ہے مگر  
کوئی رچ بولنے کے واسطے تیار نہیں



## موقع محل

ایک چری قبرستان میں چرس پی رہا تھا، پولیس آگئی تو چری نے چرس چھپا دی۔  
پولیس: ”کیا کر رہے ہو۔“  
چری: ”کچھ نہیں، اپنے والد کے لیے دعا کر رہا ہوں۔“  
پولیس: ”مگر یہ تو کسی چھوٹے بچے کی قبر ہے۔“  
چری: ”میرے والد بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔“  
شاکاشف..... ملتان

## ووٹ

ایک بزرگ پولنگ بوتھ سے باہر نکل کر پولنگ ایجنٹ سے پوچھنے لگے۔ ”کیا میری بیوی بھی اپنا ووٹ ڈال گئی ہے؟“  
اس نے لسٹ دیکھ کر بتایا ”ابھی کچھ دیر پہلے ہی ووٹ ڈال کر گئی ہیں۔“  
بزرگ افسوس کرنے لگے کہ ”کاش آج مل جاتی۔“  
پولنگ ایجنٹ نے حیرت سے پوچھا ”کیا آپ ساتھ نہیں رہتے۔“  
بزرگ نے کہا۔ ”نہیں اسے فوت ہوئے گیارہ سال ہو چکے ہیں لیکن الیکشن کے دن ووٹ ضرور ڈالتی ہے۔“  
حور بن زنب..... کہروڑ پکا

## روتے ہیں جھم جھم نین

مجھے پونی ورٹی میں ایک لڑکی بہت پسند آئی مگر بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ایک دن ایک دوست نے کہا کہ سو روپے کے نوٹ پر اپنا فون نمبر لکھ کر اسے دے دو۔  
میں نے ایسا ہی کیا اور اس سے کہا۔ ”یہ آپ کا

## نوٹ گر گیا ہے۔“

اس نے خاموشی سے نوٹ لے لیا اور کینٹین میں جا کر وہاں سے برگر کھالیا۔  
اب برگروالا روز مجھے بیچ کر کے پوچھتا ہے کہ ”برگر کیسا تھا۔ پھر کب آؤ گی لینے۔“  
روبینہ یاسین..... جہلم

## نا قابل برداشت خوشی

عورت، وکیل سے۔ ”میں اپنے سابقہ شوہر سے صلح کرنا چاہتی ہوں۔“  
وکیل حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو آپ نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔“  
عورت نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ جب سے وہ مجھ سے علیحدہ ہوئے ہیں تب سے وہ بہت خوش نظر آتے ہیں اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“  
روبینہ لیاقت..... ملتان

## ایک پنتھ دو کاج

ایک آرٹسٹ کسی خوب صورت کالج کی پینٹنگ بنا رہا تھا۔  
”تم میرے کالج کی تصویر بنانے کے بعد کیا کرو گے۔“ کالج کے مالک نے پوچھا۔  
”اس کو ایک نمائش میں بھیجوں گا۔“ آرٹسٹ نے جواب دیا۔  
”وہاں پر تو اسے بہت سارے لوگ دیکھیں گے۔“ آرٹسٹ بولا ”یہ بات تو سچ ہے۔“  
”تو پھر ایسا کرو کہ تصویر میں ایک جملہ بھی لکھ دو۔ یہ مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔“ مالک مکان نے آرٹسٹ سے کہا۔

## خود کش جیکٹ

شوہر نے بیوی سے پوچھا۔ ”میں دوسری شادی کر لوں؟“  
بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”کر لو۔“  
شوہر نے پھر پوچھا۔ ”تمہاری طرف سے اجازت ہے؟“

بیوی نے آرام سے کہا۔ ”کیوں نہیں۔“

شوہر نے کہا۔ ”ناراض تو نہیں ہوگی۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”بالکل بھی نہیں۔“

شوہر نے خوشی سے پوچھا۔ ”اچھا میری شادی والے دن کیا پہن کر آؤ گی۔“

بیوی نے سکون سے جواب دیا۔ ”خود کش جیکٹ۔“

گڑیا شاہ..... کہروڑ پکا

## فرق

باپ نے غصے سے بیٹے کو بولا۔ ”ایک کام نہیں ہوتا تم سے، تم کو وضیاء لانے کو بولا تھا اور تم پودینہ لے آئے ہو۔ تم کو وضیاء اور پودینہ میں فرق پتا نہیں چلتا۔ تم جیسے بے وقوف کو گھر میں رکھنے سے اچھا ہے کہ تم کو گھر سے نکل جاؤ۔“  
بیٹے نے باپ سے کہا۔ ”ساتھ ہی چلے ہیں گھر سے۔“  
باپ نے پوچھا۔ ”کیوں؟“  
”کیونکہ امی کہہ رہی ہیں کہ یہ بیٹھی ہے۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

ام ہانی..... پاکستان شریف

## شکایت

ایک صاحب کے گھر کچھ رشتہ دار ملنے آئے۔  
بیوی نے بچن میں صاحب کو بلایا اور بتایا کہ گھر میں چینی نہیں ہے۔  
ان صاحب نے بیوی سے کہا۔ ”پتی دودھ ہمیشہ کی طرح کم اور پانی زیادہ ڈال کر چائے بناؤ، باقی میں سنبھال لوں گا۔“  
بیوی نے مہمانوں کو چائے پیش کی تو ان صاحب نے کہا۔  
”اس میں سے ایک کپ میں چینی نہیں ہے وہ

جس کے حصے میں آئے گی ہم سب کل بیوی بچوں کے ساتھ اس کے گھر مہمان ہوں گے۔“  
سب رشتہ داروں نے انتہائی خاموشی سے چائے پی لی اور چینی کے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔  
لاریب انم..... لاڑکانہ

## محبت کی کہانی

محبت کا ”میم“ بھی کچھ نرالا ہے مل جائے تو ”میاں“ نہ ملے تو ”ماموں“  
محبت کا ”ح“ بھی کچھ کم نہیں ہے مل جائے تو ”حقیقت“ نہ ملے تو ”حسرت“  
محبت کا ”ب“ بھی کتنا نرالا ہے۔ مل جائے تو ”بیوی“ نہ ملے تو ”باجی“  
محبت کا ”ت“ بھی لا جواب ہے مل جائے تو ”تقدیر“ نہ ملے تو ”توبہ“

شازیہ گزار..... بھکر

## یہ عالم شوق کا

بچے کی پیدائش کے بعد ڈیلیوری روم سے نکلے ایک گھنٹے بعد زچہ کو ہوش آیا۔ بدن میں طاقت بالکل ختم ہو گئی تھی..... کروٹ لینا تو دور کی بات بلے میں بھی بے پناہ دقت ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے داہنے ہاتھ کو حرکت دی۔ کچھ ٹولا، ہاتھ کو بڑھ محسوس نہیں ہوا، پھر بائیں ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی کچھ نہیں ہاتھ لگا۔ بے چین ہو گئی..... دور کھڑی نرس کو اشارے سے بلایا..... ہونٹ بلے پر کچھ الفاظ نہیں نکل سکے۔  
نرس نے زچہ کی گھبراہٹ محسوس کر لی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں، آخر وہ بھی ماں تھی اور ماں کی تڑپ کو کیسے نہ سمجھ پائی۔ ددڑ کرنا تو بیڑ روم سے دوڑ کر نوزائیدہ کو لا کر ماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔  
”میں سمجھ سکتی ہوں بہن الو..... جی بھر کے دیکھ لو۔“  
زچہ اپنی تمام تر ہمت جٹا کر ہاتھ پٹیتے ہوئے پوئی۔  
”میرا موبائل فون کہاں ہے میں یہ پوچھ رہی تھی!“  
کشن چوہدری کل..... کجرات

مصنوعہ باور فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں  
یہ سوال و جواب مشائخ کیے جا رہے ہیں۔



میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں  
وہ تبسم، وہ تلم تری عادت ہی نہ ہو  
بج۔ بالکل صحیح سمجھیں آپ، میری یہ عادت ہی  
ہے۔ (تبسم اور تلم)

ریحانہ صابو کر..... ٹھٹھ  
نہیں۔ بھیا! کیا صرف حوصلے سے انسان آگے  
بڑھ سکتا ہے؟  
بج۔ ہمارا یقین ہے اس پر۔

ممتاز یار محمد..... لاہور  
س۔ نین جی! جن پر اعتماد ہوتا ہے، وہی لوگ  
دھوکہ دے جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟  
بج۔ اپنے ساتھ تو انہی تک ایسا اتفاق نہیں ہوا۔  
طاہرہ حمید..... حافظ آباد

س۔ گھریلو زندگی میں ضد کو ضد سے ضرب  
دینے پر کیا حاصل ہوتا ہے؟  
بج۔ بے سکونی۔

ذوالقرنین



شاہدہ..... لاہور

س۔ اگر خوش قسمتی کا دیوتا آپ کا در کھٹکھٹاتا  
رہے اور آپ مقفل کمرے میں گہری نیند کی وادیوں  
میں گم رہیں تو بے داری کے بعد جب صورت حال کا  
پتا چلے تو آپ کیا کریں گے؟  
بج۔ سمجھوں گا میری قسمت میں نہ تھا، ایسا کچھ۔

شاہدہ نورین..... رحیم یار خان  
س۔ ذوالقرنین بھیا! یہ تو بتائیں کہ عورت اگر  
سکون چاہے تو کسے چلی جاتی ہے، لیکن اگر مرد سکون  
چاہے تو کہاں جاسکتا ہے؟  
بج۔ ہمیشہ کے لیے ملک سے باہر۔

فرزانہ سلیم..... میاں چنوں  
س۔ بے یقین راستوں پر چلنے کا فائدہ؟  
بج۔ یہ بڑس نہیں ہے کہ فائدہ اور نقصان دیکھا جائے۔

ام الدین سبحانی..... کراچی  
س۔ انسان ہمت کب ہار بیٹھتا ہے؟  
بج۔ جب مستقل نہلے پہ دہلا میں سوالوں کے  
جواب دینے پڑیں۔

ساجدہ نورین..... راجن پور  
س۔  
تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت  
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو

لہر یا بنانا ہوا آتا تو اچھے اچھوں کے بیٹ ہاتھ  
ہاتھ میں دھرے رہ جاتے۔

(مشائخ احمد یوسفی..... چرائی تلے)  
نوزیہ ثریث..... کجرات

ثابت قدمی

خدا کے پاس ہمارے لیے جو کچھ ہوتا ہے،  
اسے پانے کے لیے ہمیں ہمارے پاس جو ہوتا ہے،  
وہ دینا ہوتا ہے۔ معجزے بھی ہماری ثابت قدمی پر ہی  
ہوتے ہیں۔

(سمیر احمد..... رہ نور دشتی)  
(اقراء عزیز..... گاؤں دریا خان جلبانی)

انسانوں کی اقسام

زندگی بار بار نہیں آتی، صرف ایک بار آتی ہے  
اور وقت سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی ریت کی طرح  
ہے۔ تم اس میں کتنی مٹھیاں بھر سکتے ہو ایک یا پھر دو،  
وقت تو بس پچاس یا سو برس کا ہے مگر اس سے زیادہ  
نہیں پھر سوچو اس ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں جھونک  
زیادہ تم اس ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں جھونک  
سکتے ہو اور بہت سے لوگ اپنی زندگی میں ایسا کرتے  
ہیں، وہ لوگ ظالم ہوتے ہیں پھر کچھ لوگ جو اس  
ریت کو دوسروں کی آنکھوں میں ڈالنے کے بجائے  
اپنی آنکھوں میں ڈال لیتے ہیں وہ لوگ بزدل اور  
اذیت پسند ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اس ریت سے محل  
بناتے ہیں وہ لوگ احمق ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ  
نہایت احتیاط سے ریت کے ایک ایک ذرے کو گنتے  
لگتے ہیں۔ وہ اس دنیا کے کجس ہیں، کچھ لوگ اس  
ریت کو اپنے سر پر ڈال لیتے ہیں ہنسنے لگتے ہیں وہ  
لوگ اس دنیا کے بچے ہیں اور دنیا کی مصیبت ان  
ہی کے نام سے قائم ہے۔

(کرشن چندر..... باون پتے)  
تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ)

||

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

اداسی کا سبب

میری اداسی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگوں  
نے سوچنا چھوڑ دیا ہے، اداس ہونا چھوڑ دیا ہے۔ وہ  
لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں، جو نہ سوچتے ہوں  
اور نہ اداس ہوتے ہوں۔ یہاں میں یہ بھی کہتا چلوں  
کہ جو لوگ نہ سوچتے ہیں اور نہ اداس ہوتے ہیں وہ  
فقط اپنی صورت اور ہیبت کے اعتبار سے انسان  
ہوتے ہیں۔

(جون ایلیا..... خون کے گھونٹ)  
افشاں سنج..... کراچی

چکر باز بولر

مصیبت اصل میں یہی ہے کہ مخالف ٹیم کا لمبا تر ٹکا  
بولر خدا جھوٹ نہ بلوائے پورے ایک فرلانگ سے  
ٹھٹھا ہوا آتا، ایک بارگی جھٹکے کے ساتھ رک کر کھڑا کرتا  
پھر خلاف توقع نہایت تیزی سے گیند پھینکتا۔ اس کے  
علاوہ حالانکہ وہ صرف دائیں آنکھ سے دیکھ سکتا تھا مگر  
گیند بائیں ہاتھ سے پھینکتا تھا۔ مرزا کا خیال تھا کہ  
اس بے ایمان نے یہ چکر دینے والی صورت انتظاماً بنا  
رکھی ہے لیکن ایک مرزا ہی پر موقوف نہیں، کوئی بھی یہ  
اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ گیند کیسے اور کہاں پھینکے گا بلکہ  
اس کی صورت دیکھ کر کبھی بھی تو یہ شبہ ہوتا تھا کہ اللہ  
جانے پھینکے گا بھی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے گیند سے اتنے وکٹ  
نہیں لیے جتنے پھینکنے کے انداز سے۔ بقول مرزا  
”بولر سے کوئی خائف نہیں ہوتا، وہ زیادہ سے زیادہ  
وکٹ ہی تو لے سکتا ہے، جان تو انارزی سے نکلتی ہے۔  
گیند پھینکنے سے پہلے جب وہ ڈھائی گھر کی چال سے

فضہ نور..... رد ہٹری

اس بار کرن 18 تاریخ بروز ہفتہ کو ملا کرن کے ہاتھ میں آتے ہی نامے میرے نام کا جائزہ لیا، شکر ہے لاج رکھ لی آپ نے میری..... چلیے خیر خط کے جواب میں جواب بھی سن کیجئے کرن سے میری دوری ناگزیر..... کیونکہ میرا کرن سے تعلق بسکت اور چاکلیٹ کی طرح ہے جو ایک دوسرے کے بغیر ذرا بھی اچھے نہیں لگتے اور رہی ناراضی کی بات تو یہ نامکن باتوں میں سے ایک ہے۔ ”نامے میرے نام“ اقراء ممتاز غائب تھیں۔ ثناء شہزاد کی طبیعت خرابی کا پڑھا اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ ”شبِ نم کی سحر“ رخ چو بدری نے بھی کہانی کو اک نیا ٹریک دے دیا، اب لگتا ہے کہانی میں دلچسپی بڑھ جائے ایک عورت نے دوسری کا گھر بچایا پر اس خبر سے سب اب تک بے خبر رہے ساجد کی دوسری شادی سے۔ سلیم منزل کی روئقیں دو بالا ہو گئیں پر شکستہ خاتون کے شکستہ مکالموں کو بہت مسکایا اس قسط میں۔

”ہوائیں رخ بدل گئیں“ ربیکا حمزہ کو کھٹکتی کی طرح اپنے اشاروں پر بچانا جاتی ہے حمزہ کو چاہیے کہ شہرینہ سے جلد از جلد شادی کر کے اور یہ تیور غزنی کی حقیقت کب افشاں کر رہی ہے گھٹت جی۔

مکمل ناول ”لذتِ غمِ عشق“ مبین نیازی کے اس شوخ رویے کے پیچھے کیا راز چھپا ہے۔ بہت الجھایا ہوا ہے، رائیٹر نے مالی اور دل آویز کے قصے میں۔

افسانے تینوں زبردست رہے رائیٹرز نے اس بار لڑکوں سے کام کروا ڈالے۔ عید کی مناسبت سے تینوں نے بہت ہنسایا ”دلِ خوش فہم“ شیر کی خوش فہمی اسے لے ڈوبی! مکتی آرا کا اپنے بیٹوں کو اس طرح کام کرانا پڑا کہ بہت ہنسی آئی۔ شادی کا لٹد جو کھائے وہ بھی پچھتائے جو نہ

کھائے وہ بھی پچھتائے شیر کی اس کا عملی مجموعہ لگا۔

”سچ کہوتا“ ٹھوڑا سبق آموز تھا ارجمٰں اور عظیم نے اپنے بابا کا سر نیچا کر کے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی رشتے جھوٹ کی بنیاد پر بھی بھی بھائے نہیں جاسکتے ارجمٰں اور عظیم اپنی حقیقت سے آگاہ کر دیتے تو انہیں اپنے بابا کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔

نادیہ احمد کا ”بقرہ عیدِ ثل“ بہت مزا آیا پڑھ کر مزا دو بالا ہو گیا عید کا۔ نادیہ نے دردناک چھوچھوکی بہت درگت بنوائی۔ دے بنے بے گھر گھر بھی چھوچھوکی عقل ٹھکانے نہ لگ سکی۔ چاندنی اور انمول کی مکتی خوش اسلوبی سے انجام پائی پر انکی باراس مکتی کا ٹوٹے کا خطرہ ہے۔

مکمل ناول ”آخری رخ“ عالیاں کا شایان کے لیے سب چیزوں کی قربانی دینے تک تو ٹھیک پر اپنی محبت سے دست برداری ٹھیک نہیں تھا، پر شاید شایان کو اپنی ذاتی حسد اور خود غرضی کا احساس اس طرح دلایا جاسکتا تھا۔

شایان نے سچے دل سے اعتراف کیا تھا اور اپنی غلطیوں پر تادم بھی ہوا جس کی بدولت فاطمہ حسن جیسی بیون ساچی اسے ملی کسی کو بچھا دکھانے اور خود کو پرفیکٹ سمجھنے سے انسان اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے، دیریں دیر ڈن گھٹت سیما۔

”غم ہے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ جی نے اتش کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اتش کو اندازہ ہو گیا یہ غرور اس کی ذات کو لے ڈوبا اتش کا ردنا ہم سے برداشت نہیں ہوا، سونیا کو اتش کا ہمدرد بنادیں تنزیلہ جی اور زمین کو اس کے دل سے نکال دیں۔

مکمل ناول ”نین تارا اور اک بھی کوکب“ کوکب ہر بازی تو جیتی رہی پر اپنی دوستی ہار گئی۔ نین تارا کی غلط دوستی کو دھوکا دے دیا خود اپنے مسائل کے جھنجھٹ سے نکلنے کے لیے نین تارا کی زندگی داؤ پر لگا دی اور اسل بھی ایسا بے خوف جیسے وہ محبت سمجھتا رہا صرف آنکھوں کا دھوکا رہا اور جو بانی کی طرح شفاف بھی بالکل سامنے اسے نظروں سے اوجھل کر دیا۔ غشا کا انداز ہمیشہ متاثر کن رہا اس بار بھی عمدہ تحریر لے کر آئیں۔

”میں داری جادواں“ سونیا کی خود غرضی کی حد

ہے اس نے بیٹی کو بھی بیہوش چڑھا دیا۔ اپنی اولاد کی خوشی کو بھی نہ دیکھا اور باری صاحب بھی بیوی کے پلو سے لگے بیٹھے رہے پر بیٹی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا اینڈ ٹھوڑا ڈرامائی تھا۔ بانی ابھی شمارہ پڑھا نہیں طبیعت خرابی کی بنا پر صرف کہانیاں ہی پڑھی ہے اب اپنا خط اس بار خود ہی پوسٹ کر دیا اب آپ تک خیر دعائیت سے ناٹم سے پہنچ جائے۔

ج: فضہ ”کرن“ کی کہانیوں پر اتنا جامع تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

اقراء ممتاز..... سرگودھا

دوماہ کی غیر حاضری کے بعد لکھ رہی ہوں۔ بس آپ سے ناراض ہوں آپ نے جولائی میں مجھے ردی کی نوکری کی نذر کر دیا۔ سوچا تھا اس دفعہ نہیں لکھوں گی لیکن کرن کی کہانیاں ہمیشہ تیرہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اگست کا ٹائٹل ٹائٹل شامل خان عاصم محمود سے ملاقات اچھی رہی ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں صائمہ سحر کے جوابات پرفیکٹ لگے۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ اس دفعہ کی قسط میں حمزہ پر ایک انکشاف تو ہوا کہ تیور غزنی پہلے سے شادی شدہ ہے اس دفعہ کی قسط بیٹھ گئی۔ اب دیکھیے کہ کیا خزینہ اپنا بچہ سارہ اور غزنی کو دے سکے گی؟

”لذتِ غمِ عشق“ کیا انفا سنگ اسٹوری ہے عفاف اور مبین کی نوک جھوک سے بڑے لطف اندوز ہوئے۔

دل آویز کی باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔

”آخری رخ“ بہت ٹائٹل اسٹوری تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے محبت سیما محفل میں آئیں دوسروں کو متاثر نہ کر سکیں۔ عالیاں اور شایان کی بعض حرکتوں نے مسکرانے پر مجبور کیا تو کہیں آنکھیں غم کر دیں۔ دونوں کی دوستی، پیار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا بھائی عالیاں جیسے بھی ہوتے ہیں اپنی محبت کا گلا گھونٹ کر بھائی کو خوش کر دیا۔ لیکن شایان نے ہمیشہ عالیاں کی پسند کو اس سے چھینا۔ بھائی ہو کر بھائی سے حسد کرتا رہا۔ لیکن کہانی نمردان رہی گئی۔

”نین تارا اور کوکب“ غشا محسن علی جب بھی لکھتی ہیں کچھ منفرد لکھتی ہیں۔ ”غم ہے یا خوشی تو“ میڈم تمہیں

پر بہت غصہ آیا۔ درزی ہونا کہاں کی شرمندگی ہے۔ انسان کو اپنا حق ڈھانچنے کے لیے اس درزی کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اتش کا غرور تو نوٹا زمین یہ کیسی محبت ہے؟ اینڈ پر اتش کا مقدس سونیا ہی ٹھہرے گی۔

”میں داری جادواں“ رحمان آفتاب (تسی گریٹ ہو) سونیا نے اپنی خود غرضی سے اپنی ہی بیٹی کو کھو دیا۔ سونیا کی لاپرواہی اور اٹھل غازی کو ذور کرنے چلی تھیں، تمہاری ہی بیٹی ہے تمہارا غرور پاش پاش کر دیا۔ ان دونوں کی لگن تھی تھی۔ پھر کیوں نہ ایک دوسرے کا مقدس ٹھہرتے۔ علیہا اور اٹھل دونوں نام بہت پسند آئے۔

افسانہ ”سچ کہوتا“ سبق آموز کہانی تھی۔ ان کے بابا نے بروقت فیصلہ کر کے ان کو سبق سکھا دیا۔

”دلِ خوش فہم“ چاروں بھائیوں کو کام کرتے دیکھا کہ بہت خوش ہوئے۔ مکتی آراء نے اپنے بیٹوں کو لکھنا سکھڑ بنائے ہوا تھا ہا ہا۔ مسکرائی کر نہیں ہمیشہ کی طرح بیٹھ گئی۔

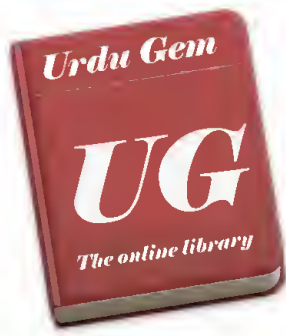
نامے میرے نام میں ساری بہنوں نے اچھا لکھا ہوا تھا۔ (حق ہا) اس دفعہ کرن کے ساتھ کرن کتاب دکھانے دی تھی۔ آئی جی اگر آپ نے اس دفعہ بھی میرا خط شائع نہ کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی پکی دالی..... ہا ہا ہا۔

ج: اقراء جی ہمیں جو خط دقت پر مل جاتے ہیں ہم انہیں شائع ضرور کرتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کے خط ہمیں دیر سے موصول ہوتے ہیں اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ماہیا شیر حسین..... ڈنگہ

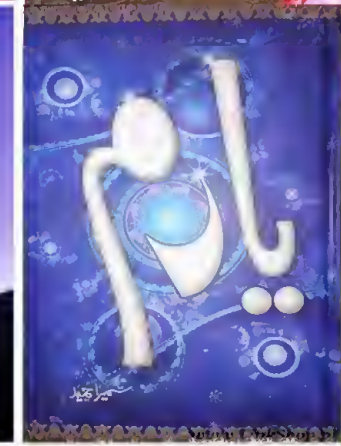
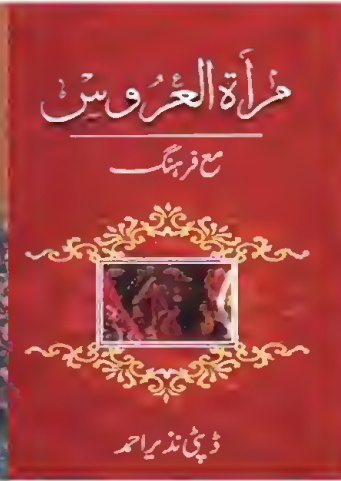
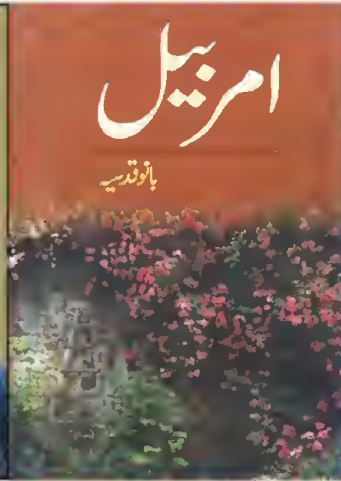
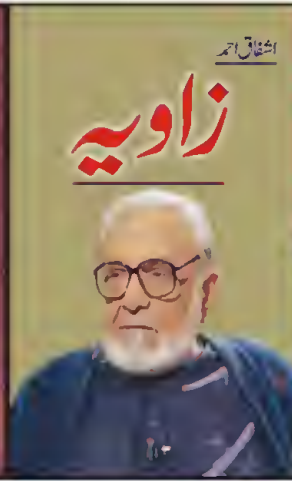
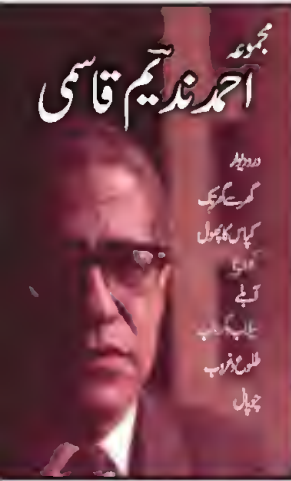
کرن کی تعریف کے لیے الفاظ کم پڑتے ہیں یہ بہت معیاری رسالہ ہے۔ ہر ماہ کوشش کے باوجود میں خط نہیں لکھ پاتی کہ کاہلی اور سستی آڑے آ جاتی ہیں۔ کیا کیا جائے۔ ٹائٹل پیارا تھا۔ تمام انٹرویوز بھی خوب رہے ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں صائمہ سحر جانو تم سے ملاقات کر کے اچھا لگا۔ سلسلہ دار ناؤز دونوں میری امید یہ پورے نہیں اترے۔ مجھے تو یہ ناؤز کرن کے معیار کے مطابق ہی نہیں لگے۔ مکمل ناول میں ”گھٹت سیما“ ٹاپ پر ہیں جبکہ ”غشا“ نے اس دفعہ





# UrduGem.com

## URDU KA KHAZAANA





## لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسا نکھار

بہترین غیر محسوس کے لئے دنیا بھر میں جلد کے ماہرین لیزر ٹریٹمنٹ کی جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر بھی ٹریٹمنٹ صرف ایک کریم سے مل جائے تو؟  
اب لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسی غیر محسوس ہے "طیور اینڈ ٹولی ایڈوانسڈ ٹی ڈی ٹیکنالوجی" سے۔  
اس کا طاقتور ڈی ڈی ٹیکنالوجی کا استعمال لیزر لائٹ کی طرح جلد کی گہرائی تک جاتا ہے۔ سیاہ نقیصات کو صاف اور روشن کر کے جلد کو نکھارتا ہے۔  
تیز لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ جیسے نکھار کے لئے صرف غیر اینڈ ٹولی کا ہیٹ فارمولہ۔

Fair & Lovely

ADVANCED  
MULTI VITAMIN™

\*لیزر لائٹ ٹریٹمنٹ سے مراد جلد کے اندر لائٹ (Intense Pulsed Light) ہے۔

کچھ الگ ہی لکھ ڈالا ہے ایسا لگا کہ یہ کسی اور کا ناول ہے۔ صائمہ قریشی ڈیئر، ہم میں برداشت کا مادہ کم ہے تو پلیز زیادہ امتحان نہ لیں اور تیسری قسط آخری کریں۔ ناولٹ ریحانہ آفتاب کا بس سوسوی لگا جبکہ تزیلہ اپنے مخصوص انداز میں جکڑے ہوئے ہیں۔  
یہ ماسٹر جی ہمیں ہمیشہ قصہ اتنا مختصر ہی کیوں سناتے ہیں؟ افسانے میں "فرح بھٹو" کا افسانہ دلچسپ رہا بانی بھی ٹھیک تھے "کرن کتاب" میں پلیز شوگرز کے مریض کے متعلق معلومات اور پریز کا بتائیے اور ایک اور بات کہ پرانی رائٹرز تو لکھتی نہیں ہیں تو ان کی پرانی تحاریریں ہی لگا دیں ہم تو انہیں بہت سس کرتے ہیں پر شاید وہ ہمیں بھول گئی ہیں۔ سوچے گا ضرور۔  
ج: پیاری بابا! پہلے تو آپ وعدہ کریں کہ اپنی سستی اور کالی کو ختم کر کے۔ ہر ماہ اپنی رائے سے آگاہ کرنی رہیں گی۔ "کرن کتاب" کے لیے آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔

تبسم بیشیر حسین ..... ڈنگلہ  
اگست کا شمارہ 15 کو ملا۔ ٹائٹل اگست کے حوالے سے ہونا چاہیے تھا۔ ادارہ بہت خوب، حمد و نعت ہمیشہ کی طرح لا جواب رہی فہرست میں اس دفعہ دو ناموں نے اٹھ جانے لگا دیے "تجلیت سیما" اور "نشاہت حسن علی" بہت شکریہ پیارے کرن جاری پسندیدہ مصنفہ کو لانے کا۔ انٹرویو میں "نذرانہ عقیدت" قارئین سے سروے ہوتا تو آتا کہ ایک عام بندے کے خیالات عام بندے جیسے ہی کار کے خیالات انہی جیسے۔ خیر سچ اگر برا لگے تو سوری کہ جو دل پہ دہی زبان ہے۔ "شمال خان" سے ملاقات سو سوری۔ "میری بھی سینے" میں عاصم محمود کی سنی کیا دافنی یہ سچ ہے کہ حسین ذہین نہیں ہوتے؟ تو جناب عاصم آپ بھی.....؟ "مقابل ہے آئینہ" صائمہ سحر کے جوابات کمال کے تھے خیر میں اگر شرکت کرنی تو ایسے ہی جواب دیتی۔ "شب غم کی سحر" اسی لیول پہ ہے جہاں شروع میں تھا۔ جبکہ تجلیت آیا تو جکڑے جا رہی ہیں۔ "لذت غم عشق" کی بانی کی اقساط آجائیں

کرن عمران احمد..... ساہیوال  
سب سے پہلے کرن کے تمام نمبرز کو اور تمام قارئین کو گزشتہ عید مبارک۔ اب میں اپنا مدعا بیان کرنی ہوں مجھے آپ سے شدید قسم کا گلہ ہے کرن میگزین میں یہ میرا جو تھا خط ہے مگر ایک خط کے علاوہ کسی کو بھی پڑی نہیں نصیب نہیں ہوئی۔  
کرن نے بہت سے نئے رائٹرز کو متعارف کروایا ہے اور ہر نئے لکھنے والے کو میگزین میں جگہ دی جاتی ہے۔ اسی امید پر میں نے اپنے دو افسانے آپ کو بھیجے مگر افسوس ان کا کچھ ہوا نہیں..... مگر میں ابھی بھی نا امید نہیں ہوئی ہیں اور نئی امید کے ساتھ آپ کو اپنا ایک اور افسانہ بھیج رہی ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور جگہ ملے گی۔

اللہ پاک سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے آمین۔  
ج: کرن جی! آپ کا خط ہمیں موصول ہوتا تو شائع ضرور کرتے۔ یہ خط بھی آپ کا دیر سے ملا لیکن ہم نے کوشش کو کہ آپ کی شکایت دور کر دی۔

☆☆

تجلیت ناگہ